
شکنجہ
طارق اسمٰعیل ساگر

پیش لفظ

ناول نگار کے لیے شاید ناول لکھنا اتنا مشکل نہیں جتنا اس کا پیش لفظ لکھنا کیونکہ یہاں وہ براہ راست اپنے قارئین سے بات کرتا ہے اور جب آپ کو ڈھنگ سے بات کہنے کا سلیقہ ہی نہ ہوتو آپ کے لیے بات کہنا کار دارد ہے۔

بہر حال میں کوشش کرتا ہوں کہ اپنے جذبات آپ سے شیئر کرتا رہوں۔

''شکنجہ'' ناول پاکستان میں ہونے والی تخریب کاری کے پس منظر میں لکھا گیا ہے ہمارے ہاں خصوصاً گذشتہ پانچ سال سے ''ٹریک ٹو ڈپلومیسی'' کا غلغلہ کچھ زیادہ ہی زور شور سے مچایا جا رہا ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ محبتوں کے جو زنگ آلود دروازے حکومتیں نہیں کھول سکیں وہ شاید عوام بلکہ عوام بھی نہیں دانشور خواتین و حضرات اپنی مساعی سے کھولنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

بڑا نیک خیال ہے۔

بہت اچھی بات ہے۔

اگر بھارت اور پاکستان کی حکومتیں مسلسل حالت جنگ کو ختم کر دیں تو اس خطے کے کروڑوں عوام جو غربت کی لکیر سے نیچے قابل رحم زندگی بسر کر رہے ہیں انہیں ڈھنگ کی زندگی میسر آ جائے گی۔ وہ اربوں روپیہ جو دونوں ممالک اسلحے اور گولہ بارود پر پھونکتے ہیں عوامی فلاح و بہبود پر خرچ ہوگا شاید کوئی پاگل شخص ہی ایسا ہوگا جو اس دوستی کی مخالفت کرتا ہو۔ لیکن ...... اس ٹریک ڈپلومیسی کی آڑ میں کیا

گھناؤنا کھیل رچایا جا رہا ہے بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیاں ''بھولے بادشاہوں'' کو کس کس طرح اپنے جال میں پھانستی ہیں اور ان سے کیا کام لیا جاتا ہے۔

یہی اس ناول کا موضوع ہے۔

ہمارے ہاں ایک بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ پاکستان اپنے ہاں ہونے والے ہر واقعے کی ذمہ داری ''را'' پر ڈال دیتا ہے۔ یہ بات کس حد تک سچ ہے؟ کس حد تک جھوٹ؟ شاید ان سوالات کے جواب بھی آپ کو اس ناول کے مطالعے سے مل جائیں۔

محبتوں کی آڑ میں منافقتوں کا دھندہ کون چلا رہا ہے؟

دشمن کی سازش کیسے انجام پاتی ہے اور اس سازش کا شکار ہم انجانے میں کیسے بن جاتے ہیں میں نے یہی بتانے کی کوشش کی ہے۔ یہ ناول علم و عرفان پبلشرز سے پہلی مرتبہ پیش کیا جا رہا ہے انشاء اللہ میرے تمام ناول آپ کو اب علم و عرفان پبلشرز ہی سے ملیں گے اس ضمن میں تمام قانونی تقاضے پورے کئے جا رہے ہیں۔

طارق اسمٰعیل ساگر

انتساب!

پاکستان کے ''بھولے بادشاہوں''
کی خدمت میں!

عرض مصنف

''شکنجہ'' جن دنوں لکھی گئی تب پاکستان پر''را'' کی طرف سے تخریب کاری کا بڑا حملہ ہوا تھا گو کہ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد ہی بدقسمتی سے ہمارے ہمسائے نے یہ طے کرلیا تھا کہ پاکستان نام کی اس مملکت خداداد کو چین سے بسنے نہیں دینا اور (خاکم بدہن) یہاں ایسے حالات پیدا کرنے ہیں جن کے منطقی نتیجے میں ایک مرتبہ پھر براہمن کا'' اکھنڈ بھارت'' کا خواب شرمندہ تعبیر ہو جائے لیکن جس بات کی سمجھ ابھی تک بھارت کو نہیں آسکی وہ سچائی ہے جو پاکستان کی بنیاد بنی۔

پاکستان خدانخواستہ کسی تاریخی حادثے کی پیداوار نہیں نہ ہی تاریخی لحاظ سے یہ کوئی ایسا ملک ہے جو نوآبادیاتی نظام کا یادگار تحفہ ہو بلکہ ایک نظریاتی مملکت ہے جسے ایک خاص عظیم، مستحکم، مکمل اور کائنات کے سب سے بڑے سچ کی حیثیت سے ہم اپنے ایمان کا حصہ سمجھتے ہیں۔ یہاں کے عوام ممکن ہے دنیا کے دیگر ممالک کے عوام کی طرح بہت ترقی یافتہ نہ ہوں، بہت وسائل یافتہ نہ ہوں لیکن ایک بات طے ہے کہ انہوں نے پاکستان کو دل وجان سے قبول کیا ہے اور بطور نظریاتی مملکت یعنی اسلامی جمہوریہ پاکستان مانا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آپس کی ریا کاریوں، منافقتوں اور بد اعمالیوں اور دیگر بشری کمزوریوں کے باوجود پاکستان کی حفاظت اور سلامتی کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں کیونکہ یہ بات ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ پاکستان کے بعد اس کرہ ارض کا کوئی کونہ ہمارے لیے محفوظ پناہ گاہ نہیں بن سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ دشمن جب بھی ہماری طرف میلی نظروں سے دیکھتا ہے ہمیں اپنے خلاف متحد پاتا ہے یہی اتحاد ہماری طاقت ہے دشمن کی چالوں کو سمجھنے کے لیے اس کی حکمت عملی کا مطالعہ از بس ضروری ہے اور میں نے حتی الوسع یہ کوشش کی ہے کہ اپنے لوگوں کو ان سے آگاہ کرسکوں۔ شکنجہ بھی اس کا ایک ثبوت ہے۔

طارق اسمٰعیل ساگر

فہرست

سمجھوتہ ایکسپریس

سمجھوتہ ایکسپریس حسب روایت لیٹ تھی۔ تین گھنٹے سے وہ ٹرین کے منتظر تھے لیکن ابھی مزید تین گھنٹے انہیں انتظار کرنا تھا۔

''میں نے کہا تھا اماں یہ گاڑی کبھی وقت پر نہیں آتی......لیکن آپ کی ضد۔''

اقبال نے اپنی والدہ کی طرف دیکھ کر کہا جو پلیٹ فارم کے ایک کونے میں لکڑی کے بینچ پر صبر و رضا کا پیکر بنی ہاتھ میں پکڑی تسبیح گھما رہی تھیں۔

''ارے بیٹا...... پندرہ سال بعد تمہاری خالہ اماں آ رہی ہیں...... پندرہ سال بعد... کوئی تھوڑا عرصہ نہیں ہوتا ..... بے چاری نجانے کیسے جوان بیٹی کے ساتھ یہاں تک پہنچے گی۔ بیٹا کہاں دہلی اور کہاں لاہور...... ہائے کاش آج تمہارے والد زندہ ہوتے تو کتنے خوش ہوتے یہ جان کر کہ ان کی سالی انڈیا سے آ رہی ہیں......''

اماں بی نے اپنی دانست میں اقبال کو جواب دے کر مطمئن کر دیا تھا۔

''ارے اماں بی...... میں کب کہہ رہا ہوں ہم خوش نہیں۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ اتنی جلدی یہاں آنے کی ضرورت کیا تھی۔ اب یہاں اس قیامت کی گرمی میں تین گھنٹے تک بیٹھی رہو...... اور اس بات کا بھی کیا ثبوت ہے کہ گاڑی تین گھنٹے ہی لیٹ ہے۔ یہ تین گھنٹے تیرہ گھنٹوں میں بھی تبدیل ہو سکتے ہیں......''

اقبال نے چڑ کر کہا۔

گرمی واقعی بلا کی تھی......

ایسا قہر ٹوٹ رہا تھا کہ الامان الحفیظ۔

شام ڈھل چکی تھی لیکن پلیٹ فارم جہنم کا کوئی حصہ بنا ہوا تھا۔ لکڑی کے بنچوں کے گرد کسے لوہے کے فریم کو اگر ہاتھ چھو جاتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے کسی نے جلتی آگ پر ہاتھ

رکھ دیا ہو۔

کہنے کو تو یہاں تین پنکھے چھت پر لٹک رہے تھے۔

لیکن......

ان میں سے صرف ایک میں زندگی کی حرارت دوڑ رہی تھی۔ باقی دونوں جانے کتنے مہینوں سے اسی طرح منہ بسورے ٹین کی چھت کے ساتھ لٹک رہے تھے۔

ماضی میں کبھی ان میں حرکت نام کی کوئی شے رہی ہوگی اب تو ان تک سوئچ بورڈ سے پہنچنے والی بجلی کا تار بھی کئی جگہ سے ٹوٹ چکا تھا۔

جو واحد پنکھا چل رہا تھا وہ اگر نہ چلتا تو زیادہ بہتر تھا کیونکہ اس کے چلنے سے جو بھیانک آواز پیدا ہو رہی تھی اس نے اقبال کو متعدد مرتبہ جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ پنکھے کے پر چلنے سے ایسی آوازیں نکلتی تھیں جیسے کوئی مار مار کر انہیں چلنے پر مجبور کر رہا ہو اور اس کے پروں سے چھو کر جب نارِ جہنم میں جھلستی ٹین کی چھت سے حاصل ہونے والی ہوا کا کوئی جھونکا سمیٹ کے تپتے فرش پر کپڑے بچھا کر انتظار میں بیٹھے مسافروں کے جسم سے چھوتا تو انہیں اپنے بدن جلنے کا احساس ہوتا تھا۔ اقبال اور اس کا ماموں جو اماں بی کے ساتھ یہاں آئے تھے اب تک آٹھ دس چکر پلیٹ فارم کے باہر لگا چکے تھے۔ اس درمیان انہوں نے پلیٹ فارم کے سامنے فروخت ہونے والے گھٹیا اور مضرِ صحت شربتوں کے دس دس گلاس چڑھا لئے تھے۔

لیکن

کیا مجال جو ان کی پیاس میں کمی آئی ہو۔

اقبال کو تو اپنا تالو خشک ہو رہا تھا۔

مسلسل پسینہ بہنے سے اس کے کپڑوں کا برا حال تو تھا ہی۔ اس کا سارا جسم بھی بھیگنے لگا تھا۔ بار بار اسے اپنے ماتھے پر گرے گھنے بالوں کو الٹے ہاتھوں سے پیچھے ہٹانا پڑتا۔ بصورت دیگر بالوں کا سارا پسینہ اس کی آنکھوں میں اترنے لگتا......!!

وہ تینوں ہی نہیں یہاں موجود دوسرے سینکڑوں میزبان بھی جو اپنے پیاروں کو وصولنے آئے تھے اسی صورتحال سے دوچار تھے۔

پلیٹ فارم پر لگے پانی کے نل سے سوائے گرم ہوا اور شوشوں کی آواز کے اور کچھ برآمد ہونے کے امکانات دور دور تک دکھائی نہیں دے رہے تھے......اور جو ٹینکی یہاں لگائی گئی تھی اس کے ساتھ لگی چار پانی کی ٹونٹیوں میں سے دو ٹوٹ چکی تھیں جس پر بڑے سلیقے سے

اینٹیں رکھ کر اس میں سے بہتے پانی کو بند کرنے کی ناکام کوشش کی گئی تھی۔ باقی کی دونوں ٹونٹیوں میں سے جو پانی برآمد ہوتا تھا اس میں پتی ڈال کر چائے تو پی جا سکتی تھی اسے حلق سے اتارنے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا حالانکہ ٹینکی پر بڑے موٹے الفاظ میں ''ٹھنڈا پانی'' لکھا ہوا تھا۔

گرمی اور ہجوم نے اقبال کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا لیکن کیا مجال جو اماں بی کی صحت پر اس کا کچھ بھی اثر ہوا ہو۔

وہ تو گزشتہ پندرہ سال سے اپنی اکلوتی بہن کی ہی جیسے منتظر تھیں۔ اقبال کے والد کی وفات کے بعد سے تو وہ ہر دو تین ماہ بعد اپنے بیٹے سے ایک ہی فرمائش کرتی آئی تھیں۔

''ارے اقبال بیٹا...... مجھے اب پرمٹ بنا دے۔ اپنی زندگی میں ایک مرتبہ دہلی ہو آؤں اللہ جانے اب ثریا سے ملنا نصیب میں لکھا بھی ہے یا نہیں......''

اور......

اقبال اپنی ماں کو ہر دفعہ ایک ہی جواب دیا کرتا تھا۔

''اماں بی......بس بے فکر ہو جاؤ......اگلے ماہ چھٹیاں لے کر دونوں اکٹھے ہی دہلی جائیں گے!!''

اور......اس کی بے چاری ماں مطمئن ہو کر بیٹھ رہتی۔

لیکن......

یہ اگلا ماہ گزشتہ چھ سات سال سے آنے کا نام نہیں لے رہا تھا جبکہ اس کے مجازی خدا بہت پہلے ہی اسے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے تھے اور اب اسے اقبال ہی پر انحصار کرنا تھا......

اقبال کو اپنی ماں کے جذبات کا علم تھا۔

لیکن......

غم روزگار نے اسے اسی بری طرح الجھا لیا تھا کہ اب اس کے پاس فرار کی کوئی راہ ہی باقی نہیں بچی تھی۔

بی۔اے جیسے تیسے کرنے کے بعد وہ دو سال تک بے روزگار رہا تھا اس دوران اس نے کہاں کہاں دھکے نہیں کھائے۔

کس کس دروازے پر دستک نہیں دی تھی۔

کون کون سی چوکھٹ پر سجدہ ریز نہیں ہوا تھا۔

لیکن......

نوکری اس کے نصیب میں جیسے تھی ہی نہیں۔

وہ تو اللہ بھلا کرے اس کے والد مرحوم کے ایک دوست کا جس نے خدا خوفی کرتے ہوئے اسے ایک فرم میں سٹور کیپر کی ملازمت دلوا دی۔ یہاں اسے تنخواہ تو گزارے لائق ہی ملتی تھی لیکن دو تین ماہ بعد ہی ''اوپر کی آمدن'' کا راستہ کھل گیا تھا۔ اب وہ تنخواہ سے دو گنے پیسے ہیرا پھیری کر کے کما لیتا تھا اور اس کمائی پر ہی اس نے جیسے تیسے ایک پرانی موٹر سائیکل بھی خرید لی تھی۔

بڑی مشکل سے اس نے زندگی کی ہچکولے کھاتی گاڑی کو ایک ٹریک پر ڈال ہی لیا تھا۔

اب وہ اس لائن کو چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

بھارت کی سیر کا اسے بھی بے حد شوق تھا۔ اس کے محلے اور خاندان کے جو نوجوان ایک مرتبہ دہلی سے ہو آئے تھے انہوں نے وہاں کے ایسے ایسے قصے سنائے تھے کہ اقبال کی رال اکثر ٹپکتی تھی۔

اس کا جی چاہتا تھا کہ اڑ کر دہلی کے کسی ڈسکو کلب میں جائے اور ان لڑکیوں کے ساتھ جی بھر کے عیاشی کرے جن کی کہانیاں وہاں سے لوٹ کر آنے والے سنایا کرتے تھے۔

اس نے زندگی میں کبھی سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ شراب تو دور کی بات تھی۔ البتہ شباب سے متعلق اس کے نظریات اس کے ماحول نے خاصے انقلابی بنا دیئے تھے۔ گو کہ اسے زندگی میں کبھی عورت کی صحبت نصیب نہیں ہوئی تھی۔

لیکن......

اس کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ ایسا ہو جائے۔

وہ ایک مرتبہ اس زہر کا مزہ چکھنا چاہتا تھا خواہ اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔ خصوصاً گزشتہ مہینے جب وہ اپنے دفتر ہی کے ایک اور ساتھی کے ساتھ ایک پرائیویٹ اڈے پر گیا تو خاصا نروس ہونے کے باوجود اس نے وہاں وہ سب کچھ کیا جس کے لیے لوگ یہاں آتے تھے۔

اس کے بعد سے اقبال کی خواہش رہی کہ وہ دوبارہ وہاں جائے۔

لیکن......

اکیلے جانے کی ہمت اس میں نہیں تھی اور اس کے ساتھی کو چھٹی ہو چکی تھی۔ اس واقعے کے بمشکل تیسرے ہی دن وہ فیکٹری کے کچھ کیمیکل چوری کر کے لے جا رہا تھا جب

سکیورٹی والوں نے دھر لیا اور مالکان نے جو اس سے متعلق پہلے ہی مشکوک رہتے تھے یک بنی دو گوش اس کی چھٹی کروا دی۔

اقبال کو امید تھی کہ اس کا دوست مہینے میں ایک دو مرتبہ موج میلہ کروا دیا کرے گا لیکن اب وہ بے چارہ خود ہی یہاں نہیں رہا تھا۔

اس واقعے کے بعد سے تو وہ کچھ زیادہ ہی ضرورت محسوس کرنے لگا تھا اور اس کی خواہش بھی تھی کہ ایک مرتبہ دہلی ضرور جائے جہاں اس کے لیے وہ سب کچھ موجود تھا جو وہ چوری چھپے فلموں میں دیکھا اور دن رات سوچا کرتا تھا۔

ممکن تھا وہ کوئی پروگرام بنا بھی لیتا۔

لیکن......

ایک خوف نے اسے ہمیشہ جکڑے رکھا کہ اگر وہ چھٹی گیا تو مالکان اس کی جگہ کسی اور کو سٹور کیپر نہ لگا دیں اور اس کی اچھی خاصی حرام کی آمدن ختم نہ ہو جائے......

اس روز جب انہیں دہلی سے ثریا خالہ کا خط آیا کہ وہ اپنی بیٹی اور بیٹے کے ساتھ آ رہی ہیں تو اس کی والدہ کو گویا دوسرا جنم مل گیا۔

حیرت انگیز طور پر اس کی بیماری میں کمی واقع ہو گئی اور ہر وقت سر میں رہنے والا درد غائب ہو گیا۔

اقبال کے لیے یہ بڑا نیک شگون تھا۔

اسے اپنی ماں سے بہت محبت تھی۔

عالم شباب میں اس کے والد ماں کو اکیلا چھوڑ گئے تھے۔ خاندان بھر کے بزرگوں نے باپ کے چالیسویں کے بعد ہی اس کی ماں کو شادی کر لینے کی ترغیب دی تھی۔

اس کی ماں کو سمجھایا تھا کہ پہاڑ جیسی زندگی وہ اکیلے بسر نہیں کر پائے گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے دو بچوں کو کیسے پالے گی؟

لیکن......

صبر و رضا کی پیکر اس کی ماں نے کسی کی دلیل کو ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ ایک ہی بات کہا کرتی تھی کہ حلیم میاں کے ساتھ زندگی کے چھ سات سال گزارنے کے بعد اب اس کی کوئی تمنا باقی ہی نہیں رہ گئی...... اپنے مجازی خدا کی رخصتی کے بعد...... اب وہ مرتے دم تک

کسی اور کو وہ درجہ دینے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔ دوتین سال تو خاندان کے لوگ اسے سمجھاتے رہے جس کے بعد انہوں نے کہنا ہی بند کردیا۔ حیرت انگیز طور پر اس دوران کسی کو اس نوجوان اور خوبصورت بیوہ پر کوئی الزام لگانے کی جرأت ہی نہیں ہوئی۔

خاندان کے کچھ حریص مردوں نے جو ایک عرصے سے اپنی غلیظ نظریں اس پر گاڑے بیٹھے تھے ہاتھ پاؤں مارے۔

لیکن......منہ کی کھائی۔

کیا مجال جو کبھی جنت بی بی کے پائے ثبات میں لغزش آئی ہو۔

کیا مجال جو کبھی اس کا ایمان ایک لمحے کے لیے ڈگمگایا ہو۔

مکان اس کا خاوند بنا گیا تھا......تھوڑی بہت پنشن اور دن رات سلائی کڑھائی کر کے اس نے گردش حالات کا جیسے تیسے مقابلہ کیا۔ اس دوران تین چار مرتبہ اس کی بہن ثریا بیگم نے اپنی بساط کے مطابق اس کی امداد کی تھی اور اسے تھوڑی بہت رقم بھی روانہ کی تھی...... دو مرتبہ وہ خود پاکستان بھی آئی اور ہر دفعہ اپنی بہن اور اس کے بچوں کے لئے مہینوں کا راشن اور کپڑے ہمراہ لائی۔

اس نے واقعی بہن ہونے کا حق ادا کردیا تھا۔

بے چاری جنت بی بی خود تو اپنی جنم بھومی جا نہیں سکتی تھی البتہ اس نے دعائیں مانگ مانگ کر اپنی بہن کو پاکستان بلالیا تھا۔

یہ پندرہ سال جو اس نے بہن کی جدائی میں کاٹے پندرہ صدیوں پر محیط تھے۔ یہ تو نہیں تھا کہ اس دوران ثریا بیگم نے پاکستان آنے کی کوشش نہ کی ہو اس نے تو متعدد مرتبہ دہلی میں پاکستانی قونصلیٹ پر قسمت آزمائی کی لیکن بے چاری کی ایک نہ سنی گئی۔ اب بھی وہ شاید ویزہ حاصل نہ کر پاتی اگر اس کی ملاقات ترلوک پوری کے الن میاں سے نہ ہوتی۔

لامبے قد اور چھریرے بدن کے الن میاں رہتے تو ترلوک پوری کی غریب بستی میں تھے لیکن قونصلیٹ والوں سے ان کے تعلقات بڑے مضبوط تھے شاید وہ پاکستانی ایمبیسی کے کسی افسر کے گھر ملازمت کرتے تھے۔

اس روز جب ثریا بیگم پھر مایوس ہو کر آنسو بہاتی جا رہی تھیں تو الن میاں ان سے ٹکرا گئے۔

"کیوں روتی ہو بہن!"

انہوں نے بڑی ہمدردی سے دریافت کیا۔

"اے بھائی بس نہ ہی پوچھو تو بہتر ہے......"

ثریا بیگم نے کہا۔

لیکن......

الن میاں کے ہمدردانہ رویے سے ان کا دل پگھل گیا اور روتے ہوئے انہوں نے اپنی بیوہ بہن کا دکھڑا سنا دیا۔

"بے فکر ہو جایئے......انشاء اللہ اگلے ایک ہفتے میں آپ کا کام کروا دوں گا۔"

الن میاں نے انہیں تسلی دی۔

اور......

اگلے ایک ہفتے میں واقعی ان کا کام ہوگیا۔ بس الن میاں نے خرچہ پانی کے تین ہزار روپے لیے تھے۔

جن حالات سے ثریا بیگم گزشتہ چار پانچ سال سے گزر رہی تھی ان میں تین ہزار روپے کے عوض تین ویزوں کا حصول کوئی مہنگا سودا نہیں تھا۔ ان کے ہمراہ ان کی بڑی بیٹی سلمٰی اور بیٹا انور جا رہا تھا جبکہ دونوں چھوٹے بچے اور ان کے میاں دہلی ہی میں رہ گئے تھے۔

دونوں بچے کانونٹ میں پڑھ رہے تھے۔ میاں کی سرکاری نوکری تھی اس لیے تینوں کا جانا ممکن نہیں تھا یوں بھی سرکاری ملازمت کی وجہ سے ان کے میاں پاکستان جانے کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھے۔ انہیں "این او سی" حاصل کرنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے اور واپسی پر مقامی پولیس کی تفتیش الگ مسئلہ تھا۔

عموماً ادھر سے پاکستان اپنے عزیز و اقارب کو ملنے کے لیے جانے والوں کے ساتھ واپسی پر کچھ اچھا سلوک نہیں ہوتا تھا۔ انٹرویو کے نام پر تین چار ایجنسیوں کے ملازم ان کے بیانات قلمبند کرتے اور انہیں بطور خاص یہ اہتمام کرنا پڑتا کہ ایک ایجنسی کو دیا گیا بیان دوسری ایجنسی سے مختلف نہیں ہونا چاہیے۔ اگر خدانخواستہ وہاں کچھ فرق پڑ جاتا تو مختلف سی آئی ڈی والوں کے چکر الگ لگتے تھے کیونکہ مرزا صاحب کے تین چار ہمکاروں کو یہ کچھ بھگتنا پڑا تھا اس لیے انہوں نے خود تجربہ کرنے کی بجائے دوسروں کے تجربے سے سبق حاصل کرنا ہی زیادہ بہتر سمجھا۔

اقبال کو اپنی ماں سے بہت محبت تھی۔

اسے علم تھا والدہ نے اس کے لیے کیا کیا قربانیاں دی ہیں۔ اپنی ماں کو اس نے زبردستی اب تک دو بوتلیں ٹھنڈے مشروف کی پلا دی تھیں ورنہ جنت بی بی نے تو کچھ تقاضا یا موسم کے جبر کی شکایت نہیں کی تھی۔

شام اب رات میں بدل رہی تھی۔

خدا خدا کر کے بالآخر وہ ساعت سعید آہی گئی جب انہیں دور گاڑی کا وسل سنائی دیا۔ چند منٹ پہلے تک ویران دکھائی دینے والے پلیٹ فارم پر گویا اچانک ہی کوئی میلہ لگ گیا تھا۔ بے شمار محکموں کے بے حساب ملازمین اپنی اپنی چھریاں تیز کر کے سمجھوتہ ایکسپریس کے منتظر تھے۔

ان لوگوں کو پلیٹ فارم کے اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ البتہ اقبال نے یہ جاننے کے بعد کہ آنے والوں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے انہیں ممکنہ عذاب سے محفوظ رکھنے کا بندوبست پہلے ہی کر لیا تھا۔

خوش قسمتی سے اس کے ایک دوست کا بڑا بھائی محکمہ کسٹم کا کوئی چھوٹا افسر لگا ہوا تھا جس نے اقبال سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسکی خالہ کو بحفاظت اور امن و اسلامتی کے ساتھ نہ صرف پلیٹ فارم سے باہر نکلوا دے گا بلکہ ان سے ملوا دے گا۔

اقبال نے بہت کم عمری میں اپنی خالہ کو دیکھا تو تھا جب وہ پاکستان آئی تھی لیکن اب پندرہ سال بعد جب وہ بچے سے ایک گبھرو جوان کا روپ دھار چکا تھا اس کے لیے انہیں پہچاننا بہت مشکل ہوتا اگر اس نے چند ماہ پہلے خالہ ثریا کی طرف سے اپنے خاندان کی بھجوائی گئی تصاویر اچھی طرح نہ دیکھی ہوتیں۔

جب سے یہ تصویریں ڈاک کے ذریعے جنت بی بی کو موصول ہوئی تھیں وہ ہر دوسرے تیسرے روز کسی نہ کسی بہانے اقبال اور اس کی بہن عارفہ کو یہ تصویریں ضرور دکھا دیا کرتی تھی اقبال کے لیے ان تصویروں میں کوئی خاص دلچسپی تو نہیں تھی البتہ اپنی والدہ کا دل رکھنے کے لیے وہ بددلی ہی سے سہی ان کی ہاں میں ہاں ملاتا رہتا تھا۔

اس نے احتیاطاً اپنے ماموں کو بھی ساتھ لے لیا تھا اور کسٹم آفیسران دونوں کو اپنے اثر و رسوخ سے اس پلیٹ فارم تک لے آیا تھا جس پر بھارت کی ٹرین آتی تھی۔

ماموں بھانجا اب منہ اٹھائے ٹرین کی طرف دیکھ رہے تھے جس کا انجن پلیٹ فارم

میں دھاڑتا ہوا داخل ہوا اور اب یوں خاموش کھڑا تھا جیسے کسی نے اسے زبردست ڈانٹ پلا کر چپ کروا دیا ہو۔

ٹرین رکتے ہی وہاں موجود مختلف ایجنسیوں کے درجنوں اہلکار اور قلی ڈبوں پر ٹوٹ پڑے۔ اس کسٹم آفیسر کی آج یہاں ڈیوٹی نہیں تھی۔

لیکن......

اپنے بھائی کے کہنے پر بے چارہ بطور خاص ان کے لیے آیا تھا شریف آدمی دکھائی دیتا تھا ورنہ اس دور میں کون کسی کے لیے کچھ کرتا ہے۔

اس وقت وہ دونوں کے ساتھ موجود تھا۔

مسافر ٹرین کے ڈبوں سے برآمد ہونے لگے تھے۔ ایک ایک عورت کے ساتھ پانچ پانچ بچے اس پر قیامت کی گرمی نے یہاں طوفان بدتمیزی برپا کر دیا تھا۔

اقبال کو گھبراہٹ ہونے لگی تھی جب اچانک اسے اپنے ساتھ کھڑے ماموں کی آواز سنائی دی جو ٹرین کے ڈبوں سے برآمد ہونے والوں کا مسلسل جائزہ لینے میں مصروف تھے۔

"ثریا بہن اس طرف......"

وہ شاید مسافروں کے ہجوم میں پھنسی اپنی بہن کو پہچان کر آواز دے رہے تھے۔

اقبال نے گردن اس طرف گھمائی اور ایک مشفق صورت پر نظر پڑتے ہی اسے پہچان لیا۔ جو ایک بیگ اور دوسرے ہاتھ میں ایک بڑا سا پلاسٹک کا تھیلا سنبھالے ہجوم کے درمیان پھنسی راستہ بنا کر ان کی طرف آ رہی تھیں۔

"منا بھائی......"

انہوں نے نزدیک پہنچتے ہی زور سے پکارا اور دونوں ہاتھوں میں پکڑے سامان کو وہیں رکھ کر ماموں سے لپٹ گئیں۔

دونوں بہن بھائی باقاعدہ آنسو بہا رہے تھے...... ایک لمحے کو تو اقبال کا دل بھی بھر آیا۔ اب ثریا بیگم اپنے بھائی سے الگ ہو کر اس کو اپنے ساتھ لپٹا رہی تھیں۔ انہوں نے بے اختیار اس کی بلائیں لیں۔

"انور اور سلمیٰ کہاں ہیں۔"

ماموں نے فوراً ہی پوچھا۔

"وہ رہے...... سامان اٹھوا رہے ہیں قلی سے۔"

خالہ ثریا نے ایک طرف اشارہ کیا۔

اقبال کی نگاہیں اس کی انگلی کے تعاقب میں اٹھیں اور پھر منجمد ہو گئیں۔

وہ کچھ ایسا ہی منظر تھا......

اس کے سامنے اس کی کزن سلمیٰ اور انور اب قلی سے سامان اٹھوانے کے بعد اپنے دونوں ہاتھوں میں پلاسٹک کے لفافے تھامے اس طرف آ رہے تھے۔

گرمی سے سلمیٰ کا برا حال تھا اور اس کا دوپٹہ سر سے پھسل کر کندھے پر آ گیا تھا۔

گرمی سے اس کا سانولا رنگ سرخی مائل ہو رہا تھا۔ پسینہ کی ننھی ننھی دو بوندیں اس کے اوپری ہونٹ پر ٹکی تھیں مسلسل سفر اور ایک رات کے جگراتے سے اس کی بڑی بڑی بادامی آنکھوں میں تیرتے سرخ رنگ کے ڈورے اقبال سے نظریں ٹکراتے ہی برقی رو کی طرح اقبال کو اپنی آنکھوں کے راستے قلب میں سرایت کرتے محسوس ہو رہے تھے۔

اس کے چہرے پر پھیلی آنکھوں کا فسوں کسی سحر کی طرح اقبال پر پھونکا جا چکا تھا۔

چند سیکنڈ تک گرمی اور ہجوم کی گھبراہٹ سے بے حال اقبال کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے جلتے وجود پر برف کی تھیلی رکھ دی ہو۔

اسے یوں لگا جیسے کسی ریگستان میں جھلستے ہوئے اچانک ہی وہ نخلستان کے ٹھنڈے چشمے کے کنارے پہنچ گیا ہو......

لفافوں کے وزن سے دوہری ہوئی سلمیٰ بڑی تمکنت سے اس کی دھڑکنوں پر چلتی اس کے سامنے پہنچ گئی۔

''سلاما علیکم۔''

اس نے دونوں ہاتھوں کا بوجھ زمین پر رکھ کر اپنے دائیں ہاتھ کو قدرے ماتھے کے نزدیک لے جا کر اپنی روایت کے مطابق اسے سمراٹ اکبر کے دربار کی کسی خاندانی کنیز کی طرح آداب گزارا اور ایک برق سی اقبال کی آنکھوں کے سامنے لہرا گئی۔

''وعلیکم السلام۔''

اس نے حلق میں تھوک نگل کر کہا۔

اس کے ساتھ ہی اس کا کزن انور اس سے بغلگیر ہو گیا۔

اقبال کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے......

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہ پایا۔

جو فسوں اس پر سلمیٰ نے پھونکا تھا اس کے سحر سے شاید وہ اب کبھی نہیں نکل سکتا تھا۔

طوفانی اور آفاقی قسم کی محبت پر اس نے کبھی یقین نہیں کیا تھا۔ پہلی نظر کے فراڈ کو وہ تسلیم نہیں کرتا تھا۔

لیکن......

آج اسے اپنے سارے فلسفے جھوٹے اور بے بنیاد دکھائی دیئے۔ اس نے جان لیا کہ وہ پہلی ہی نظر میں سلمیٰ کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو چکا تھا۔

اس لمحے اقبال کو یہ ادراک ہوا جیسے وہ ہمیشہ سے سلمیٰ کا منتظر تھا اور آج اس کی تلاش کا سفر مکمل ہو گیا ہو۔

اس نے چاہا کہ اس سحر سے آزاد ہو جائے لیکن ابھی تک سلمیٰ کی نظریں اس پر لگی تھیں اور اس نے اقبال کو تماشا دکھانے والے ان مداریوں کی طرح باندھ کر رکھ دیا تھا جو اپنے معمول کے پاؤں زمین پر جوڑ دیا کرتے تھے۔

اب وہ اس سحر سے تب ہی آزاد ہو سکتا تھا جب سلمیٰ کو منظور ہوتا۔ پھر شاید قدرت کو اس کی حالت پر ترس آ گیا۔ سلمیٰ کو ماموں نے گلے لگا لیا اور اس کا محسن کسٹم آفیسر اس طرف آتا دکھائی دیا۔ اب تک وہ اپنے کسی جاننے والے سے گپ شپ کر رہا تھا۔

''آ گئے تمہارے مہمان۔''

اس نے اقبال سے دریافت کیا۔

''یس سر۔''

اقبال کے بدن کو جیسے اس کی اچانک آمد سے جھٹکا لگا اور وہ سحر سے آزاد ہو گیا۔

''کہاں ہے آپ کا سامان۔''

اس مرتبہ اس نے خالہ ثریا کو سلام کرنے کے بعد ان سے دریافت کیا تھا۔

''یہ ہے بیٹا۔''

ثریا خالہ نے اپنے سامنے دھرے دو اٹیچی کیس ایک بیگ اور کچھ پلاسٹک کے لفافوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

کسٹم آفیسر کی جہاندیدہ نظروں نے سارے سامان کو آنکھوں کے پلڑے پر تولا اور اندازہ کر لیا کہ یہ پیشہ ور بیا پھیرے باز نہیں ہیں۔

''او کے، آیئے میرے ساتھ کہاں ہیں آپ کے پاسپورٹ۔''

اس نے ثریا بیگم سے کہا۔

اس کی بات کا جواب سلمٰی نے دیا اور اپنے پرس سے تین پاسپورٹ نکال کر اسے تھما دیئے۔

''میں ابھی آیا آپ لوگ ٹھہریئے۔''

اس نے پاسپورٹ پکڑ کر امیگریشن کاؤنٹر کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

اس دوران اقبال نے خالہ سے ان کی خیریت دریافت کرنی شروع کردی تھی جو اپنی بہن کو دیکھنے کے لیے بے قابو ہوئی جاتی تھیں۔

''اے بیٹا تمہاری اماں نہیں آئیں کیا؟''

انہوں نے دریافت کیا۔

''نہیں خالہ......آئی ہیں مگر وہ اندر نہیں آسکتیں کیونکہ اس کی اجازت نہیں ہے۔ہم لوگ بھی بڑی سفارش سے یہاں تک آئے ہیں۔''

اقبال نے کہا۔

''اللہ تمہیں سلامت رکھے بیٹا۔''

انہوں نے ایک مرتبہ پھر اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد ہی کسٹم آفیسر آگیا تھا۔اس نے پاسپورٹ دوبارہ سلمٰی کی طرف بڑھا دیے جس نے انہیں اپنے پرس میں محفوظ کرلیا۔

''چلئے اپنا سامان اٹھالیں۔''

کسٹم آفیسر نے کہا۔

قلی کو سامان اٹھانے کے بعد باقی سارا سامان اقبال اور اُس کے ماموں نے خالہ اور سلمٰی کے''ناں ناں'' کرنے کے باوجود خود اٹھالیا تھا اور اب وہ سب کسٹم آفیسر کیساتھ ایک جلوس کی شکل میں باہر آرہے تھے۔

پلیٹ فارم کے آخری دروازے تک بے شمار للچائی ہوئی نظریں ان کی طرف اٹھیں لیکن کسٹم آفیسر کی نظروں سے ٹکرا کر دوبارہ لوٹتی رہیں۔

جیسے ہی وہ لوگ باہر آئے۔دوسری طرف موجود جنت بی بی نے ثریا کا نعرہ لگایا اور اپنی بہن سے لپٹ گئیں۔

دونوں بہنوں کے ساتھ سلمٰی بھی رونے لگی تھی۔ ماموں کی آنکھیں بھی چھلکنے کو تیار دکھائی دیتی تھیں اقبال کا دل بھر آیا۔

بمشکل اس نے تسلیاں دے کر انہیں نارمل کیا اور اب وہ لوگ ایک جلوس کی صورت باہر ٹیکسی سٹینڈ تک جا رہے تھے جہاں سے وہ ایک گاڑی میں بیٹھ کر گھر پہنچ گئے جہاں عارفہ کھانا تیار کر کے بے چینی سے ان کی منتظر تھی۔

رات ایک پہر ڈھل چکی تھی جب وہ لوگ خیر و عافیت اپنے گھر پہنچے۔بمشکل عارفہ اور اس کی والدہ کے بضد ہونے پر انہوں نے کھانا کھایا اور صبح تک دونوں بہنیں باتیں کرتی رہیں۔سلمٰی اور عارفہ بھی وہاں موجود تھیں۔

اقبال کی آنکھوں سے نیند غائب تھی۔

لیکن......ایک انور ایسا تھا جو اس ماحول سے لاپرواہ دکھائی دیتا تھا۔کھانا کھاتے ہی وہ بھی لمبی تان کر سوگیا۔

شکاری اور جال

تینوں بڑی خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھے تھے جب شکلا اندر داخل ہوا۔

''ہیلو جنٹل مین۔''

اس نے حسب سابق اپنے روایتی انداز میں تینوں کو ایک ساتھ مخاطب کیا۔

''جے ہند سر۔''

انہوں نے بیک زبان ہو کر کہا۔

''ہاں بھی ملک کیسا رہا تمہارا لڑکا۔''

اس نے تینوں میں سے ایک ورما ملک کو مخاطب کیا جس کے چہرے پر سوائے مونچھوں کے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

''سر! پہنچ گیا......سیف۔''

اس نے بڑے مؤدب لہجے میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''سامان کا کیا رہا۔''

شکلا نے جوان تینوں کا افسر دکھائی دے رہا تھا اگلا سوال کیا۔

''وہ پہلے ہی پہنچ چکا تھا سر۔''

ورما ملک نے دوبارہ کہا۔

''ہوں!......''

شکلا نے لمبی سانس لی۔

وہ ''را'' کے تخریبی سیل کا مقامی انچارج تھا اور اس کے سامنے بیٹھے ہوئے تینوں ایریا آفیسرز اپنے کام کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔

شکلا نے بطور خاص ان تینوں کو ہیڈ کوارٹر سے اپنی مدد کے لیے طلب کیا تھا۔ گزشتہ

تین چار ماہ کی پے در پے ناکامیوں نے انہیں بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ دو ایجنٹ تو رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے اور تیسرا اتنا خوفزدہ ہوا کہ ڈھنگ سے ڈیٹونیٹر ہی فٹ نہ کر سکا اور جیسے تیسے اپنی جان بچا کر واپس آ گیا۔

جس کے بعد ہیڈ کوارٹر نے شکلا کو یہاں بھیجا تھا۔ شکلا نے صرف اس شرط پر آنا قبول کیا تھا کہ اسے اپنی مرضی کی ٹیم دی جائے۔ اس سے پہلے وہ راجستھان کی سرحد سے پاکستانی علاقے میں آپریٹ کر رہا تھا اور اس نے ایجنسی کو خوش کر دیا تھا۔ راجستھان کیساتھ لگنے والی پاکستانی شہروں کی شاہراؤں اور دوسرے پبلک مقامات پر اس نے بڑے کامیاب دھماکے کروائے تھے۔ ''را'' پاکستانی پنجاب کے شہروں میں بھی ایسے ہی دھماکے کروانا چاہتی تھی لیکن یہ الگ بات کہ یہاں انہیں کامیابی نہیں مل رہی تھی نہ تو کوئی ڈھنگ کا ایجنٹ میسر آتا تھا نہ ہی ادھر سے سرحد پار کرنے والے کوئی کارنامہ کر سکے تھے ''را'' کو پاکستان کے صوبہ پنجاب میں ''پازیٹو رزلٹ'' نہیں مل رہا تھا۔

شکلا کو اس کی مخصوص شہرت کے پیش نظر ہی اس علاقے میں بھیجا گیا تھا اور اس نے اپنے کام کا آغاز ہی اپنے خاص آدمی ورما ملک کے ذریعے کیا تھا۔

اس روز شکلا نے ورما ملک سے کہا۔

''ملک میں نے چیلنج اس لیے قبول کیا ہے کہ مجھے تمہارے جیسے دوستوں کا تعاون حاصل ہے۔ تم جانتے ہو میں ٹیم ورک میں اعتماد رکھتا ہوں۔ تم تینوں کے بغیر میں مکمل نہیں...... ایجنسی کو ادھر پنجاب میں پازیٹو رزلٹ چاہئے...... اور ہم نے وہ دینا ہے۔''

''سر! ادھر میرے پاس ہے ایک لڑکا تھوڑا کام کرنا ہوگا اس پر۔ تھوڑا فری ہینڈ دینا ہوگا پھر دیکھیے۔''

ورما ملک نے کہا اور اپنے ایک لڑکے کا تعارف کروا دیا۔

اس نے اپنے ''سورس'' کا نام انور بتایا تھا۔

''ہوں......''

اس روز بھی شکلا نے حسب عادت صرف ''ہوں'' کہا اور کچھ سوچنے لگا۔

''ٹھیک ہے کل ملتے ہیں اس سے۔''

بالآخر وہ ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔

اور......

اگلے روز ورما ملک نے اس کی ملاقات انور سے کروادی۔

انور کا تعلق دہلی کے ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ مسلمان اور محرومیوں کا شکار انور بچپن ہی سے ہندی فلموں کا رسیا اور بڑے بڑے خواب دیکھتا آرہا تھا۔ ورما ملک سے وہ اچانک ہی ایک مخلوط محفل میں ٹکرا گیا تھا۔ گریجوایشن کرنے کے بعد اس کے کلاس فیلوز نے ایک رم پارٹی کا اہتمام کیا تھا جہاں ورما ملک بھی ایک لڑکے کے کزن کی حیثیت سے موجود تھا۔

ایسی ہی محفلوں میں وہ اپنے لیے شکار تاڑا کرتے تھے۔

انور شراب نوشی کا عادی نہیں تھا۔

وہ تو عام زندگی میں سگریٹ بھی نہیں پیتا تھا۔ بس کبھی کبھی اس طرح کی محفلوں میں ایک آدھا پیگ اسے زبردستی لگانا پڑتا۔

آج بھی ایسا ہی ہوا تھا جب اس کی کلاس فیلو شالینی نے اسے زبردستی گلاس تھما دیا تھا۔ شراب کے نشے میں جب اس نے بولنا شروع کیا تو بولتا ہی چلا گیا۔ ورما ملک کی جہاندیدہ اور شکاری آنکھوں نے وہیں اس کے اندر موجود شاندار ''ایجنٹ'' کو تلاش کرلیا تھا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ انور کو اپنے بہت زیادہ امیر نہ ہونے کا بہت غم ہے وہ بڑے بڑے ہوٹلوں میں اور محفلوں میں جانا اور خود کو منوانا چاہتا تھا جبکہ اسے علم تھا کہ ایم اے میں داخلہ لینے کے بعد اگر اس نے ایم اے کر بھی لیا تو بھی اسے زندگی میں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ الا یہ کہ نوکری بھی ڈھنگ کی نہیں ملے گی کیونکہ اس کی کوئی بڑی سفارش نہیں ہے۔

اصل میں وہ ڈائیلاگ تھے جو اس کی دیکھی ہوئی تازہ فلم کے ہیرو نے ادا کئے تھے اور شراب کے نشے میں انور ادا کر رہا تھا۔

لیکن......

یہ اس کے دل کی آواز بھی تھی۔

یہ تو اس کا تعلق متوسط گھرانے سے تھا اور اس پر مستزاد کہ وہ مسلمان بھی تھا۔

ورما ملک نے تب اس سے اپنا تعارف ایک بزنس مین کی حیثیت سے کرایا اور اس سے چپک کررہ گیا۔

اس نے انور کی ہر ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے اس سے دوستی کی خواہش ظاہر کی تھی اور محفل کے اختتام پر اسے گھر چھوڑنے کے لیے آیا تھا۔

رات دیر گئے انور گھر پہنچا تو اس کے والد نظام الدین اولیا کے عرس سے واپس نہیں

لوٹے تھے جبکہ بہن گہری نیند سو رہی تھی اور والدہ کو اس نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ دیر سے آئے گا سو وہ مطمئن تھیں۔

یوں بھی ورما ملک نے اسے قدرے نارمل کردیا تھا اور اس کے منہ سے بدبو بھی نہیں آرہی تھی۔

صبح وہ دیر گئے اٹھا اور کالج جانے کے لیے تیاری ہی کررہا تھا جب ان کے گھر کے باہر دکان سے ایک لڑکا آیا اور اس نے انور کے فون کی اطلاع دی۔

یہ ان کا پی پی نمبر تھا جو ان کے مکان کے باہر بنی دکان پر لگا تھا اور اس دکاندار سے اس کے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ عموماً دن میں ایک دو فون ان کے یہاں آہی جایا کرتے تھے۔ انور معمول کے مطابق ہی بڑبڑاتا ہوا فون سننے گیا تھا۔

لیکن...... جب دوسری طرف سے ورما ملک کی آواز آئی تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس کے لیے تو جیسے بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹ گیا تھا۔

✿......✿......✿

''ہاں انور میاں کچھ گڑبڑ تو نہیں ہوئی ناں......''

ملک نے بے تکلفی سے دریافت کیا۔

''ارے نہیں ملک صاحب اپنی شرافت کا بہت رعب ہے گھر میں۔''

اس نے فون پر ہی گردن پھلاتے ہوئے کہا۔

''چلو بھئی یہ تو بڑی اچھی بات ہے...... اچھا یہ بتاؤ دوپہر میں کیا کررہے ہو۔''

ملک نے دو چار ادھر ادھر کی باتیں مارنے کے بعد کہا۔

''ارے صاحب ہم کیا کریں گے۔ بس وہی بوریت۔ کالج سے گھر اور گھر سے کالج۔ ابھی کلاسیں شروع ہوئی ہیں۔ پڑھائی بھی ڈھنگ سے نہیں ہورہی۔''

انور نے بتایا۔

''چلو یہ تو اچھی خبر ہے...... آج دوپہر کو اکٹھے کھانا کھاتے ہیں نا...... کچھ گپ شپ رہے گی۔''

دوسری طرف سے کہا گیا۔

اور......

انور نے ایک لمحہ تذبذب کرنے کے بعد فوراً ہاں کردی وہ تو خود نجانے کب سے

کسی ایسے دوست کی تلاش میں تھا جس کی مدد سے موج میلہ کر سکے۔

ورما ملک نے اسے بتا دیا تھا کہ کتنے بجے وہ اسے کالج کے نزدیک بس سٹاپ پر ملے گا اور اس کی آمد سے دس منٹ پہلے ہی انور وہاں پہنچ گیا تھا...... انور کو اس بات کا علم نہ ہوسکا کہ ورما ملک خود یہاں گزشتہ پندرہ منٹ سے ایک ہی جگہ کھڑا تھا جہاں سے وہ تو آسانی سے انور کو دیکھ سکے لیکن، انور اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

وہ انور کا شوق انتظار ہی تو دیکھنے آیا تھا۔ اور اب وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ یہ مرغا اس کی چھری کے نیچے آ کر ہی رہے گا۔ بڑے اطمینان سے بس سٹاپ کے سامنے والی بلڈنگ میں موجود ''را'' کے ایک ''سیف ہاؤس'' سے اس نے مطلوبہ وقت کے دس پندرہ منٹ بعد تک انور کی حرکات وسکنات کا جائزہ لیا اور پھر اطمینان سے باہر آ گیا۔

مسلسل اور تکلیف دہ انتظار سے انور کے اعصاب تڑخنے لگے تھے جب اسے ورما ملک کی صورت دکھائی دی جو نئی بی ایم ڈبلیو کار میں بیٹھا اسے اشارے سے بلا رہا تھا۔ انور برق رفتاری سے اس کی طرف لپکا ورما ملک دوسرے دروازے سے باہر نکل کر اس کا استقبال کر رہا تھا۔

ایک لمحے کے لیے اس کی آن بان دیکھ کر انور مبہوت ہو کر رہ گیا۔ پھر اس نے سنبھل کر اس کے نمسکار کا جواب دیا۔

''یار معاف کر دینا ٹریفک میں پھنس گیا تھا...... یہ سالی دلی کی سڑکیں بہت تنگ نہیں ہوتی جا رہیں؟''

اس نے انور کے لیے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

انور کے اوسان ابھی تک بحال نہیں ہوئے تھے۔

ورما ملک دوسری طرف سے چکر کاٹ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''مجھے افسوس ہے تمہیں پندرہ بیس منٹ انتظار کرنا پڑا...... حالانکہ میں اپنے دوستوں میں وقت کا پابندی کے لیے بڑا بدنام ہوں۔''

ورما ملک نے خواہ مخواہ قہقہہ لگایا۔

جواب میں انور نے بھی بے شرمی سے دانت نکال دیئے۔

''ہاں ملک صاحب واقعی آپ نے صحیح کہا معلوم نہیں یہاں ٹریفک چل کیسے رہی

ہے۔ اصل میں مجھے بھی کچھ دیر ہوگئی تھی اور میں شرمندہ ہو رہا تھا کہ کہیں آپ کو انتظار نہ کرنا پڑا ہو۔ لیکن تھینک گاڈ کہ آپ وقت پر نہیں آئے۔''

انور نے جھوٹ بولا۔

اور...... ورما ملک دل ہی دل میں مسکرا کر رہ گیا۔

اس نے اپنا تعارف سٹاک ایکسچینج کے بروکر کی حیثیت سے کروایا تھا اور اس کاروبار کی تھوڑی بہت شد بد بھی دے دی تھی۔

''بس یار...... اپنا سالا دھندہ ایسا ہے دنوں میں کروڑ پتی اور پھر سڑک چھاپ...... آج کل شیئر کا بھاؤ ذرا اونچا چل رہا ہے جب بازار اونچا ہو تو ہم اپنی دکان بھی اونچی کر لیتے ہیں کچھ شیئر پچھلے چھ ماہ سے ایک کونے میں اچھے وقت کے انتظار میں رکھے ہوئے تھے...... بس معاملہ پٹ گیا تو میں نے مرسڈیز بیچ کر بی ایم ڈبلیو رکھ لی۔ بس یار یہ گاڑیوں کا شوق بھی عجیب ہے...... دراصل میرے پتا جی کو یہ شوق تھا اور ان سے مجھے منتقل ہوا...... میں نے بھی عادت اپنالی...... دو چار کروڑ کی جائیداد بن گئی ہے کافی ہے...... باقی ساری رقم اپنی عیاشی کے لیے کافی ہے۔''

اس نے قہقہہ لگایا۔

اور......

جواب میں انور بھی کھسیانی ہنسی ہنس دیا۔

اس کی رال ابھی سے ٹپکنے لگی تھی۔

''یار تم کچھ بولو...... مجھے تو بولنے کی عادت پڑ گئی ہے...... بس یہ دھندہ ہی ایسا ہے...... سارا دن بک بک چخ چخ......''

ورما ملک نے اس کی طرف گاڑی چلاتے ہوئے ایک لمحے کے لیے دیکھا۔

انور مبہوت ہوا اپنی جگہ اس طرح جم کر بیٹھا تھا جیسے اگر وہ اپنی جگہ سے ہلا تو سیٹ کے نیچے رکھا بم پھٹ جائے گا۔

اس نے زندگی میں کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ بی ایم ڈبلیو میں سفر کرے گا۔

''بس مہاراج آپ ہی بولتے رہیے۔ آپ کی باتیں شاندار ہیں...... اپن تو فٹ پاتھیئے ہیں بولنے کے لیے ہمارے پاس ہے ہی کیا۔''

انور نے سنبھل کر اپنی حس مزاح برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

''اب پیارے بھول جاؤ پرانی زندگی...... ہم نے تمہارا انتخاب کرلیا ہے دوستی کے لیے اور اپنی ایک عادت یہ بھی ہے کہ دوستوں کو اپنے جیسا بنا کر چھوڑتے ہیں۔''

اس نے انور کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

۞......۞......۞

گاڑی دہلی کے مضافات میں ایک شاندار ہوٹل ''آکاش'' کے سامنے رکی تھی۔ اس ہوٹل کا نام تو انور نے سنا تھا لیکن بی ایم ڈبلیو کی طرح اس نے اس ہوٹل کے اندر گھسنے کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔

البتہ اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے ''آکاش'' میں داخل ہونے اور اسکے اندر کی دنیا دیکھنے کی خواہش ضرور کی تھی۔ انور جب ورما ملک کے تعاقب میں ہوٹل میں داخل ہو رہا تھا اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ زمین پر چل رہا ہے واقعی وہ ''آکاش'' (آسمان) پر خود کو اڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

زمین پر اس کے قدم ضرور ٹکتے تھے۔

لیکن......

قدموں تلے بچھے نرم قالینوں کا سا گداز اس کے انگ انگ میں سرایت کر گیا تھا۔ یہاں تو چلنے کا مزہ ہی اور تھا...... دونوں جیسے ہی ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے ایک کونے میں کھڑی ہوٹل کی خوبصورت ''اٹنڈنٹ'' نے ''ہیلو مسٹر ورما سر!'' کا نعرہ بلند کیا اور اس کے سامنے پہنچ کر قریباً کورنش بجالاتے ہوئے اسے ''ویل کم'' کہا تھا......!

''مائی فرینڈ مسٹر انور۔''

اس نے اپنے پہلو میں احساس کمتری سے سمٹے ہوئے انور کی طرف اشارہ کیا۔

''ہیلو سر...... آئی ایم سوزی۔''

لڑکی نے اپنے سارے جسم کو ایک خاص زاویے پر لاتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تو انور نے سحر زدہ معمول کی طرح اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔

سوزی نے بڑی گرم جوشی سے اس کا ہاتھ اتنے نزدیک پہنچ کر دبایا تھا کہ اس کے جسم پر لپٹی کلون کی ساری خوشبو انور کی ناک کے راستے اس کے دل و دماغ میں بس گئی تھی......!! اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ واقعی زمین پر موجود ہے یا کسی اور سیارے پر پہنچ چکا ہے۔

''ہمیں امید ہے سر! آپ یہاں خوب انجوائے کریں گے۔''

لڑکی نے پہلے سے ''حاصل شدہ ہدایات'' کے مطابق اس کا ہاتھ کچھ زیادہ ہی گرم جوشی سے دبایا تھا۔

بھارت کے ایڈوانس معاشرے میں کسی مرد کا کسی لڑکی سے ہاتھ ملانا کچھ معیوب نہیں تھا۔ لیکن سوزی ایسی خوبصورت اور بڑے ہوٹل کی آفیسر کا اس جیسے ٹٹ پونجئے کے ساتھ اس طرح ملنا واقعی عجیب لگتا تھا۔

''آیئے سر۔''

اس نے بالآخر انور کا ہاتھ چھوڑ کر اسے اپنے سحر سے آزاد کر دیا۔

ورما ملک اس دوران اپنے استقبال کے لیے آنے والی ایک دوسری ویٹرس اور انتظامیہ کے افسر کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ یہ لوگ بھی اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی برق کی طرح اس کی طرف لپکے تھے۔

انور کو اندازہ نہ ہو سکا ورما ملک نے اسے جان بوجھ کر اکیلا چھوڑ دیا تھا تاکہ سوزی اس کا چند لمحوں کے لیے مزید جی بہلا سکے۔

وہ انور پر پہلا وار ہی ایسا کاری لگانا چاہتا تھا کہ انور بچ کر نہ جا سکے اور ہمیشہ کے لیے ان کا اسیر ہو کر رہ جائے۔

''را'' کے پاس کسی بھی شوقین مزاج نوجوان کو شیشے میں اتارنے کا پورا پورا سامان ہمیشہ موجود رہتا تھا اور اپنے ان ہتھیاروں کے بروقت اور بہترین استعمال کی انہیں اچھی خاصی تربیت دی جاتی تھی۔ سوزی نے اس درمیان انور کے لئے تین چار مخصوص قسم کے استقبالیہ فقرے ادا کر دیئے تھے۔ یہ تھے تو معمول کے وہ الفاظ جو ایسے ہوٹلوں میں آنے والے گاہکوں کے لیے وہاں کا تربیت یافتہ عملہ عموماً ادا کیا کرتا تھا

لیکن...... انور کے سامنے یہ فقرے ادا کرتے ہوئے سوزی نے اپنی زبان دانی سے زیادہ اپنی جسمانی حرکات و سکنات سے کام لیا تھا اور محض دو منٹ کے اس قرب سے انور کے رگ و پے میں ایک سنسناہٹ سی سرایت کرنے لگی تھی۔

''آیئے سر! ملک صاحب کی میز تو ہمیشہ ریزرو رہتی ہے۔''

اس نے انور کے سامنے سے ہٹ کر اس کے پہلو میں کھڑے ہو کر قریباً گھومتے ہوئے دائیں ہاتھ کو مخصوص انداز میں ہلا کر ایک طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

اور......

انور کسی سحر زدہ معمول کی طرح اس کے تعاقب میں چلتا اس میز تک آ گیا جو ڈائننگ ہال کے ایک کونے میں شیشے کی ایک دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ یہ بڑی خاص قسم کی میز تھی...... کیونکہ شیشے کی اس دیوار کے باہر کا منظر بڑا ہوش ربا تھا۔

یہاں سے ہوٹل کا سوئمنگ پول دکھائی دیتا تھا جس کے کنارے درختوں کی چھاؤں تلے تیراکی کے لباس میں موجود ملکی اور غیر ملکی خواتین آرام دہ کرسیوں پر نیم دراز بیئر اور وسکی کی چسکیاں لگایا کرتی تھیں۔

سوزی نے میز کے ایک طرف دھری کرسی کو تھوڑا پرے ہٹا کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور انور کے بیٹھتے ہی اس نے میز پر دھری چیزیں بڑے سلیقے سے جان بوجھ کر دوبارہ سجا دی تھی۔

اس درمیان وہ کن اکھیوں سے انور کا جائزہ لیتے ہوئے دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی کہ اس کی محنت رنگ لا رہی ہے۔

دراصل وہ بھی ملک کی طرح ''را'' کی ہی ایک آفیسر تھی۔ ملک سے البتہ بہت جونیئر تھی۔

ملک کو اس طرف آتے دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔

''انور یار برا مت ماننا۔ میں دو منٹ میں آیا...... دراصل یہاں بڑی مصیبت یہی ہے ہر دوسرا بندہ واقف نکل آتا ہے...... میں تو اب اس ہوٹل کو چھوڑنے کا فیصلہ کرنے والا ہوں...... کوئی اور ٹھکانہ ڈھونڈتے ہیں یار بندے کی پرائیویسی ہی نہیں رہتی...... او کے تم کوئی بھی آرڈر دو...... اپنی پسند کا سوپ منگواؤ...... بس میں ابھی ذرا اس سالی مسز ماتھر کو ٹرخا دوں...... اگر یہاں آ گئی تو جم کر بیٹھ جائے گی......''

اس نے ہال کے دوسرے کونے میں ایک میز پر بیٹھی ایک جواہرات سے لدی پھندی عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

انور نے چوروں کی طرح چاروں اطراف کا جائزہ لیا اور اس کی نظریں شیشے کی دیوار کے پار سوئمنگ پول کے کنارے دھوپ سینکتی ایک مغربی حسینہ پر جم کر رہ گئیں ابھی تک وہ ماحول کے سحر سے آزاد نہیں ہوا تھا۔ یہاں ہر قدم پر ایک سے ایک بڑی حیرت اس کی منتظر تھی۔

ابھی وہ باہر کے ایک منظر سے بمشکل سنبھل پایا تھا جب سوزی کے بدن سے چھوٹی

مخصوص خوشبو اس کے نتھنوں میں گھسی......

انور نے گردن گھمائی اور سوزی کو اپنی طرف بڑھتے پایا جس نے اس کے نزدیک پہنچ کر جان بوجھ کر اس کے پہلو سے ہوٹل کا مینو اس کی طرف بڑھا دیا اور اب جہاز کی فسٹ کلاس میں کام کرنے والی ایئر ہوسٹس کی طرح اس کی کرسی کے ایک کونے پر ہاتھ جما کر قدرے خم کھا کر اس کی طرف جھکتے ہوئے اس سے اس کا پسندیدہ سوپ دریافت کر رہی تھی۔

انور نے زندگی میں اس سے پہلے تین چار مرتبہ سوپ ضرور پیا تھا لیکن بڑے تھرڈ کلاس قسم کے چائنیز ہوٹلوں میں......

اس سے زیادہ کی وہ اوقات ہی نہیں رکھتا تھا۔

کپکپاتے ہاتھوں سے اس نے ہوٹل آکاش کے مینوں کی سرخ جلد والی بڑی سی فائل پکڑی جس کے ہر حصے پر مختلف اشیائے خورد و نوش کی فہرست درج تھی۔ جن کے سامنے مختلف نمبر لگے ہوئے تھے۔

انور نے خود پر قابو پاتے ہوئے سوپ والا صفحہ نکالا اور کچھ سمجھ نہ آنے پر چکن کے سامنے کچھ لکھا دیکھ کر وہی نمبر پکار کر اپنی دانست میں مینو سے جان چھڑا لی۔

''ونڈر فل چوائس سر...... یہ ہماری سپیشل آفر ہے......''

سوزی نے اس کے پہلو سے اس پر قریباً جھکتے ہوئے مینو اٹھا لیا......

''تھینک یو......''

یہ وہ دوسرا فقرہ تھا جو تب سے اب تک اس نے ادا کیا تھا۔ ورنہ اب تک صرف سوزی بولتی آئی تھی اور وہ ہونقوں کی طرح صرف اس کی شکل دیکھ کر کبھی مسکراتا اور کبھی اثبات میں سر ہلاتا آیا تھا۔

''کچھ اور سر''

سوزی نے مینو پکڑ کر ایک خاص ادا سے مسکراتے ہوئے عجیب سا سوال کر دیا۔

''نو تھینک یو...... ملک صاحب آ جائیں پھر منگواتے ہیں۔''

اس نے مزید سنبھل کر اپنے اوسان بحال کرتے ہوئے کہا۔

''رائیٹ سر۔''

کہہ کر سوزی آگے بڑھ گئی۔

جب تک وہ کاؤنٹر کے پیچھے غائب نہیں ہو گئی انور کی نظریں اس کی پشت پر جمی

رہیں۔ کاؤنٹر کے نزدیک گھومتے ہوئے اس نے مڑ کر انور کی طرف مسکرا کر دیکھا تو اس نے اس طرح کھسیانے ہو کر سر جھکا لیا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

☆....☆....☆

سوزی اس کے دل و دماغ پر بری طرح چھا گئی تھی اور وہ اس کے سامنے خود کو دبا ہوا محسوس کر رہا تھا جب اسے ورما ملک اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ ملک کی آمد سے اسے بہر حال کچھ سہولت کا احساس ہوا تھا۔

"معاف کرنا یار...... تم بھی کہہ رہے ہو گے کیسا بے وقوف آدمی ہے...... دراصل ہمارا دھندا ہی سالا ایسا ہے۔"

اس نے انور کے سامنے کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔

"ملک صاحب کوئی بات نہیں......!!"

انور نے اپنی دانست میں شاید اپنی صفائی پیش کی تھی۔

"سوپ کا آرڈر دے دیا......"

ملک نے دریافت کیا۔

"ہاں......"

انور نے شیشے کے باہر چور نظروں سے جھانکتے ہوئے کہا۔

"گڈ...... مجھے بس یہی پرابلم رہتی ہے...... آدھی زندگی ہوٹلوں کی نذر کرنے کے باوجود مجھے آج تک آرڈر دینے کا سلیقہ نہیں آیا۔ ہر وقت یہی فکر لگی رہتی ہے کہ جو شے میں منگوا رہا ہوں وہ سامنے والے کو پسند بھی آئے گی یا نہیں...... اور دوسری طرف معاملہ یہ ہے کہ دوسرا جو بھی منگوا لے مجھے پسند آ جاتا ہے۔"

ورما نے اس کے حق میں بھی خود ہی بیان دے دیا۔

"اپنا بھی یہی مسئلہ ہے سر......!"

انور اب کچھ سنبھل چکا تھا۔

"یار یہ کیا تم نے سر! سر! لگا رکھی ہے۔ بھئی ہم کوئی آفس نہیں چلا رہے۔ دوستوں میں ایسا تکلف نہیں چلتا۔"

اس نے انور کو ٹوک دیا۔

دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ ورما ملک اسے اپنا تعارف کروا رہا تھا جو

سب جھوٹ کا پلندہ تھا۔

"اوہ کمال ہے بھئی۔ ابھی تک میں اپنا ہی تعارف کروا رہا ہوں اور تمہارے متعلق کچھ جانتا ہی نہیں۔ یار اب کچھ بتا ہی دو۔"

اس نے بالآخر بے تکلفی سے کہہ دیا۔

جواب میں انور نے اس کے سامنے خاصی بڑھا نک دی اور اپنا تعلق خاندان مغلیہ کے آخری شہنشاہ کی اولاد سے جوڑنے کے بعد ستم ظریفی حالات کا کچھ گلہ کرنے کے بعد بتایا کہ اب وہ لوگ معمول کی زندگی بسر کر رہے ہیں اس کے بزرگوں نے ساری جائیداد عیاشی میں لٹا دی تھی۔

ورما ملک کو امید تھی کہ وہ یہی جواب دے گا اور اس جواب سے اس نے اپنے مطلب کے سوالات کا سلسلہ شروع کر دیا۔

"صاحب ہماری قدر شناسی کی بھی داد دیجیے...... کل والی محفل سے صرف آپ کا انتخاب کیا ہے۔ آخر خاندانی لوگوں کی کوئی بات تو متاثر کرتی ہے ناں......"

ورما ملک نے بڑھانکی۔

سوپ آنے تک اس نے ادھر ادھر سے گھما پھرا کر انور کے منہ سے یہ بات اگلوالی تھی کہ اس کی ماں کی ایک بہن ہے جو پاکستان میں رہتی ہے اور اس کی ماں کی زندگی کی ایک ہی خواہش ہے کہ وہ ایک مرتبہ اپنی بہن سے ملاقات کرے لیکن ویزے کا حصول دونوں کے لیے بڑا مسئلہ بنا ہوا ہے۔

اس مرحلے پر جان بوجھ کر ورما ملک نے گفتگو کا رخ دوسری طرف موڑ دیا کیونکہ وہ اس موضوع پر کوئی بات اپنا "ہوم ورک" مکمل کرنے سے پہلے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دونوں باتیں کر رہے تھے جب ایک مؤدب ویٹر سوپ لے آیا اس کے تعاقب میں سوزی بھی چلی آ رہی تھی۔

اس نے خلاف معمول خود ان کے سامنے سوپ رکھا تھا عام حالات میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ یہ ویٹر کی جاب تھی اس کی نہیں......"

"تھینک یوں میڈم...... آپ آج کچھ زیادہ ہی ہماری عزت افزائی نہیں فرما رہیں۔"

ورما ملک نے اس کی طرف مخصوص مسکراہٹ اچھالی۔

"سر! آپ کے ساتھ انور صاحب پہلی مرتبہ تشریف لائے ہیں ناں...... اور ہم

اپنے نئے مہمان کا تو بڑے ہاردا ایک من (دل کی گہرائیوں) سے سواگت کرتے ہیں......"

اس نے انور کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"اینی وے تھینک یو......Any Way Thank You"

ورما ملک نے سوپ اپنے پیلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"سر کھانے میں کیا لیں گے......"

اس نے کھڑے کھڑے پوچھا۔

"کوئی خاص چوائس مسٹر انور......"

ورما ملک نے انور کی طرف دیکھا۔

"نو...... کچھ خاص نہیں...... جو بھی مل جائے۔"

انور اب خاصا سنبھالا لے چکا تھا۔

"ٹھیک ہے بوفے چلے گا۔"

ورما ملک نے گویا اپنی اور انور دونوں کی جان چھڑالی تھی۔

سوزی ایک مرتبہ پھر پہلے کی طرح انور کے دل و دماغ پر بجلیاں گراتی جس طرح آئی تھی اسی طرح واپس لوٹ گئی۔

✡......✡......✡

ہوٹل میں کھانے کے دوران انور کو ورما ملک نے اس بات کا یقین دلا دیا تھا کہ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے شام تک وقت انہوں نے اکٹھے گزارا جس کے بعد وہ اسے واپس چھوڑ آیا......!!

یہ اس کی اور ملک کی پہلی بھرپور ملاقات تھی اگلی ملاقات میں ملک نے اس کے "ناں ناں" کرنے کے باوجود اسے ایک شاندار تحفہ دے دیا۔

"اپنے ایک دوست کی مل ہے۔ کچھ حصہ میرا بھی ہے اس میں...... بس سلیپنگ پارٹنر ہوں۔ وہ لوگ کوئی نیا پراڈکٹ بنائیں تو مجھے یاد کر لیتے ہیں۔ یہ تین چار پیکٹ آئے تھے میں نے کہا ایک اپنے انور بھائی کے لیے ہی سہی۔"

انور اور ملک کی ملاقاتوں کا سلسلہ دو ماہ سے جاری تھا۔ اس دوران اس نے کرید کرید کر اس کے خیالات جذبات اور نظریات کا بخوبی اندازہ لگا لیا تھا۔

ورما ملک نے جان لیا تھا کہ زندگی میں آگے بڑھنے اور سب کچھ روند کر گزر جانے کی

خواہش رکھنے والا یہ مسلمان نوجوان مذہب کے مسئلے پر کچھ زیادہ جذباتی نہیں ہوا اسے سب سے زیادہ اپنی فکر ہے وہ راتوں رات امیر بننا چاہتا تھا اور اپنی اس خواہش کی کچھ بھی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار تھا۔ اس نے انور کو سوزی میں دلچسپی دیکھ کر اس کی دو آف دی ریکارڈ ملاقاتیں بھی انور سے کروا دی تھیں ورما ملک نے بالآخر اسے اپنے لیے منتخب کر لیا۔

اس روز بھی وہ دونوں ایک ڈسکو کلب میں جا رہے تھے جب انور اسے خاصا الجھا الجھا دکھائی دیا۔

"کیا بات ہے۔ بڑے پریشان ہو۔"

اس نے گاڑی چلاتے ہوئے دریافت کیا۔

"ملک بھائی وہی ویزے کا مسئلہ۔ پھر انکار ہو گیا۔ اماں کل ساری رات روتی رہی ہیں۔" انور نے اپنی تشویش ظاہر کی۔

"ارے یار یہ کوئی مسئلہ ہے۔ بے فکر ہو جاؤ۔ ہے میرا ایک یار تمہارا کام کروا دے گا۔"

اس نے بظاہر لا پرواہی سے کہا۔

لیکن...... انور کا اشتیاق بڑھ گیا۔

"کون ہے وہ؟"

اس نے بے چینی سے دریافت کیا۔

"دیکھو انور بھائی میرے دوست زندگی کے مختلف شعبوں میں موجود ہیں۔ مسٹر سنگھ بھی ان میں سے ایک ہے۔ انٹیلی جنس آفیسر ہے لیکن کوئی ایسا کام نہیں جو وہ نہ کر سکے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ آج سے تین چار سال پہلے میں بھی دوسرے نوجوانوں کی طرح ایم اے کرنے کے بعد دہلی کی سڑکوں پر جوتیاں چٹخاتا پھر رہا تھا۔ کوئی منہ لگانے کو تیار نہیں تھا کہ خوش قسمتی سے میں مسٹر سنگھ سے ٹکرا گیا۔ میں نے اس کے لیے کچھ کام کیے ہیں۔ دیکھو انور بھائی اس دنیا کا سیدھا اصول ہے۔ اس ہاتھ دو اور اس ہاتھ لو۔ مفت میں کوئی کسی کے کام نہیں کرتا۔ میں نے مسٹر سنگھ کے لیے کام کیا اور آج میں جس مقام پر کھڑا ہوں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پہلے مجھ تک پہنچانے میں مرکزی کردار مسٹر سنگھ ہی نے ادا کیا ہے...... میری بات مانو تو تم بھی ان لوگوں سے دوستی کر لو...... میری ضمانت اور مثال موجود ہے۔ ایک سال تک چپ چاپ ان کے کہنے پر عمل کرتے رہو۔ صرف ایک سال۔ اور اس کے بعد......

اس نے انور کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"اس کے بعد تم بھی کسی شاندار گاڑی پر سفر کر رہے ہو گے اور دہلی کی کسی ماڈرن آبادی میں تمہارا گھر ہوگا۔زندگی کی ساری خوشیاں ایک ایک کر کے تمہارے دامن میں سمٹ آئیں گی...... انور بھائی قسمت انسان کو کبھی کبھی چانس دیا کرتی ہے...... اگر خوش قسمتی سے تمہیں یہ موقعہ ملے تو اسے ہاتھ سے نہ جانے دینا......"

اس نے اپنی بات مکمل کی۔

"میں تیار ہوں ملک بھائی...... میں تیار ہوں...... میں ایک اچھی اور پر آسائش زندگی کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔"

انور نے بے ساختہ کہا۔

وہ ورما ملک کی توقع سے بڑھ کر بے وقوف ثابت ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے کل ہی ملتے ہیں مسٹر سنگھ سے۔"

ورما ملک نے گاڑی کے ایکسیلیٹر پہ پاؤں کا دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔

***

اور......

اگلے روز شام کو اس نے مسٹر سنگھ کو اس سے ٹکرا دیا۔

تینوں ایک کافی شاپ میں ملے تھے۔

مسٹر سنگھ تو ورما ملک سے بھی زیادہ کو آپریٹو ثابت ہوا۔اس نے انور کو بتایا کہ اگر وہ ان کے چھوٹے موٹے کام بھی کرنے پر تیار ہو تو نہ صرف یہ کہ اس کے سارے خاندان کے لیے ویزوں کا بندوبست کروا دیا جائے گا بلکہ اسے عیش و آرام کے بھی تمام مواقع میسر ہوں گے اور ادھر بھارت میں اس کی طرف کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرات بھی نہیں ہوگی......!

انور نے بغیر سوچے سمجھے ہاں کر دی۔

مسٹر سنگھ نے دم رخصت اس کو ایک بند لفافہ تھما دیا۔

"یہ کیا۔"

اس نے حیرانگی سے دریافت کیا۔

"تمہاری تنخواہ......!"

مسٹر سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن سر! ابھی تو......"

جب تمہاری طرف سے ہاں ہو گئی تو نوکری شروع، ہم تو یاروں کے یار ہیں۔ تمہیں ملک صاحب نے ملوایا ہے اور ان کے ہر حکم کو ماننا ہمارا تو دھرم ہے۔بس اب تم تیاری کر لو اور ہاں کچھ روز تمہیں میرے ساتھ ہمارے تربیتی مرکز پر جانا ہوگا۔"

مسٹر سنگھ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"سنگھ صاحب جب انور میاں نے تنخواہ وصول پا لی پھر اب نہ والی بات تو نہیں رہی ناں آپ یہ فرمائیے انہیں کب سے جانا ہوگا۔"

انور کے بجائے ورما ملک نے کہا۔

کل سے......ہم تو کام کے معاملے دیر کے ہرگز قائل نہیں ہیں۔"

سنگھ نے جواب دیا۔

"او کے۔"

اس مرتبہ بھی ورما ملک نے ہی ہامی بھری تھی۔

سنگھ رخصت ہو گیا۔

انور نے لفافے میں موجود نوٹ بغیر گنے انہیں جیب میں رکھ لیا۔

"یار تم بڑے خوش قسمت ہو بھئی"

ملک نے چھٹتے ہی کہا۔

انور ہونقوں کی طرح سوالیہ نشان بنا کر اس کے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اپنے تک بات رکھنا تمہیں بھارتی فوج کی ملٹری انٹیلی جنس ایجنسی نے اپنی خدمات کے لیے چن لیا ہے اور اسے معمولی بات نہ سمجھنا...... یہ اعزاز قسمت والوں کو ہی ملا کرتا ہے......بھئی میں تو اس معاملے میں خود کو بڑا خوش قسمت سمجھتا ہوں دیکھو ناں انکے ساتھ رہ کر دیس کی سیوا بھی کر رہے ہیں اور دنیا کی تمام نعمتیں بھی حاصل ہو رہی ہیں اور کسی سالے پولیس والے کی جرأت نہیں کہ آنکھ اٹھا کر ہماری طرف دیکھ سکے۔"

"آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہی ہوگا ملک صاحب۔"

انور نے اثبات میں سر ہلایا۔

اسے اس بات کا علم نہ ہو سکا کہ اسے تو ان لوگوں نے ایجنسی کا نام بھی صحیح نہیں بتایا تھا جس میں انور کو بھرتی کیا جا رہا تھا۔

یہ ''را'' کے لیے کام کررہے ہیں۔عموماً انہیں یہ تاثر دیا جاتا تھا کہ وہ کسی دوسری انٹیلی جنس ایجنسی کے ملازم ہوگئے ہیں تاکہ گرفتاری کی صورت میں انہیں صحیح ایجنسی کا بھی علم نہ ہو پائے۔

✿......✿......✿

انور کی ملاقات اگلی مرتبہ مسٹر سنگھ سے اکیلے میں ہوئی تھی۔

انہوں نے انور کے ساتھ ایک ہوٹل میں لنچ کیا جس کے بعد وہ اسے شہر کے نزدیک ایک سرکاری ڈاک بنگلے پر لے گئے۔

''انور میاں اب تم بھارتی آرمی انٹیلی جنس کے باقاعدہ ملازم بن چکے ہو۔تمہیں ہم بم بنانے اور دھماکہ کرنے کا کورس کروائیں گے۔جس کے بعد تمہیں کہیں بھی خدمات پر مامور کیا جاسکتا ہے اور ہاں ایک بات کا خیال رہے کہ تم اپنی اس تربیت کے متعلق، اس جگہ کے متعلق یا میرے ساتھ ملاقات کے متعلق سوائے ورما ملک کے اور کسی سے بات بھی نہیں کر سکتے۔جہاں تک ورما ملک کا تعلق ہے کیونکہ وہ ہمارا بہت خاص آدمی ہے اور ہم اس پر اعتماد کر سکتے ہیں ممکن ہے اگر افسران اعلیٰ اجازت دیں تو میں تمہیں مستقل اس کے ساتھ لگا دوں کیونکہ تم اس کے ساتھ خاصے بے تکلف ہو......''

مسٹر سنگھ نے ساری بات اتنی چالاکی سے کی تھی کہ انور کی سمجھ میں کچھ نہ آسکا۔اسے صرف ایک یہ بات سمجھ آرہی تھی کہ وہ کوئی عام بھارتی ناگرک نہیں رہا بڑا خاص شہری بن گیا ہے اور دولت کی ریل پیل ہونے جارہی ہے اور اب ساری زندگی وہ موج میلہ کرے گا۔اس نے ابھی یہ نہیں سوچا تھا کہ مسٹر سنگھ نے اس سے جو خدمات لینے کی بات کی تھی اس کا مطلب کیا تھا۔

اس ڈاک بنگلے پر انور کی کچھ تصاویر ایک سرکاری فوٹو گرافر نے بنائیں اور مسٹر سنگھ نے اس سے کچھ فارم بھی پر کروائے۔

ان کاغذ کے ٹائپ شدہ فارموں کو پر کرنے کے بعد اس کے ہاتھوں اور پاؤں کے نشانات محفوظ کئے گئے اور انور کو بتایا گیا کہ اب اس کی باقاعدہ سرکاری حیثیت قائم ہوگئی ہے اور اب وہ سرکاری احکامات کا پابند ہے۔مسٹر سنگھ نے اپنی سرکاری اور اخلاقی ذمہ داری سمجھتے ہوئے اسے قانون کی ایک دفعہ تھری آفیشل سیکرٹ ایکٹ سے آگاہ کیا اور بتایا کہ اگر اس نے کسی بھی حکم کو ماننے سے انکار کیا تو اس دفعہ کے تحت گرفتار کرلیا جائے گا جس کے بعد پھر ساری زندگی عقوبت خانوں میں گزرتی ہے گو کہ آج تک مسٹر سنگھ نے اسے کوئی دھمکی نہیں دی

تھی اور اس سے ہمیشہ خوشگوار موڈ میں بات کی تھی......

لیکن......

آج اس نے قدرے سنجیدگی اختیار کی ہوئی تھی خصوصاً قانون کی اس دفعہ سے متعلق اسے خبردار کرتے ہوئے تو وہ بہت ہی سنجیدہ ہوگیا تھا۔

''کل سے تمہاری باقاعدہ کلاسیں شروع ہورہی ہیں۔تمہاری ماہانہ تنخواہ مقرر ہوچکی ہے۔تم نے بی اے بھی پاس کرلیا ہے اگر چاہو تو اپنے والدین کو اپنی نوکری سے متعلق اطلاع دے سکتے ہو......لیکن خبردار کبھی بھولے سے بھی انہیں یہ نہ بتانا کہ تم سرکاری ملازم ہو۔انہیں بتانا کہ تم ریلوے میں بھرتی ہوگئے ہو اور کلرک کی نوکری کررہے ہو......تمہارا ریلوے کی نوکری کا کارڈ تمہیں کل مل جائے گا......تمہیں تمہارا دفتر بھی دکھا دیا جائے گا جہاں تمہاری باقاعدہ حاضری لگا کرے گی اور یہیں سے تمہیں تنخواہ بھی ملا کرے گی...... اس لئے کوئی گھبرانے والی بات نہیں ہے......کوشش کرنا کہ تمہارے دفتر میں کم ہی مہمانوں کا آنا ہو......اپنے دوستوں کو دفتر بلانے سے احتراز ہی کرنا لیکن اگر کسی کا آنا ناگزیر ہو تو کوئی بات نہیں......انور! اب تم ہماری ٹیم کے ایک رکن ہو۔اب بھارت ماتا کی رکھشا تمہاری بھی اتنی ہی ذمہ داری ہے جتنی ہماری......آج کے بعد سے تمہارا جینا مرنا سب بھارت ماتا کے لیے ہوگا......''

مسٹر سنگھ نے کہا۔

''ایسا ہی ہوگا سر!''

انور نے بھی تن کر جواب دیا۔

وہ کچھ گھبرایا ضرور تھا۔

لیکن......

اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ اپنی گھبراہٹ کو چہرے پر سجا کر پیش کرتا۔اسے علم تھا کہ اب معمولی سا شک ہونے پر بھی اسے کم از کم نوکری سے نکال دیا جائے گا اور اس دوران وہ جن قباحتوں کا عادی ہوچکا تھا ان سے محروم ہو جائے گا۔

✿......✿......✿

سیف ہاؤس

فیروز آباد دہلی کا مضافاتی علاقہ ضرور تھا لیکن بڑا الگ تھلگ اور مین روڈ سے قدرے ہٹ کر واقع تھا۔ یہاں ریلوے کی کوئی مین لائن بھی نہیں گزرتی تھی۔ البتہ اورنگ آباد سے ایک چھوٹی لائن اس طرف آتی تھی جو پھر دہلی سے جاملتی تھی۔

فیروز آباد کی آبادی میں مسلمان کبھی اکثریت میں ضرور تھے لیکن اب تو وہ اقلیت بھی نہیں رہے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد یہاں ہونے والے خونی فسادات نے مسلمانوں کو گھر بار چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا جو چند گھرانے بچ رہے تھے انہیں بیس سال پہلے یہاں سے تب رخصت ہونا پڑا جب ایک روز فوجیوں نے ان کے گاؤں کو گھیر لیا۔ انہیں بتایا گیا کہ اس علاقے میں فوج چھاؤنی قائم کر رہی ہے اور ان لوگوں کو اپنے گھر بار چھوڑنے ہوں گے اس کے بدلے انہیں دہلی میں مکانات رہنے کو ملیں گے۔

بے چارے مسلمان یہاں پہلے ہی افلاس زدہ تھے۔

دہلی میں گھر ملنے کی خبر ان کے لئے کسی بھی طرح خوشخبری سے کم نہیں تھی۔ انہوں نے اس پر بھی خدا کا شکر ادا کیا اور اپنا اسباب باندھنے لگے۔ اس بات کا علم تو انہیں دہلی جانے پر ہوا کہ ان کے ساتھ کتنا بڑا دھوکہ ہوا ہے اور ان کی خاندانی حویلیوں کے مقابلے میں انہیں دو دو کمروں کے کوارٹر الاٹ کئے گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں سختی سے وارننگ دی گئی تھی کہ اگر کسی نے اس پر احتجاج کیا یا لیڈر بننے کی کوشش کی تو اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔

مسلمانوں کو علم تھا کہ ان کی حیثیت اس ملک میں ''شودروں'' سے زیادہ کچھ نہیں اور واقعی احتجاج کرنے پر انہیں جان کے لالے پڑ سکتے تھے سو انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔

فوج والوں نے یہاں قریباً دو کلومیٹر کے ایریا کے گرداگرد لوہے کی نوکیلی تاروں سے بڑی بڑی دیواریں کھڑی کر دی تھیں جن کے بعد پھر یکے بعد دیگرے تین اور دیواریں

بنائی گئیں جن میں درخت لگا کر انہیں مکمل کیموفلاج کر دیا گیا۔

اس کے بعد یہاں بلڈنگیں تعمیر ہونے لگیں۔

ان بلڈنگوں میں کون رہتا ہے؟

یہاں کیا ہوتا ہے؟

اس دفتر کا کیا نام ہے؟

گزشتہ 20 سال سے کسی کو ان سوالات کے جوابات نہیں مل سکے تھے۔ فیروز آباد کے مکینوں کو صرف اس بات کا علم تھا کہ یہاں ملٹری والوں نے ڈیرے لگائے ہوئے ہیں شاید کوئی چھوٹی سی چھاؤنی تھی جس میں آرمی کے ٹرکوں کی آمد و رفت لگی رہتی تھی۔

لیکن......

ان بے چارے دیہاتیوں کو کبھی اس بات کا علم نہ ہو سکا کہ جسے وہ فوج کا معمولی سا پڑاؤ سمجھتے ہیں وہ دراصل بھارت کی سپریم انٹیلی جنس ایجنسی ''را'' کا دہشت گردی کیمپ ہے۔

اس کیمپ میں ''را'' اپنے ایجنٹوں کو جن میں زیادہ تعداد ہمسایہ ممالک کے غداروں کی ہوتی تھی تربیت دیا کرتی تھی۔ یہاں انہیں بم بنانا، اسے استعمال کرنا، دہشت گردی کی دیگر کارروائیاں اور ان سے بہترین نتائج حاصل کرنے کی تربیت دی جا رہی تھی۔

اس کیمپ کی خصوصی اہمیت کے پیش نظر اس کی حفاظت پر کبھی بی ایس ایف اور کبھی فوج کی ایک کمپنی مامور رہتی تھی اور وہ لوگ یہاں مستقل ڈیرے ڈالے رکھتے تھے۔

۞......۞......۞

انور جب یہاں آیا تو اس کے گروپ کے پانچ نوجوان اور بھی پہلے سے یہاں موجود تھے۔ جن میں سے ایک کا تعلق پاکستان سے تھا باقی چاروں تامل تھے۔ جنہیں دہشت گردی کی تربیت دے کر بھارتی اپنے ہمسایہ ممالک کے امن و امان کو تہہ و بالا کرنے کے لیے ان کے متعلقہ ممالک میں لانچ کر لیا کرتے تھے۔ ان کا انسٹرکٹر ایک ڈھلتی عمر کا فوجی آفیسر تھا جسے وہ ''سر'' کہہ کر پکارتے تھے۔

اس سے زیادہ معلومات اس کے متعلق کسی کو نہیں تھیں اور نہ ہی کوئی اس کا تردد کرتا تھا۔ ان سب کو یہاں لانے پر ایک بات بطور خاص سمجھائی گئی تھی کہ وہ یہاں سے متعلق صرف انہی معلومات پر اکتفا کریں گے جو انہیں پہنچائی جائیں گے۔

اپنے طور پر کوئی اس سے زیادہ جاننے کی جستجو یا خواہش نہیں کرے گا جو اسے بتایا

گیا ہو یہاں ایک دوسرے سے زیر تربیت لوگ اپنا صرف اتنا اور وہی تعارف کرواتے تھے جو انہیں بتایا گیا تھا۔

یہ ان سب کے ''کور'' Cover نام تھے!

ان سب کی شناخت جعلی تھی!

ان کی اصلیت کا علم سوائے ''را'' کے ایک چیف کے اور کسی کو نہیں تھا۔

یہاں غیر ملکی ایجنٹوں سے متعلق اتنی زیادہ راز داری کا اہتمام کیا جاتا تھا جس کا دنیا کی دوسری ایجنسیاں تصور بھی نہ رکھتی ہوں۔

ایک دوسرے کے ساتھ مدتوں کام کرنے کے بعد بھی یہ لوگ اپنے ساتھیوں کا اصلی نام یا پتہ نہیں جان سکتے تھے۔

اکثر کے تو ممالک کا نام بھی غلط بتایا جاتا تھا اور ان میں سے ہر ایک کو بطور خاص یہ بات سمجھائی جاتی تھی کہ اگر وہ کسی بھی مرحلے پر یہ بات محسوس کریں کہ ان کے ساتھیوں میں سے کوئی ان کے متعلق جاننے کی کوشش کر رہا ہے یا انہیں اس بات کا شک گزرے کہ ان کے ساتھی نے اپنے طور پر فراہم کردہ معلومات سے زیادہ کچھ جان لیا ہے یا جاننے کی کوشش کی ہے تو اس کے متعلق اپنے انسٹرکٹر کو ضرور اعتماد میں لیں...... اپنے ساتھی سے متعلق کسی ایسی بات کو چھپانا جرم تھا جس کی کم از کم سزا یہاں موت تھی۔ کیونکہ ''را'' کے نزدیک ایسا ایجنٹ جو اپنے کسی ساتھی کو بچانے کے لیے اس سے متعلق کوئی بات چھپاتا ہے وہ اس کے جرم میں برابر کا شریک سمجھا جاتا ہے۔

یہاں آنے والے ہر ایجنٹ کو علیحدہ علیحدہ بریفنگ دے کر برین واشنگ کے بعد اسے سنٹر میں بھیجا جاتا تھا۔

انہیں بطور خاص سمجھایا جاتا تھا کہ وہ تلوار کی دھار پر چل رہے ہیں اگر ان کی اصلیت کے متعلق کسی ساتھی کو بھی علم ہو گیا تو وہ خود مارے جائیں گے۔ کیونکہ ممکن ہے ان سے متعلق معلوم ہونے والی کوئی بھی بات ان کے اپنے ملک کی سکیورٹی ایجنسیوں کے علم میں نہ آ جائے۔

یہ لوگ ایک دوسرے سے متعلق بڑا محتاط رویہ اختیار کیے ہوئے تھے۔

''را'' کے نفسیاتی ماہرین انہیں ایک دوسرے سے اس طرح خوفزدہ کر دیتے تھے کہ وہ دودھ کے جلے کی طرح پھر چھاچھ کو بھی پھونکیں مارنے لگتے تھے۔

پانچ روز تک وہ اکٹھے تربیت حاصل کرتے رہے۔

ان کے ''سر'' نے اس درمیان انہیں دھماکہ خیز بموں کی تیاری میں استعمال ہونے والے مواد کی تفصیلات، ان کی فراہمی کے طریقے اور ان کے استعمال کے زیادہ سے زیادہ مثبت نتائج حاصل کرنے سے متعلق بتایا تھا۔

اس درمیان ہر اگلے روز انہیں پہلے والے دن سے متعلق بتائی گئی معلومات دہرانے کے لیے کہا جاتا تھا اور متعلقہ انسٹرکٹر اس تسلی کے بعد اگلا سبق پڑھاتا تھا کہ اس کے شاگردوں کو پچھلا سبق پورا ازبر ہے۔

اس روز انہوں نے اپنی عملی تربیت کا آغاز کرنا تھا جب ان کے انسٹرکٹر نے انور کو شام ڈھلے اپنے کمرے میں بلایا جہاں ایک نوجوان پہلے سے موجود تھا۔ اس کی شکل پر ایک نظر پڑتے ہی انور پہلے تو چونکا پھر گھبرا گیا کیونکہ یہ نوجوان اس کا ''کورس میٹ'' تھا جس کا نام اسے نذیر بتایا گیا تھا۔

انور میاں کو یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ کہیں خدانخواستہ اس کے ساتھی کو اس کی کسی حرکت پر شک نہ گذرا ہو اور اس نے انسٹرکٹر سے شکایت کر کے اس کی طلبی کروائی ہو۔ لیکن......

جلد ہی اس کی جان میں جان آئی جب انسٹرکٹر نے بڑے ہلکے پھلکے انداز میں مسکراتے ہوئے اسے مخاطب کیا اور کہا۔

''اسے تم یقیناً جانتے ہی ہو گے۔''

''یس سر''

انور نے سنبھل کر کہا۔

''یہاں...... اس کا نام تمہیں نذیر بتایا گیا ہے دراصل یہ کور Cover نام ہے۔ اس کا نام اصل میں اختر ہے۔''

انسٹرکٹر نے انور کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''رائیٹ سر۔''

انور نے ہونقوں کی طرح گردن ہلائی وہ انسٹرکٹر سے آنکھیں ملا کر بات کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ لیکن اس کو یہ سمجھ نہ آ سکی کہ اس نوجوان کا جو نام اسے بتایا گیا ہے وہ بھی غلط تھا اور اس کے بعد بھی اسے غلط ہی بتایا جانا تھا۔

''اس کا نام دراصل اختر ہے...... لیکن اس کا علم تمہارے علاوہ اور کسی کو نہیں ہونا

چاہیے۔ اس بات کا خیال رہے۔"

انسٹرکٹر نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

"یس سر۔"

انور نے اس سے ایک لمحے کے لیے آنکھیں ملا کر نظریں جھکالیں۔

"اور مسٹر اختر...... یہ ہے سیموئیل...... مستقبل میں چونکہ تم دونوں ایک دوسرے کے ممکنہ ساتھی ہو سکتے ہو میں نے مناسب سمجھا کہ تمہارا آپس میں تعارف کروا دوں۔"

اس مرتبہ اس نے اختر کی طرف دیکھ کر کہا۔ جس کی حالت انور سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ انور کو اس کیمپ میں سیموئیل کا نام دیا گیا تھا اور اس نے واقعی اپنا اصلی نام بھلا دیا تھا اب خود کو سیموئیل کہنے لگا تھا۔

اس کے گلے میں چھوٹی سی صلیب لٹکنے لگی تھی اور اسے بطور خاص ہدایت کی گئی تھی کہ وہ عیسائیوں کی طرح دن میں دو تین مرتبہ باپ، بیٹا اور روح القدس کو ضرور یاد کیا کرے......انور نے بڑی کامیابی سے ان ہدایات پر عمل کیا تھا۔

اس کے کورس میٹوں کو اس کی شہریت پاکستانی بتائی گئی تھی...... چونکہ انہیں سختی سے ہدایت کی جاتی تھی کہ ایک دوسرے کے ساتھ گپ شپ ضرور کریں لیکن ایک دوسرے کی شناخت جاننے کے چکر میں نہ پڑیں۔ اس لئے کوئی ایک دوسرے سے اس کا مکمل ایڈریس نہیں پوچھتا تھا۔

"آج رات تمہاری دوستی کے نام پر ایک پارٹی دی جا رہی ہے......جس میں صرف تم دونوں شرکت کرو گے۔"

انسٹرکٹر نے کہا۔

"تھینک یو سر۔"

دونوں نے بیک وقت ایک ہی بات کہی۔

اس کے بعد انسٹرکٹر نے انہیں ایک مختصر سا لیکچر دے کر بڑے نفسیاتی طریقے سے قائل کرنے کی کوشش کی کہ بھارت بہت بڑا اور بہت مضبوط ملک ہے جسے پاکستان کبھی نہیں توڑ سکتا نہ ہی ختم کرسکتا ہے البتہ بھارت جب چاہے پاکستان کو ختم کرسکتا ہے اور وہ دونوں بہت عقلمند ہیں جنہوں نے جذباتیت کے بجائے حقیقت کا سہارا لیا۔ اور آنے والے وقت کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے بھارتی حکومت کی خوشنودی حاصل کر کے خود کو اس کی گڈ

بکس (Good Books) میں داخل کروالیا کیونکہ جلد یا بدیر پاکستان نے ختم ہونا ہے اور وہ ماضی بعید کی طرح بھارت کا حصہ بن جائے گا۔

دونوں بظاہر بڑے جوش وخروش سے اس کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ انکے دلوں کا حال خدا ہی بہتر جانتا تھا۔

نصف گھنٹہ وہ دونوں کے دل و دماغ میں اپنی دانست میں بڑے مضبوط دلائل کے ساتھ اپنے نظریات کا زہر اتارتا رہا۔ جس کے بعد اس نے انہیں بھیج دیا اور رات کو پھر اس کمرے میں ملنے کے لیے کہا۔

اس روز شام کو ایک اور انسٹرکٹر انہیں باقاعدہ دھماکہ خیز مواد تیار کرنے کی تربیت کا آغاز کیا اور انہیں بڑی تفصیل کے ساتھ مختلف مقامات پر ان میں استعمال ہونے والے مواد کے حصول سے متعلق بھی آگاہی دی۔

۞......۞......۞

لیکچر سے فارغ ہونے کے بعد دونوں اکٹھے ہی انسٹرکٹر کے کمرے میں پہنچے تھے۔ شام ڈھل چکی تھی اور اب رات کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ یہ وقت ان کے معمول کے ڈنر کا تھا لیکن آج انہوں نے اپنے "سر" کے کہنے پر ڈنر بھی کسی اور جگہ کرنا تھا۔

"آؤ بھئی جوانو......تمہیں موج میلہ کروائیں۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔"

اس نے اٹھتے ہوئے کہا اور دونوں کو اپنے ہمراہ لے کر اس عمارت کے دوسرے بلاک کی طرف چل دیا۔

انور اور اس کے ساتھی نے اس بلاک میں پہلی مرتبہ قدم رکھا تھا۔ انہیں سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ اپنے لئے مخصوص جگہ سے باہر وہ قدم بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔

ان کی حیثیت یہاں آنے کے بعد عملاً قیدیوں جیسی ہو کر رہ گئی تھی۔ آج وہ دونوں پہلی مرتبہ اس طرف آئے تھے۔

دوسرے بلاک کے مین گیٹ پر کھڑے پہرے داروں نے انسٹرکٹر کی شکل پر نظر پڑتے ہی دروازہ کھول کر ان کا استقبال کیا۔

اور......

تھوڑی دیر بعد دونوں انسٹرکٹر کی معیت میں اس بلاک میں بنی عمارتوں میں سے ایک کے پہلے فلور پر موجود تھے۔

یہ مکمل فلور کسی فائیو سٹار ہوٹل کا منظر پیش کر رہا تھا۔فلور میں داخل ہونے پر دروازہ کھلتے ہی ان کی نظر ایک خوبصورت اور نیم برہنہ لڑکی پر پڑی تھی۔ جس نے انہیں بڑے درباری انداز میں جھک کر ''جے ہند'' کہا اور اب تینوں اس کی معیت میں ایک کمرے کی طرف جا رہے تھے۔

''ڈنر کا کیا بندوبست ہے بھئی۔''

چلتے چلتے انسٹرکٹر نے اس سے دریافت کیا تھا۔

''سب کچھ تیار ہے جناب۔صرف آپ کا انتظار تھا۔''

اس نے بڑی شستہ اور مہذب انگریزی میں جواب دیا۔

''ٹھیک ہے دیکھ لیتے ہیں۔''

انسٹرکٹر نے یہ کہتے ہوئے اس کی کمر پر بڑے بے ہودہ انداز میں ہاتھ رکھا تو لڑکی اس کے بازوؤں ہی میں جھول گئی۔

اب وہ کمرہ بھی آ گیا تھا۔

کمرے کا دروازہ مخصوص دستک پر کھلتے ہی انور کو یوں لگا جیسے وہ غلطی سے کسی انگریزی فلم کے سیٹ پر آ گئے ہوں۔

وہاں پہلے سے موجود دو خوبصورت اور نیم برہنہ لڑکیوں نے ان کے آگے بڑھ کر ایسے خراخدلی سے استقبال کیا جیسے پہلے سے آپس میں بہت بے تکلف ہوں۔

''آئی ایم شالی''

آئی ایم نیتا۔''

دونوں نے باری باری جھکتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔

اور......

ان کی خیریت معلوم کرنے کے بعد ان کے لیے ڈرنکس بنانے لگیں۔

جس درمیان وہ دونوں اپنے مہمانوں کے لیے شراب کے جام تیار کر رہی تھیں۔

ان کا انسٹرکٹر تیسری لڑکی کے ساتھ بے ہودہ حرکات میں مشغول ہو گیا تھا۔

انور کو علم نہیں تھا یہ سب ان کے تربیتی کورس کا حصہ ہے۔ یہ تینوں کوئی عام قسم کی فاحشائیں نہیں تھیں۔

تینوں ''را'' کے خصوصی سکواڈ سے تعلق رکھتی تھیں۔انہیں خصوصی تربیت دے کر بطور

خاص اپنے ''غیر ملکی مہمانوں'' کا دل بہلانے کی ذمہ داریاں سونپی جاتی تھیں اور اس فن میں وہ ایسی مہارت رکھتی تھیں کہ ایک مرتبہ جوان کی دسترس میں آیا پھر کبھی ان کے جسمانی چنگل سے نجات حاصل نہ کر سکا۔

ایک مرتبہ ان میں سے کسی کے ساتھ بھی چند گھنٹے گزارنے والے اکثر غیر ملکی ایجنٹ پھر ان کی مزید چند گھنٹوں کی صحبت کے لیے ماہی بے آب کی طرح تڑپا کرتے تھے اور ان کے حصول کے لیے مادر وطن کے ساتھ ''را'' کے اشارے پر کچھ بھی کر گزرنے کو تیار تھے۔موہ اور مایا کے جال میں ایک مرتبہ پھنس کر پھر کوئی مچھلی ان کی دسترس سے نکل نہیں پاتی تھیں۔

انور کو اپنے ساتھی کے متعلق تو زیادہ معلومات نہیں تھی۔

لیکن......

اس نے اپنی زندگی میں ایسی عیاشی کا صرف خواب ہی دیکھا تھا۔

بھارتی معاشرے کا ایک آزاد خیال اور بے راہرو نوجوان ہونے کے سبب وہ کبھی کبھی کسی کلب میں بیئر یا وسکی کے ایک آدھ پیگ کا داؤ لگا لیا کرتا تھا۔

لیکن......

آج جس قیمتی شراب اور شباب سے اس کی تواضع ہو رہی تھی اس کے بعد سے تو اس نے خود کو راجا اندر ہی سمجھنا شروع کر دیا تھا۔

انسٹرکٹر تھوڑی دیر ان کے ساتھ رہا جس کے بعد تینوں اپنی اپنی فاحشاؤں کے ساتھ الگ الگ کمرے کو پدھار گئے۔

ساری رات انور اور اس کا ساتھی شیطان کے چیلے بنے ان چنڈالوں کی خوراک بنے رہے۔علی الصباح وہ انہیں کمروں میں سوتے چھوڑ کر نکل گئیں۔

✡......✡......✡

دونوں کے کمروں کے روشن دانوں سے دھوپ اندر آنے لگی تھی جب انہیں بیدار کیا گیا۔ان کے کپڑے بڑے سلیقے سے پہلے سے غسل خانوں میں سجے ہوئے تھے اور دونوں کو اب جلدی تیار ہو کر ناشتے کے لیے آنے کا حکم ملا تھا۔

انور میاں کے دل و دماغ پر ایک مستقل خماری سوار تھی۔ یہی حالت اس کے دوسرے ساتھی کی بھی ہو رہی تھی۔

دونوں ایک دوسرے سے بہت کچھ کہنا سننا چاہتے تھے لیکن، دونوں ڈسپلن کے

ہاتھوں مجبور تھے۔

لیکن...... یہ کوئی ایسی مجبوری نہیں تھی جس میں ان کی مرضی نہ شامل رہی ہو۔

وہ سب اس میں اپنی بھلائی تسلیم کرتے تھے۔چھٹی کے بعد پھر معمول کی زندگی شروع ہوگئی۔ان سب سے دھماکہ خیز مواد تیار کروا کران کے انسٹرکٹر نے باقاعدہ دھماکے کروا کر دیکھے جس کے بعد انہیں دشمن ملک خصوصاً پاکستان کی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے طریق کار پر سبق دیئے گئے۔

اور......

انہیں بطور خاص بتایا گیا کہ وہ ان کی عقابی نظروں سے کس طرح بچ کر کام کر سکتے ہیں۔اپنا کام مکمل کرنے کے بعد کس طرح فرار ہو سکتے ہیں اور پاکستان کے مختلف شہروں سے متعلق معلومات بہم پہنچائی گئی تھیں۔

ایک ماہ کے اس کورس کے خاتمے پر وہ جدا ہو گئے۔اس تربیت کے دوران بمشکل دو مرتبہ ورما ملک انور سے ملاقات کے لیے آیا تھا۔اس نے انور سے کہا تھا کہ اس کیمپ میں ایک مرتبہ کسی کے آنے کے بعد اس کا رابطہ باہر کی دنیا سے تب ہی بحال ہوسکتا ہے جب وہ دوبارہ یہاں سے باہر نکلیں یہ اُن کی مہربانی تھی کہ انہوں نے ورما ملک کو دو مرتبہ بھی ملنے دیا۔

✡......✡......✡

یہاں سے فراغت کے بعد ان سب کو ایک ہفتہ تک بھارت کے مختلف خوبصورت مقامات کی سیر کروائی گئی۔ان کے ہمراہ ''را'' کی لڑکیاں تھیں۔ان لڑکیوں نے چند روز کی عیاشی ہی میں ان کے چودہ طبق روشن کردیئے اور انہیں تب چھوڑا جب انہیں خود یقین ہوگیا کہ یہ پنچھی اب کبھی ان کے پنجرے سے نکلنے کی تمنا نہیں کریں گے اور اب ان کے ایک اشارہ ابرو پر ان کے لیے جان کی بازی لگانے سے گریز نہیں کریں گے۔

انور میاں کو اب فرصت تھی......

لیکن......

وہ اپنے گھر والوں کو دکھانے کے لیے روزانہ دفتر جاتا تھا۔جہاں اکثر ورما ملک سے اس کی ملاقاتیں رہتیں۔اس دوران ورما ملک نے اسے پاکستان کے کچھ بڑے شہروں کے حساس مقامات سے آگاہی دینا شروع کی اور بتانے لگا کہ اگر اسے فلاں جگہ پر بم نصب کرنا ہوتو کیسے کرے گا اور وہاں سے بہترین نتائج کیسے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

انور کے گھر میں ان دنوں پاکستان سے اس کی خالہ کے خطوط مسلسل آرہے تھے اور وہ لوگ دو مرتبہ ویزہ حاصل کرنے میں ناکامی کے بعد سے اب خاموشی اختیار کر چکے تھے جب اچانک اس روز ورما ملک نے اس کے آتش شوق کو بھڑکا دیا۔

''تم ویزے وغیرہ کی بات کیا کرتے ہو۔''

''ہاں ملک صاحب...... والدہ بہت پریشان رہتی تھیں۔''

انور سے رہا نہ گیا۔

''بس سمجھو تمہارے ویزوں کا بندوبست ہوگیا اور تمہارا یہ سفر بھی وی آئی پی قسم کا بن جائے گا...... سارا خرچ ایجنسی والے لوگ اٹھائیں گے اور تمہیں ایک مشن بھی سونپا جائے گا۔''

ورما ملک نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔''

انور نے جواب دیا۔

ورما ملک نے بطور خاص یہ بات نوٹ کی تھی کہ کہیں وہ بادل نخواستہ تو تیار نہیں ہو رہا۔

لیکن......

اسے یقین ہوگیا کہ ''را'' کی لڑکیوں نے اپنے فرائض ایمانداری سے سرانجام دیئے ہیں اور یہ گدھا اب مکمل موہ مایا کے جال میں پھنس کر ان کی انگلیوں کے اشاروں پر بندروں کی طرح ناچنے کے لیے تیار ہے۔

اب تک اسے بھارتی انٹیلی جنس کی باقاعدہ نوکری میں چھ ماہ ہونے کو آرہے تھے۔اس درمیان اس سے چھوٹے موٹے کام بھی وہ لوگ کرواتے رہتے تھے جن میں اکثر مسلمان محلوں میں پاکستان سے آنے والے مہمانوں کی جاسوسی کے فرائض وہ انجام دے رہا تھا۔

اسے عموماً کسی نہ کسی گھرانے کا ایڈریس دے کر یہ ٹاسک دیا جاتا تھا کہ وہاں آنے والے پاکستانی مہمانوں کے معمولات کی رپورٹ دے۔

اور......

وہ بڑی خوش اسلوبی اور تن دہی سے اپنے فرائض انجام دیتا آرہا تھا۔اب وہ خود ذہنی طور پر یہ بات تسلیم کر چکا تھا کہ اس نے بھارت کی ملٹری انٹیلی جنس میں نوکری کر لی ہے اور وہ قانونی اور اخلاقی طور پر اب اپنے افسران کے ہر حکم کا پابند ہے کیونکہ وہ ان سے باقاعدہ

تنخواہ ہی وصول نہیں کر رہا بلکہ اس دوران عیاشیوں کے مزے بھی لوٹ رہا تھا۔

اس نے پاکستان میں دھماکہ کرنے، تباہی پھیلانے اور بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی کے مکروہ مقاصد پورے کرنے کا وعدہ کرلیا تھا اور اس میں جبر نہیں اس کی مرضی شامل تھی......

''را'' کا یہی کمال تھا۔

وہ اپنے ایجنٹوں کو شراب و شباب کے ایسے شکنجے میں کستے تھے کہ وہ پھر کبھی نکل نہیں پاتا تھا اس کے ضمیر کو ایسی گہری نیند سلا دیا جاتا تھا کہ پھر کوئی بہت بڑا حادثہ بھی اس کی بیداری کا باعث نہ بنے۔

✿......✿......✿

''تمہارے ویزوں کا بندوبست ہوگیا۔''

اس روز اسے ورما ملک نے یہ بتایا تھا۔

''شکریہ ملک صاحب...... میں تو بہت پریشان تھا۔''

انور نے بے ساختہ کہا۔

''اب تم پریشان ہونا چھوڑ دو...... جس کے پلے سے تم بندھ گئے ہو وہ اپنے لوگوں کو کبھی پریشان نہیں رہنے دیتے...... انور تم بڑے خوش قسمت ہو جو تمہارا انتخاب بھارتی انٹیلی جنس اور وہ بھی ملٹری انٹیلی جنس کے لیے ہوا ہے۔''

ورما ملک نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ تو ہے۔''

انور نے بھی شیخی سے گردن پھلا دی۔

واقعی اس کی تو دنیا ہی بدل گئی تھی۔

ہفتہ دس دن میں ایک آدھ مرتبہ اسے شراب اور شباب کی سہولت باآسانی میسر تھی اور مہینے کی بندھی تنخواہ الگ سے......

''انور میاں اصل میں تمہاری پاکستان روانگی ہی تمہارے مشن کا حصہ ہے۔''

ورما نے مطلب کی بات پر آتے ہوئے کہا۔

انور ذہنی طور پر اس کے لیے تیار تھا۔

''کیا کرنا ہوگا مجھے؟''

اس نے چھٹتے ہی دریافت کیا۔

''زیادہ کچھ نہیں...... اس بات کا خیال رہے کہ ایجنسی کے نزدیک تمہاری جان کی حفاظت اور قیمت سب سے زیادہ ہے اور وہ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھائیں گے جو تمہارے لئے نقصان کا باعث بنے۔''

ورما ملک نے چند لمحوں کے لیے رک کر سگریٹ سلگانے کے بہانے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں انور ان کے جال میں بری طرح پھنس چکا تھا اور وہ یہ کام بھی زبردستی سے نہیں بلکہ اپنی مرضی سے کرنے پر تیار دکھائی دیتا تھا۔

''تمہیں اپنا ساتھی اختر تو یاد ہوگا۔''

اس نے اچانک ہی اگلا سوال کر دیا۔

''ہاں وہی پاکستانی لڑکا۔''

انور نے چونک کر کہا۔

''ہاں وہی لیکن تمہارے لئے وہ غیر ملکی نہیں تم بھی پاکستانی ہی ہو۔ تمہیں اس شناخت کے ساتھ اس سے ملاقات کرنی ہے۔ تمہارا شناختی کارڈ تیار ہے جس کے مطابق تم پاکستانی شہر حیدرآباد کے رہنے والے ہو۔ تربیت کے مطابق وہ تم سے تمہارا ایڈریس بھی دریافت نہیں کرے گا نہ ہی تمہیں اس کی اجازت ہوگی۔ یہ کارڈ تمہیں احتیاطاً دیا جا رہا ہے...... بھگوان نہ کرے کبھی کوئی ایسی سچوایشن آجائے جس میں تمہیں کوئی شناخت دکھانی ہو تو تم محفوظ رہ سکو...... اختر سے تمہاری ملاقات کس جگہ ہوگی اس کے متعلق تمہیں آخری لمحات میں بتایا جائے گا۔ کچھ سامان تم ہوشیاری سے اپنے ساتھ لے جاؤ گے اپنے گھریلو سامان میں شامل کر کے۔ باقی کا بندوبست اختر وہاں کرلے گا...... اس کے بعد تم دونوں کو مل کر کم از کم تین دھماکے کرنے ہیں...... جن کی پلاننگ اور اوقات کا تعین تم خود کرو گے۔ اس بات کا دھیان رہے کہ اختر کو اس مشن میں تمہارے ماتحت کی حیثیت حاصل ہوگی لیکن وہ مقامی صورت حال کو چونکہ زیادہ بہتر سمجھتا ہے اس لئے تمہیں گائیڈ کرتا رہے گا صرف صورتحال سے متعلق۔ البتہ کام کیسے کرنا ہے اس کا فیصلہ تم کرو گے...... اختر کو اس کے حصے کی رقم پہنچا دی گئی ہے۔ تمہیں روانگی پر مطلوبہ رقم مل جائے گی...... گو کہ وہ سارے پیسے تمہارے ہی ہوں گے لیکن پھر بھی میری درخواست ہوگی کہ انہیں دھیان سے استعمال کرنا۔''

ورما ملک نے اسے سب کچھ بریف کر دیا۔

"ٹھیک ہے ملک صاحب ایسا ہی ہوگا۔"

انور نے بظاہر تو بڑے جوش سے اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

لیکن......

دل ہی دل میں وہ سہم کر رہ گیا تھا۔

دوران تربیت اسے پاکستانی انٹیلی جنس ایجنسی آئی ایس آئی سے متعلق جو کچھ بتایا گیا تھا اس بریفنگ نے انور کے لاشعور میں پاکستانی انٹیلی جنس سے متعلق قدرے خوف بٹھا دیا تھا۔

اور......

وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ ان لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر یہ کام کرنا کچھ آسان نہیں ہے۔

⁂

ترلوک پوری کے الن میاں کے انور کی والدہ سے پاکستانی سفارت خانے کے باہر ملاقات، ان کے لیے ویزوں کا حصول اور ان سے رشوت کی رقم طلب کرنا سارا "را" کا تیار کردہ ڈرامہ تھا۔

شکلا کو اپنے ساتھیوں پر بھی برتری حاصل تھی کہ وہ اپنا "ہوم ورک" مکمل رکھتا تھا۔

اس نے کبھی معمولی سے امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا اور اپنے کسی بھی ایجنٹ کو سرحد عبور کروانے سے پہلے ہی مشن کو ابتدا ہی سے تمام اہتمام ملحوظ خاطر رکھتا تھا۔ اگر وہ ویزوں کے حصول کے لیے کوئی ڈرامہ نہ بھی رچاتے تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

لیکن......

شکلا نہیں چاہتا تھا کہ انور کی والدہ یا خاندان کے کسی فرد کو معمولی سا شبہ بھی گزرے اور وہ کچھ اور سوچنے لگیں۔

انہوں نے ویزوں کی حصولی سے سرحد عبور کرنے تک ایک لمحے کے لیے بھی انور کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ اس کے سامان کی بکنگ تک اپنے سامنے کروائی تھی اور مکمل اطمینان کر لیا تھا کہ سامان بہت چیکنگ کے بعد بھی مشکوک نہ ٹھہرے دہلی سے واہگہ تک وہ سائے کی طرح انور سے چپکے رہے تھے۔

لیکن......

اس دوران کوئی غیر معمولی حرکت نہیں ہوئی تھی۔

انہوں نے معمول کے تمام مراحل انور کے گھر والوں کو طے کروائے تھے۔ ان کی دوسرے مسافروں کی طرح مکمل تلاشی ہوئی تھی۔

انہوں نے دوسرے مسافروں کی طرح سامان کی تلاشی لینے والوں کو رشوت بھی دی تھی تاکہ تمام "رسومات" ادا کر سکیں۔

عین آخری لمحات پر انور کی نظر مسٹر سنگھ پر پڑی تھی جو ایک قلی کے روپ میں اسے ایک کونے میں کھڑا دکھائی دیا۔

اس نے انور کو آنکھ کے اشارے سے دوسری طرف بلایا تھا۔

انور والدہ سے باتھ روم تک جانے کا بہانہ کر کے اس طرف گیا اور مسٹر سنگھ کے تعاقب میں چلتا ریلوے سٹیشن کے ایک کونے میں چھوٹے سے اس کمرے میں گھس گیا جس کے باہر ایک سپاہی کھڑا پہرا دے رہا تھا۔

کمرے میں ورما ملک بھی موجود تھا جس نے بڑی گرم جوشی سے انور سے مصافحہ کیا اور اس کی خیریت دریافت کی۔

مسٹر سنگھ نے آخری لمحات میں پاکستانی کرنسی میں ہزار ہزار کے بیس نوٹ تھمائے تھے اور بغل گیر ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"انہیں احتیاط سے اپنے کپڑوں میں چھپا لو...... تمہاری تلاشی تو نہیں ہوگی لیکن ادھر سرحد کے پار جہاں بھی سامان چیکنگ کا مرحلہ آیا یہاں والا معاملہ ہی چلے گا۔ تمہارا سامان اٹھانے والا قلی خود ہی تم سے "مدد" کے لیے پوچھے گا۔ اسے یہی بتانا کہ تمہارے پاس گھریلو سامان اور کچھ تحفے تحائف ہیں وہ ہزار دو ہزار روپے میں معاملہ طے کروا دے گا اور تمہیں سامان کو چھونے کی بھی نوبت نہیں آئے گی...... خیال رکھنا کہ کسی لالچ میں آکر پیسے بچانے کے چکر میں نہیں پڑنا تمہارا انعام واپسی پر مل جائیگا۔ عین ممکن ہے ہم تمہیں وہاں تمہارے ٹھکانے پر تمہارے انعام کا کچھ حصہ پہنچا دیں۔ اگر تم پیسے بچانے کے چکر میں پڑ گئے تو مارے جاؤ گے...... یاد رکھنا پیسہ بہت ضروری ہے لیکن اپنی جان کی حفاظت اس سے بھی زیادہ...... اس دیش میں تم رشوت سے ناقابل یقین کامیابی حاصل کر سکتے ہو کیونکہ پیسہ ان کی بھی کمزوری بن چکا ہے......"

اس کے بعد انہوں نے ایک چھوٹی سی پرچی پر لکھا ایک ایڈریس اسے تھما دیا۔

''یہ ہے وہ ایڈریس جہاں آج سے ٹھیک پانچویں روز 4:00 اور 5:00 بجے کے درمیان اختر تمہارے ساتھ ملے گا...... اگر پہلے روز ملاقات ممکن نہ ہوئی تو دوسرے اور پھر تیسرے روز تک تم وہاں جاتے رہو گے...... محفوظ ملاقات کا طریقہ تمہیں بتا دیا گیا ہے۔ اس پر عمل کرنا۔ یاد رکھنا چند لمحوں کی غفلت بسا اوقات انسان کو لے ڈوبتی ہے اور چند لمحوں کی ہوشیاری سے بسا اوقات وہ موت کے منہ سے بھی بچ نکلتا ہے...... اس ایڈریس کو اچھی طرح ذہن نشین کرلو جس کے بعد یہ پرچی راستے میں پھاڑ کر ضائع کر دینا...... اگر تین روز تک اختر سے ملاقات نہ ہو سکے تو تمہیں جو انٹرنیشنل فون نمبر دیا گیا ہے وہاں فون کر کے اطلاع کر دینا انہی الفاظ میں جو تمہیں سمجھائے گئے ہیں...... جس کے بعد متبادل بندوبست کر کے تمہیں مطلع کر دیا جائے گا۔ یہ بات کبھی نہ بھولنا کہ تم جہاں بھی ہو گے ہماری نظروں کے حصار میں رہو گے وہاں تم اکیلے نہیں۔ تم جیسے درجنوں ہمارے ایجنٹ کام کر رہے ہیں اور آخری بات یہ کہ اپنے دشمن کو کبھی کمزور سمجھنے کی غلطی نہ کرنا۔ وش یو گڈ لک (Wish You Good Luck)

اس نے انور کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر گویا اسے روانگی کا سگنل دیا۔

''جے ہند۔''

دونوں نے کہا۔

اور...... وہ باہر آ گیا جہاں اس کی والدہ اور بہن اس کے منتظر تھے۔

۞......۞......۞

اسے تو یہی امید تھی کہ اپنے پاس موجود رقم کا نصف ادا کرنے کے بعد ان کا سامان پاکستان میں کلیئر ہو گا۔

لیکن......

وہاں اس کے کزن اقبال نے پہلے ہی سے انتظامات کر رکھے تھے اور وہ لوگ ایک پائی ادا کئے بغیر بخیر و عافیت باہر آ گئے۔

گھر پہنچنے پر انور نے اپنا بیگ جسے اس نے تالا لگا رکھا تھا اپنے قبضے میں رکھا اور پھر باقی سامان سے الگ کر کے اس کمرے میں لے آیا جہاں اس کے لئے بستر لگائے گئے تھے۔

پہلے ہی مرحلے پر اتنی آسانی سے کلیئر ہو جانے کے احساس نے اسے بڑی طمانیت

بخشی تھی اور وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ ریلوے سٹیشن پر ٹرین رکنے کے بعد تو اسے ایسا لگا تھا جیسے وہ راہ گم کردہ مچھلی کی طرح کسی جال میں پھنس گیا ہو اس کی تربیت یافتہ آنکھوں نے وہاں موجود درجنوں ایسے چہرے دیکھ لئے تھے جن کے متعلق اسے بتلایا گیا تھا کہ یہ کون ہو سکتے ہیں۔

بلاشبہ یہاں چپے چپے پر سکیورٹی ایجنسیوں کا جال بچھا ہوا تھا۔

لیکن......

ان کی طرف تو کسی نے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ جب کہ اسے یہ بتایا گیا تھا کہ سٹیشن سے گھر تک وہ کسی بھی مرحلے پر بار بار چیک ہو سکتا ہے جبکہ یہاں وہ بڑے اطمینان سے گھر تک پہنچ گئے تھے۔

اسے یقین ہو چکا تھا کہ باقی تمام مراحل بھی اس طرح آسانی سے طے ہو جائیں گے۔

اور......

وہ لمبی تان کر سو رہا۔

دو روز بعد اسے اختر سے ملنے جانا تھا۔

یہ دو روز اس نے گھومنے پھرنے اور علاقے کو سمجھنے میں گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔

۞......۞......۞

نرمل سنگھ

اختر کا تعلق پاکستان کے ایک سرحدی علاقے سے تھا۔

اس کے باپ دادا سمگلنگ کے دھندے سے وابستہ تھے۔ سرحدی گاؤں کا مکین ہونے کے ناطے اسے یوں تو بچپن ہی سے مجرمانہ ماحول دیکھنے کو ملا تھا لیکن باپ دادا کے جرائم پیشہ ہونے کی وجہ سے وہ ضرورت سے زیادہ ہی اس دھندے میں ذہنی طور پر بھی ملوث ہو چکا تھا۔ بچپن ہی سے وہ دیکھتا آرہا تھا کہ مہینے میں ایک دو مرتبہ اس کے گھر پر کبھی رینجرز اور کبھی کوئی دوسری سرکاری ایجنسی کے اہلکار ریڈ کرتے رہتے تھے۔

اس کے تمام چچا اس دھندے سے وابستہ تھے۔

شاید ہی سال میں کوئی ایسا دن ہوتا جب وہ ایک جگہ اکٹھے ہوں ورنہ تو ان میں سے ایک جیل میں دوسرا باہر اور پھر دوسرا جیل میں پہلا باہر ہوا کرتے تھے۔ اختر کم عمری میں اس ماحول کا عادی ہو گیا تھا۔

اس نے میٹرک تک تعلیم کیسے حاصل کی؟

اس سوال کا جواب خود اسے کبھی نہ مل سکا۔

اسے تو اتنا یاد تھا کہ میٹرک کرنے کے بمشکل پندرہ بیس روز بعد وہ اپنے ایک چچا کے ساتھ سرحد عبور کر رہا تھا۔ ان لوگوں نے کچھ مال بھارت پہنچانا تھا اور پھر وہاں سے کچھ مال لے کر پاکستان آنا تھا۔

پہلی چوری اور پہلا شکنجہ کے مصداق۔ مال واپس لاتے ہوئے وہ پاکستان رینجرز کی ایک گشتی پارٹی کی نظروں میں آگئے۔ جنہوں نے دونوں کو للکارا اور رک جانے کا حکم دیا۔

لیکن......

اختر رکا نہیں......

اس کو پہلے ہی سے علم تھا کہ کیا کرنا ہے۔ اس کے چچا نے ''ہالٹ'' کی آواز سنتے ہی ہاتھ میں پکڑے دستی بم کی پن اتاری اور اسے آواز کی سمت اچھال دیا۔ جس کے ساتھ ہی زوردار دھماکہ ہوا۔

اس دھماکے کا کیا نتیجہ نکلا؟

فی الوقت تو اسے علم نہ ہو سکا۔

لیکن......

اگلے روز علم ہوا کہ رینجرز کے دو جوان شدید زخمی ہو گئے تھے۔ باقیوں نے ان کی طرف فائرنگ کی تھی لیکن اختر اور اس کا چچا دونوں بخیر و عافیت اپنے ٹھکانے تک پہنچ گئے۔

رینجرز نے ان کے گھروں پر ''ریڈ'' کیا تھا۔ جہاں سوائے مال مویشی اور عورتوں کے کچھ نہیں تھا۔ کیونکہ وہ دونوں گھر کے بجائے پہلے سے طے شدہ ٹھکانے کی طرف گئے تھے وہاں ان کے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

اختر ایک ماہ غائب رہا۔

ان کے اس ملک میں درجنوں ٹھکانے تھے۔ نزدیک دور کے شہر میں بے شمار جرائم پیشہ لوگ اس کے خاندان کے فرد کی طرح تھے۔ یہ لوگ وقت آنے پر ایک دوسرے کے لیے ڈھال بن جایا کرتے تھے۔

انہوں نے شیرو کے بیٹے اختر کو سنبھال لیا۔

اختر کے چچا نے پندرہ بیس روز بعد گرفتاری دے دی تھی۔ اس سے کچھ برآمدگی تو ہوئی نہیں تھی۔ تفتیش میں ایجنسیوں نے اس کے جسم سے کھال الگ کر دی۔

لیکن......

کیا مجال جو اس نے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا ہو۔

دو ماہ تک مختلف تفتیش بھگتنے کے بعد بھی وہ اس بات پر قائم تھا کہ اس نے رینجرز پر حملہ نہیں کیا اور رینجرز والے غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔

اس سوال کے جواب میں کہ وہ پھر گھر سے غائب کیوں ہوا؟

اس نے کہا تھا کہ رینجرز کے خوف سے وہ بھاگ گیا تھا۔ کیونکہ اسے شک تھا کہ یہ لوگ اپنے ساتھیوں کے زخمی ہونے پر غصے میں آکر کہیں اس کو گولی نہ مار دیں۔ گو کہ تفتیشی ایجنسیوں کو اس پر شک تھا کہ یہ واردات اسی نے کی ہے لیکن ان کے لیے اسے جیل بھیجنے کے

سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کیونکہ کسی انسان پر اتنا ہی تشدد کیا جا سکتا ہے جتنا اس پر ہو چکا تھا۔

جیل جانے کے دوسرے روز اس کی ضمانت ہوگئی اور ضمانت کے چند روز بعد اختر کو انہوں نے گھر بلا لیا۔

اس درمیان اختر دسویں جماعت کا امتحان دے چکا تھا۔

اس نے گاؤں کے نزدیکی سکول میں پیسے دے کر اپنا سنٹر بنوایا تھا اور وہاں کتابیں سامنے رکھ کر امتحان پاس کیا تھا۔

وہاں کس کی مجال تھی جو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔

اٹھارہ سال کی عمر میں وہ اپنی عمر سے دوگناہ زیادہ جوان لگتا تھا۔ اس درمیان اس نے اپنی خاندانی روایات کے مطابق تمام شرعی عیب اپنا لئے تھے اور اپنے چچا کے ساتھ متعدد مرتبہ سرحد پار سے بھی ہو آیا تھا۔

ان کے ڈیرے پر سرحد پار سمگلروں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔

یہ لوگ اپنے ساتھ شراب ضرور لے کر آتے تھے جو ان کی روانگی کے کافی عرصہ بعد تک اختر کے گھر والوں کے تصرف میں رہتی تھی۔

اختر اوائل عمری ہی سے اپنے خاندانی رنگ میں رنگ چکا تھا۔ اپنے ہم پیشہ کی طرح شراب اور عورت اس کی کمزوری بن چکی تھی۔

لیکن......

یہاں اس ملک میں اسے کھیل کھیلنے کا موقعہ نہیں ملتا تھا۔

یہاں سب کچھ چھپ چھپ کر کرنا پڑتا تھا اور ہر لمحہ دھڑکا لگا رہتا تھا۔ اختر کو اس کے چچا نے سرحد پار کی دنیا کی ایسی ایسی کہانیاں سنائی تھیں جنہیں سن کر اسے انگریزی فلمیں یاد آنے لگتی تھیں۔

اس کی خواہش تھی کہ جتنی جلد ممکن ہو وہ سرحد پار جائے اور اس دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھے۔

لیکن......

اس کا باپ ہمیشہ اس کے سرحد عبور کرنے میں آڑے آتا۔ اختر اس کی اکلوتی اولاد تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اختر سرحد عبور کرے۔ وہ اسے سرحدی کلیر تک اپنے ساتھ لے جاتا جہاں سے وہ لوگ دوسری طرف کے سمگلروں سے مال کے بدلے مال کا تبادلہ کرلیا کرتے تھے۔

عموماً یہی ہوتا کہ دونوں طرف کی پارٹیاں اپنی سائیڈ پر "ناکہ بھرتیں" اور اپنی سائیڈ محفوظ کر لیتیں۔

اختر کے باپ نے کوشش تو بہت کی لیکن ایک روز اختر اپنے چچا کے ساتھ زبردستی سرحد عبور کر ہی گیا جس کے بعد یہ سلسلہ شروع ہوگیا۔

پہلے ہی پھیرے پر دوسری طرف ان کے ساتھیوں نے جگے سمگلر کے بیٹے اختر کے اعزاز میں خصوصی پارٹی دی اور شہر سے اس کے لیے خاص قسم کی عورت منگوائی تھی۔ اختر کو انہوں نے پہلے ہی چکر میں اس بات کا یقین دلا دیا کہ واقعی یہ دنیا الف لیلوی دنیا ہے جہاں اس کے لیے شراب وشباب کی ساری لذتیں موجود ہیں۔

✡......✡......✡

نرمل سنگھ سے اس کی ملاقات "معمول کی ملاقات" ہی تھی۔

لیکن......

اختر کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ نرمل سنگھ سمگلر کے روپ میں دراصل "را" کا ایجنٹ ہے۔ جسے سمگلر کے کور Cover میں اس جیسے گدھوں کو پھانسنے کے لیے پاکستان میں داخل کیا گیا تھا۔

نرمل سنگھ کی نظر انتخاب بھی اس پر ٹھہری تھی۔

اس نے جان لیا تھا کہ اختر کو ہر بری علت ہے اور اس ملک میں اسے کم از کم وہ ذرائع میسر نہیں جو "را" بھارت میں فراہم کر سکتی تھی۔ اسے اختر کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھانا تھا۔

اختر اب اپنے بزنس میں خاصا "ان" ہو چکا تھا۔

اس کی عمر بیس سال ہو رہی تھی اور اس کے اپنے اخراجات اس کے والد اور چچا سے زیادہ ہو رہے تھے۔ عیاشی اور بدمعاشی میں وہ اپنے باپ سے دو ہاتھ آگے نکل گیا تھا۔

یوں بھی اس عمر میں وہ لوگ اپنا بزنس الگ کرلیا کرتے تھے......!!

اختر کے ساتھ نرمل سنگھ کی یہ دوسری ملاقات تھی۔ عموماً وہ خود سرحد پار کیا کرتا تھا لیکن اب دوسری طرف اتنی زیادہ سختی ہوگئی تھی کہ اختر نے سرحد عبور کرنے کا خطرہ مول لینا مناسب نہ سمجھا حالانکہ اس کی ایک پے منٹ بھی دوسری طرف پھنسی ہوئی تھی۔ اپنی طرف سرحد کی اسے پرواہ نہیں تھی۔ اس کا بندوبست اس نے کیا ہوا تھا۔

"اس مرتبہ تو تمہارا یہاں پہنچنا معجزہ دکھائی دیتا ہے۔ اس طرف سے بڑی غلط

خبریں آ رہی ہیں اور میں تو کم از کم ان حالات میں سرحد عبور کرنے کا تصور نہیں کر سکتا۔" اختر نے عندیہ ظاہر کیا۔

"یار اختر ہمارے لئے تو یہ کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ میں نے اس کا آسان سا حل سوچ لیا ہے۔"

نرل سنگھ نے معنی خیز مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی۔

"کیا مطلب...... کیا حل سوچا ہے۔"

اختر نے بے چینی سے اس کی طرف جھکتے ہوئے پوچھا۔

"یار اختر اپنی ادھر سکیورٹی والوں سے بات ہو گئی ہے۔ ان کے ایک آدھ بندے کو بارڈر پار کروا دیا اور کبھی ادھر سے کسی کو لے گئے بس واہے گورو کی کرپا سے سارے راستے کھل گئے ہیں۔ ان لوگوں سے دوستی کا بہت فائدہ ہے۔ اب تو شاید ہی تمہاری طرف کوئی ایسی پارٹی ہو گی جس نے ان سے ہاتھ نہ ملایا ہو۔ یہ کالونی کے ملاح اس لئے تو راتوں رات کروڑ پتی بن گئے ہیں کہ انہوں نے ادھر ہاتھ ملایا ہوا ہے...... میں تو کہتا ہوں تو بھی اپنی لائن سیدھی کر لے۔ اگر تیری ادھر کسی سے سر ہو جائے تو اپنا مال سیدھا شہر پہنچ سکتا۔ جس مال کی قیمت ادھر پانچ سو روپے ہے وہ دلی میں ایک ہزار میں لیا جائے گا۔"

نرل سنگھ نے اسے شیشے میں اتارتے ہوئے کہا۔

"یار بات تو تیری ٹھیک ہے۔"

مچھلی نے جال میں پھنسنے کے لیے پر تول لئے تھے۔

"اختر خاں ادھر دلی میں بڑی موج مستی ہے۔ ایسی ایسی لڑکیاں کہ......"

اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر بے ہودہ سے اشارے سے بات مکمل کی۔

نرل سنگھ نے بمشکل دس منٹ لگائے تھے کہ اختر رام ہو گیا۔ اب وہ پوری طرح اس کے جال میں پھنس چکا تھا اور اس کے بچ نکلنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ اختر نے اس کے ساتھ اگلے ہی روز سرحد عبور کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اسے اپنے مال کی فروخت سے زیادہ دلی کے ان کلبوں میں ناچنے والی لڑکیوں اور شراب سے دلچسپی تھی جس کا ذکر نرل سنگھ نے کیا تھا۔

✡......✡......✡

اور......

اگلے روز دونوں نے آسانی سے پاکستانی سرحد عبور کرلی۔

بھارتی سرحد میں داخل ہوتے ہی خاردار تاروں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ وہ خاردار تار تھے جو بھارتیوں نے حال ہی میں عالمی قوانین کو بھاڑ میں جھونک کر پاکستانی سرحد کے ساتھ ساتھ لگائے تھے۔

دس بارہ فٹ بلند ان خاردار تاروں کو دن کے کسی پہر میں بھی عبور کرنا بظاہر ناممکن تھا۔ رات کو تو صورتحال اور ہی خطرناک ہو جاتی تھی۔

شام ڈھلنے سے پہلے ہی ان کے اندر نصب طاقتور سرچ لائٹس روشن ہو جاتی تھیں جن سے پاکستانی سرحد میں میلوں دور تک کا علاقہ دن کی روشنی کی طرح صاف دکھائی دینے لگتا تھا جس کے ساتھ یہ ان تاروں میں برقی رو دوڑا دی جاتی تھی جس کے بعد تو یہاں سوائے موت کے اور کچھ سجھائی ہی نہیں دیتا تھا۔

اختر اور اس جیسے دوسرے سمگلروں نے سرحد پر کچھ ایسے مقامات ڈھونڈ رکھے تھے جہاں ابھی تک ان لوگوں نے خاردار تاروں کی دیواریں کھڑی نہیں کی تھی یا پھر دوسری طرف سے بھارتی "ناکہ بھرنے" کے بعد ان کے سرحد پر آ کر اپنے مال کا تبادلہ کرلیا کرتے تھے۔

لیکن......

نرل سنگھ نے بڑا عجیب طریقہ اپنایا تھا۔

وہ اختر کے ساتھ بھارتی سرحد میں داخل ہونے کے بعد ایک لمبا چکر کاٹنے کے بعد درختوں کے گھنے جھرمٹ سے گزرتا ہوا پہلے سے طے شدہ ایک جگہ پہنچا جہاں اس نے لوہے کے ان تاروں سے بنے ایک گیٹ کو زور زور سے بجانا شروع کیا۔

بمشکل ایک منٹ بعد انہیں ٹارچ کی روشنی اپنے چہرے پر پڑنے کا احساس ہوا۔ دونوں طرف سے روشنی ان پر پھینکی جا رہی تھی۔

اختر نے نرل کی تقلید میں دوسری طرف سے "ہینڈز اپ" کا حکم ملنے پر ہاتھ کھڑے کر دیئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی تاروں کے نصب گیٹ کھلنے کی آواز آئی اور دونوں اندر داخل ہو گئے۔ "ہینڈز اپ" کے حکم پر ہاتھ کھڑے کرتے ہوئے اختر نے اپنے ہاتھ میں پکڑا تھیلا زمین پر رکھ دیا تھا۔

بی ایس ایف (بارڈر سکیورٹی فورس) کے ایک جوان نے نزدیک آ کر اختر اور نرل دونوں کے جسموں کو ٹٹول کر اندازہ لگایا کہ کہیں انکے پاس آتشیں اسلحہ تو نہیں ہے۔ مطمئن ہونے پر انہیں ہاتھ گرانے کا حکم ملا اور ان کے تھیلے بھی بغیر تلاشی کے انہیں سونپ دیئے گئے۔

اختر جو اس صورت حال سے قدرے گھبرا گیا تھا اب سنبھل گیا۔

''یار اختر خاں برا نہ منانا...... یہ ان لوگوں کی نارمل پریکٹس ہے۔ اب ہمارے لئے ''ستے خیراں'' ہیں...... اب کوئی تمہاری طرف آنکھ بھر کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔''

نرمل سنگھ نے ابھی تک وہاں موجود بی ایس ایف کے تینوں جوانوں سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

لیکن......

اختر نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ اسے پہلے ہی سے جانتے ہیں ورنہ اس طرح ایسی خاموشی سے جانے نہ دیتے۔

''پوسٹ پر چلو۔ مجھے فوراً ورما صاحب سے رابطہ کرنا ہے۔''

نرمل نے ان سے کہا۔

اور......

وہ تینوں ان کے آگے آگے چلنے لگے۔

ابھی تک انہوں نے نرمل سنگھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اختر کا نام تک دریافت نہیں کیا تھا۔ نرمل سنگھ نے اسے روانگی سے پہلے سمجھا دیا تھا کہ اگر بی ایس ایف والے اس سے اس کا نام دریافت کریں تو انہیں اپنا نام غلط بتائے۔ اب تک وہ یہی تاثر دینا چاہتا تھا کہ وہ اختر کے معاملے میں بڑا محتاط ہے۔

دونوں کو وہ پوسٹ پر لے آئے۔

یہاں ایک چھوٹے سے کمرے میں انہیں بٹھا دیا گیا۔

''مہاراج کوئی چائے پانی......''

ان میں سے ایک نے پوچھا۔

''ٹھیک ہے چائے لے آؤ''

نرمل سنگھ نے جواب دیا۔

تینوں وہاں سے چلے گئے۔

''یار ذرا کمر سیدھی کر لیں۔''

یہ کہتے ہوئے نرمل سنگھ بڑے اطمینان سے وہاں موجود دو چارپائیوں میں سے ایک پر لیٹ گیا اور اس نے اختر کو دوسری چارپائی پر لیٹنے کا اشارہ کیا تھا۔

ابھی تک اختر مطمئن نہیں تھا۔ اس پر قدرے گھبراہٹ طاری تھی۔

لیکن......

اس کی چھٹی حس نے یہ ضرور سمجھا دیا تھا کہ نرمل سنگھ نے اس کے ساتھ کوئی چکر نہیں چلایا نہ ہی اس نے پھنسانے کی کوئی سازش کی ہے۔

اس نے چارپائی پر لیٹنے کے بجائے سگریٹ سلگا لیا اور نرمل سنگھ سے باتیں کرنے لگا۔

بمشکل تین چار منٹ بعد ہی کسی نے دروازے پر دستک دے کر شاید اندر آنے کی اجازت طلب کی تھی۔

اور......

اگلے ہی لمحے ان کے سامنے مقامی پوسٹ کمانڈر کھڑا تھا۔

''سناؤ بھئی نرمل سیہاں کیا حال ہے۔''

اس نے بڑی بے تکلفی سے نرمل سنگھ سے مصافحہ اور معانقہ کیا پھر اختر کی طرف متوجہ ہوا جس نے اسے دیکھ کر اپنی سگریٹ ایک طرف رکھ دی تھی۔

''اپنا سجن ہے...... میرا یار ہے۔ ذرا دہلی کی سیر کروانے لایا ہوں۔''

''کیا حال ہے میاں جی۔''

یہ کہہ کر پوسٹ کمانڈر بھٹی نے اس سے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

اور......

تھوڑی دیر بعد وہ اختر سے بڑی بے تکلفی سے باتیں کر رہا تھا۔ اختر کو اس نے قطعی اجنبیت کا احساس نہ ہونے دیا۔

اس نے چند منٹ ہی میں اختر کی اچھی خاصی برین واشنگ کر دی تھی۔ کیونکہ اس سے پہلے اختر نے پاکستانی علاقے میں بھی اکثر ''ناکے'' بھرے تھے۔

لیکن......

وہ لوگ ان سے رقم وصول کرنے کے بعد بھی کتوں سے بدتر سلوک کرتے تھے یا کم از کم انہیں ایسی عزت کبھی نہیں مل سکتی تھی جیسی یہاں مفت میں مل رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہاں اختر کے لیے بڑی بے تکلف چائے آ گئی۔

''میاں جی معاف کرنا مہاراج...... آپ کی اس وقت زیادہ سیوا نہیں کر سکے۔ اگر کبھی پھر موقعہ ملا تو کسر نکال دیں گے۔''

اس نے اختر سے کہا۔

اور......

اختر نے بیوقوفوں کی طرح دانت نکال کر اس کا شکریہ ادا کیا۔

چائے کے دوران بھی وہ اختر سے ایسے باتیں کرتا رہا جیسے اختر ہی اس کا افسر ہو قریباً آدھا گھنٹہ وہ ان کے ساتھ رہا۔

''نرمل سیہاں یارشا کرنا۔ مجھے ڈیوٹی کرنی ہے۔ تم لوگ آرام کرلو۔ تمہیں ورما صاحب کے پاس پہنچا دیں گے۔ یا جیسے تم کہو۔''

اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے صبح ہی چلیں گے۔''

نرمل سنگھ نے کہا۔

''ہماری طرف سے میاں صاحب کے لیے یہ تحفہ حاضر ہے۔ اگلی ملاقات پر اور سیوا کریں گے۔''

یہ کہہ کر اس نے ''رم'' کی ایک بوتل ایک کونے میں دھرے ٹرنک سے نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔

اختر نے ندیدے بچوں کی طرح بوتل تھام لی۔

یہ واقعی بڑا شاندار تحفہ تھا۔ بھارتی فوج میں سپلائی کی جانے والی یہ رم بازار میں مہنگے داموں ملتی تھی۔

پوسٹ کمانڈر بھٹی چلا گیا۔

اختر نرمل کے ساتھ ہی چارپائی پر لیٹ گیا اور اب وہ بالکل مطمئن ہو کر گہری نیند سو رہا تھا۔

✡......✡......✡

صبح دیر گئے تک وہ لمبی تان کر سوتا رہا۔

اسے نرمل سنگھ نے گہری نیند سے بیدار کیا تو سورج سر پر چڑھ آیا تھا اور پوسٹ بھی اب خاصی آباد دکھائی دے رہی تھی۔

اختر کو ان لوگوں نے پوسٹ پر ہی جوانوں کے لیے موجود سہولیات بہم پہنچائیں اور تھوڑی دیر بعد وہ نرمل سنگھ کے ساتھ تازہ گرم حلوہ پوری کا ناشتہ کر رہا تھا جس کے بعد ان کے

لیے چائے کے گلاس آ گئے۔ اس دوران پوسٹ کمانڈر نے جو ابھی تک جاگ رہا تھا۔ انہیں کسی ورما صاحب کی آمد کی اطلاع دیتے ہوئے کہا۔

''وہ خود ہی آپ کو لینے آ گئے ہیں۔''

اور......

تھوڑی دیر بعد ورما ملک ان کے سامنے موجود تھا۔

نرمل سنگھ نے اس کا تعارف اختر سے کرایا تو ورما ملک نے بڑی گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اسے خوش آمدید کہا۔

نرمل سنگھ نے اختر کو پہلے ہی سے سمجھا دیا تھا کہ اسے کیا کرنے کے لیے یہاں لایا گیا ہے۔ انہوں نے جس فراخدلی سے اختر کا استقبال کیا تھا اس نے اختر کی اچھی خاصی برین واشنگ کر ڈالی تھی۔

ورما ملک دونوں کو ان کے سامان سمیت اپنی جیپ میں لے کر شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے اختر یا نرمل سنگھ سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ ان کے تھیلوں میں کیا ہے اور یہی اختر چاہتا تھا۔

اس کا دل یہ سوچ کر بلیوں اچھلنے لگا کہ اب وہ اطمینان سے مال پارٹی تک پہنچا کر اپنا دھندہ کرتا رہے گا۔

ورما ملک کے ساتھ وہ لوگ مضافاتی علاقے کے ایک ریسٹ ہاؤس میں آ گئے تھے جہاں اختر کی رہائش کا خصوصی بندوبست کیا گیا تھا۔ یہ ''را'' کا مقامی سیف ہاؤس بھی تھا۔

اختر کو یہاں آنے پر سب سے پہلے بھارت کی وسکی پیش کی گئی تھی جس کے لئے وہ باؤلا ہوا جاتا تھا۔ جس کے بعد نرمل سنگھ اور اختر کو ایک جیپ ڈرائیور سمیت دے دی گئی۔

''تم لوگ اپنے کام مکمل کرلو...... اختر صاحب کو سیر وغیرہ کرواؤ پھر شام کو ملتے ہیں۔''

ورما ملک نے بڑی فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

''ٹھیک ہے مہاراج شام کو ملتے ہیں۔ اپنے چوہدری صاحب کو ذرا دلی کی سیر بھی کروانی ہے۔'' نرمل سنگھ نے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔

''ارے نو پرابلم یار...... جیسے تم کہو...... ہم اپنے مہمانوں اور دوستوں کی ہر خواہش کا احترام کرتے ہیں۔''

ورما ملک نے اس کی طرف گھومتے ہوئے آنکھ دبا کر زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

جواب میں اختر بھی بے شرمی سے مسکرا دیا۔

دونوں باہر کھڑی جیپ میں آکر بیٹھ گئے۔

”کیوں چوہدری میں کیا کہتا تھا...... کچھ سمجھ آئی۔“

نرمل سنگھ نے جیپ میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

”یار نرمل سیہاں واقعی تو نے تو کمال کر دیا۔“

اختر نے خوشی سے پھولے نہ سماتے ہوئے کہا۔

”ابھی آگے آگے دیکھو...... چوہدری اختر بس ان کے کام آتے رہنا۔ یہ بڑے کام کے بندے ہیں۔ دنوں میں تم کروڑ پتی بن جاؤ گے کروڑ پتی...... سمجھے میری بات۔“

نرمل سنگھ نے اس کی حرص کو مزید بڑھاوا دیا۔

”بس یار دلی ضرور دکھانا اور وہ سالے نائٹ کلب۔“

”چوہدری اختر تو دیکھتا جا...... ابھی تو نے دیکھا ہی کیا ہے...... ارے تیرے کانوں کو ہاتھ نہ لگوا دیئے تو نرمل سنگھ نہ کہنا۔“

نرمل سنگھ نے کہا۔

اور......

اختر نے بے حیائی سے دانت نکال دیئے۔

دونوں اکٹھے ہی اس سرحدی گاؤں میں پہنچے تھے جہاں اس نے اپنی پارٹی کو مال دینا تھا۔

نرمل سنگھ نے جیپ گاؤں سے باہر ہی کھڑی کروا دی تھی اور اب دونوں اطمینان سے اختر کے بیوپاری سرون سنگھ سرپنچ کے ڈیرے کی طرف جا رہے تھے۔

سرون سنگھ اپنے کھیتوں میں ٹریکٹر چلا رہا تھا جب اس نے نرمل سنگھ کے ساتھ اختر کو آتے دیکھا پہلے تو وہ کچھ حیران ہوا پھر وہ خود ہی مطمئن ہو گیا۔ نرمل سنگھ نے اختر کو سمجھا دیا تھا کہ سرپنچ کو معاملے کی ہوا نہ لگنے دینا۔ دونوں نے گرم جوشی سے معانقہ کیا تھا۔

پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق اختر نے نرمل سنگھ کا تعارف کسی اور نام سے کروایا اور اس کا تعلق بھی ایک دور دراز کے سرحدی علاقے سے بتایا تھا۔

”یار سرون سیہاں ادھر تو راستہ بند ہی ہو چکا ہے...... بڑی مشکل سے اب ادھر کا راستہ کھولا ہے...... اب ہم اس طرف سے ہی کام کیا کریں گے۔“

اختر نے پیش بندی کے طور پر کہا۔

”چوہدری کام چلنا چاہیے...... ادھر سے کیا اور ادھر سے کیا۔“

سرپنچ سرون سنگھ کی باچھیں اختر کے ہاتھ میں پکڑے تھیلے کو دیکھ کر کھلنے لگی تھیں۔

اس نے چوہدری اختر اور اس کے نئے ساتھی کی خاصر مدارت کا سلسلہ شروع کر دیا۔

لیکن......

قریباً آدھ گھنٹے بعد ہی اختر نے اس سے اجازت طلب کر لی۔ اس نے سرون سنگھ کو بتایا کہ اسے آج رات ہی سرحد پار کرنی ہے اور یوں بھی اس علاقے میں جہاں ہر طرف بھارت کی سیکورٹی فورسز گھوم رہی ہیں اس کا زیادہ دیر قیام ٹھیک نہیں ہے۔

”میرا ایک کزن محکمہ ایکسائز میں کام کرتا ہے۔ اس کی جیپ پر ہی ہم آئے ہیں اور اسی پر واپس بھی جانا ہے۔ ہم نے دوپہر تک واپس آنے کا وعدہ کیا تھا...... پھر کبھی سہی ملاقات ضرور ہو گی......“

نرمل سنگھ نے سرپنچ سے کہا۔

سرون سنگھ نے بڑی ضد کی۔

لیکن......

پھر یہ سوچ کر کہ واقعی حالات خراب ہیں۔ چوہدری اختر کو مال کی نقد ادائیگی کر کے رخصت کر دیا۔

اختر کے فرشتوں کو بھی اس بات کا علم نہ ہو سکا کہ اس کی روانگی کے بمشکل پندرہ بیس منٹ بعد ہی سرپنچ سرون سنگھ کو بی ایس ایف والوں نے گرفتار کر لیا اور مار مار کر اس کا بھرکس نکالنے کے بعد اس سے وہ سارا مال برآمد کروا لیا جو اختر نے سپلائی کیا تھا۔

اسے یہاں اپنی گرفتاری سے متعلق جس کہانی کا علم ہوا اس کے بعد چوہدری اختر یا اس کے ساتھی پر شک کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی تھی۔

یہ سب کچھ ایک منصوبہ بندی کے تحت کیا جا رہا تھا۔

”را“ نے اختر کا خرچہ اس کے مال سے نکالنا تھا...... اور اس طرح اب وہ سرپنچ سرون سنگھ کو بھی رگڑا دینے میں کامیاب ہو گئے جو ایک عرصے سے ان کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔

۞......۞......۞

شباب اور......

اگلے روز ورما ملک اپنی گاڑی میں انہیں دہلی لے گیا۔

دہلی جا کر اس نے چوہدری اختر کو وہ کچھ دکھا اور کروا دیا جس کا چوہدری نے زندگی میں اس سے پہلے تصور ہی کیا تھا۔

اس نے پہلی ہی ملاقات میں اس کی دوستی آشا سے کروا دی تھی۔ وہ آشا جس نے اختر سے پہلے اس جیسے تین پاکستانیوں کو سنبھالا ہوا تھا۔ اپنی تربیت کے مطابق اس نے ہر ایک کو یہی باور کروا رکھا تھا کہ وہ اس کی دیوانی ہے اور اس کے لیے جان بھی دے سکتی ہے۔ ان تینوں گدھوں کو ایک دوسرے کا علم نہیں تھا۔ یہاں اس بات کی بطور خاص احتیاط کی جاتی تھی کہ ایک ہی ملک کے دو تخریب کاروں کو آپس میں بھی تعارف نہ ہونے پائے اور "را" انہیں الگ الگ مقامات پر تربیت دیا کرتی تھی۔

اختر کو بھی آشا کے حوالے کیا گیا تھا جس نے دو راتوں ہی میں اس کے کس بل نکال کر اسے سیدھا کر لیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی آگاہی بہم پہنچا دی تھی کہ اگر وہ ورما ملک کے اشاروں پر ناچتا رہا تو دنیا کی ہر موج مستی اسے ملے گی۔

اور......

آشا کو ہمیشہ کے لیے حاصل کر سکے گا۔

چار روز بعد چوہدری اختر جس طرح محفوظ طریقے سے بھارت میں داخل ہوا تھا اس طرح یہاں سے واپس پاکستان پہنچا دیا گیا۔

سرحد عبور کرنے سے پہلے اس کی ملاقات ورما ملک نے ایک بھارتی فوجی افسر سے کروائی جس نے اس کے سامنے ایک کتاب کھول کر رکھ دی اور اس میں موجود مختلف نشانات کی مدد سے اسے سمجھایا کہ پاکستانی فوج کے مختلف یونٹ کون سا نشان استعمال کرتے ہیں اور

ان سے کیا مراد ہے۔

اس کتاب میں پاکستانی فوج سے متعلق بہت سے نشانات موجود تھے۔ اختر نے ہونہار شاگرد کی طرح جلد ہی یہ علم بھی سیکھ لیا۔ اسے پہلی مرتبہ یہ مشن دے کر پاکستان واپس بھیجا گیا کہ وہ اپنے گاؤں اور اردگرد کے بیس پچیس دیہاتوں کے گرد موجود فوج کے تمام دستوں کا جائزہ لے کر آئے اور بطور خاص یہ بات نوٹ کرے کہ وہاں موجود فوجی گاڑیوں پر کس قسم کے نشانات بنائے گئے ہیں۔

اختر دل ہی دل میں ان لوگوں کی بیوقوفی پر ہنسنے لگا بھلا اس کے لیے یہ کوئی مشکل کام تھا۔ اس نے بھارتی فوج کے افسر کو یقین دہانی کروائی کہ وہ نہ صرف وہاں موجود فوجی دستوں کے نشانات دیکھے گا بلکہ اپنے کیمرے سے ان کی تصویریں بھی بنا کر لائے گا۔

اور......

چوہدری اختر نے جو کہا وہ کر کے دکھا دیا۔

اس نے واقعی بڑی آسانی سے وہاں موجود فوج کے مختلف دستوں کے زیر استعمال وہیکلز کی اپنے کیمرے سے تصویریں کھینچ لیں۔

یہ اس کے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

اس علاقے کے چپے چپے سے اسے آگاہی تھی اور اکثر دیہاتوں کے لوگ تو اسے ذاتی طور پر جانتے تھے۔ مختلف دیہاتوں میں مرغابی اور مچھلی کے شکار کے بہانے اس نے اپنے گھناؤنے مقاصد میں کامیابی حاصل کر لی۔

جب وہ پہلی مرتبہ اپنا کام مکمل کر کے دوسری طرف پہنچا اور اس نے اپنے کپڑے میں محفوظ کی ہوئی وہ کیمرے کی فلم متعلقہ فوجی افسر تک پہنچائی تو ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ایسا تابعدار اور لائق قسم کا ایجنٹ انہیں اس سے پہلے کب نصیب ہوا تھا۔

ورما ملک نے دو گھنٹے میں فلم کی ڈویلپنگ کروا کر اس کے فوٹو نکلوا لئے...... رزلٹ بڑا شاندار آیا تھا۔ اختر نے پاکستانی آرمی کے اس علاقے میں موجود مختلف وہیکلز کی تصویریں بڑی کامیابی اور مہارت سے اپنے کیمرے سے اتار لی تھیں۔

شاید ان کا کوئی تربیت یافتہ ایجنٹ اتنی آسانی سے یہ کچھ نہ کر پاتا۔ اس کی اس خدمت کے عوض اختر کو بطور خاص تین راتیں دہلی کے ایک شاندار بنگلے میں اس کی داشتہ آشا کے ساتھ بسر کرنے کا انعام دیا گیا۔

شباب کے ساتھ ساتھ اسے شراب بھی بہم پہنچائی گئی اور واپسی پر کچھ رقم بطور انعام دے کر اگلا کام سونپ دیا گیا۔

اس مرتبہ اسے اور لمبا کام دیا گیا تھا۔ اس نے اپنے دیہات کے گرد دو کلومیٹر کے علاقے میں موجود تمام کچی پکی سڑکوں، راستوں، پلوں، تھانوں اور دیگر بڑی عمارات کی تفصیل بہم پہنچائی تھیں۔

اختر خاندانی جرائم پیشہ تھا۔

وہ اس علاقے میں بچپن سے پولیس کے سامنے آنکھ مچولی کھیلتا آرہا تھا۔ بیشتر راستے تو اسے ازبر تھے پھر بھی اس نے نمبر بنانا اور اپنی ہوس کے ہاتھوں اندھا ہو کر دشمن کی ضرورت سے زیادہ تابعداری کا مظاہرہ کرنے کے لیے یہاں بھی اپنے کیمرے کا استعمال کیا اور دس روز بعد جب اس نے اپنا کام مکمل کرلیا تو ان لوگوں کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق آسانی سے سرحد عبور کر کے ایک مرتبہ پھر وہ ورما ملک اور اسی فوجی افسر کے سامنے جا پہنچا جس کا نام اسے شرما بتایا گیا تھا۔

اس گدھے کو تو یہ بھی نہیں بتایا گیا تھا کہ اس شرما نامی فوجی کا تعلق بھارت کی کس فوج سے ہے؟

اس کا عہدہ کیا ہے؟

اور......

وہ ہمیشہ اسے سویلین کپڑوں ہی میں کیوں ملتا ہے؟

اس نے اپنے کام سے متعلق بے شمار تفصیلات ایک ڈائری میں نوٹ کر رکھی تھیں جس کے ساتھ پانچ فلموں کے رول بھی تیار تھے۔ ڈیڑھ سو سے زائد تصاویر اور بے پناہ تفصیلات کے ساتھ اس نے تین چار گھنٹے بھارتی فوج کے دو ماہرین کے ساتھ لگا کر جنہیں بطور خاص اس دفتر میں اس روز بلایا گیا تھا ایک ایسا شاندار نقشہ تیار کروا دیا تھا جس کی مدد سے دشمن کو پاکستانی سرحد کے اس علاقے کے بیس کلومیٹر تک ایک ایک تفصیل کا علم ہو گیا تھا۔

وہ کام جو بھارتی انٹیلی جنس لاکھوں روپے کا بجٹ خرچ کرنے کے بعد کرواتی۔ چوہدری اختر نے چند ہزار روپوں میں کر دیا۔

اب ان لوگوں کو یقین ہو چکا تھا کہ یہ گدھا ضرورت سے زیادہ کام کا ہے اور وقت آنے پر وہ اس کو اگر آنکھیں بند کر کے جہنم میں چھلانگ لگانے کے لیے بھی کہیں گے تو

وہ دریغ نہیں کرے گا۔

اس مرتبہ اختر کو آٹھ روز تک ''را'' نے جی بھر کے عیاشی کروائی تھی۔ اب اسے نرمل سنگھ سے الگ کرلیا گیا تھا۔

اختر کو اس سے کیا لینا دینا تھا۔

اس نے سوچا یہ بھی اچھا ہوا بہرحال نرمل سنگھ اس کا راز دار تھا۔ اس بے وقوف نے تب بھی سمجھا تھا کہ اس نے ورما ملک سے ذاتی طور پر اتنے تعلقات بنالئے ہیں کہ اب اسے نرمل سنگھ جیسی مصیبتیں پالنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔

یوں بھی وہ جرائم پیشہ ہونے کی وجہ سے انتہائی مجرمانہ ذہنیت کا مالک تھا۔ اپنا کام نکلنے کے بعد وہ کسی بھی شخص کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ اسے سوائے اپنا الو سیدھا کرنے کے اور کوئی شوق نہیں تھا۔ بھارتیوں نے چوہدری اختر کو اب اتنا خطیر معاوضہ دینا شروع کر دیا تھا کہ اسے سمگلنگ سے زیادہ اس دھندے میں دلچسپی پیدا ہونے لگی تھی۔ ڈیڑھ سال تک وہ ''را'' کا بندہ بے دام بنا رہا۔

اس درمیان ان نے درجنوں غداری کے کارنامے انجام دیئے اور اردگرد کے دیہاتوں سے دو ریٹائرڈ فوجی جن کا تعلق ایک اقلیتی فرقے سے تھا بھارتی انٹیلی جنس کو بطور ایجنٹ فراہم کئے۔

یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ اس کی فائل پر خصوصی نشانات میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا جس کے ساتھ ساتھ اس کی مراعات بھی بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔

آشا کے بعد اب ایک اوشا اور پھر شاملی اس سے نتھی ہو گئی تھی۔ اسے دہلی کے ریڈ لائٹ ایریا کا چسکا لگا دیا گیا تھا اور یہ بھی باور کروا دیا گیا تھا کہ اب وہ ''را'' کی مکمل گرفت میں آچکا ہے۔

اب اس کے لیے کسی بھی حکم سے سرتابی کا مطلب ایک ذلت انگیز موت یا پھر باقی کی ساری زندگی جیل میں بسر کرنے کے سوا اور کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اختر نے اس مسئلے پر کبھی سر دردی مول نہیں لی تھی۔

اس کی طرف سے سب کچھ جہنم میں جاتا۔ اسے اپنی عیاشیوں، بدمعاشیوں کے علاوہ اور کسی شے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس نے بھارتی انٹیلی جنس کی ہدایت پر ایک پاسپورٹ

بنوالیا تھا اور اپنے علاقے میں یہ افواہ بڑی کامیابی سے پھیلا دی تھی کہ اس نے سمگلنگ کے دھندے سے توبہ کر لی ہے خصوصاً سرحد عبور نہیں کرتا۔

اپنی مذموم سرگرمیوں کو چھپانے کے لیے اختر نے ''را'' کی ہدایت پر سرحد کے نزدیکی شہر میں چونگی کے نزدیک ایک کنڈا لگوالیا تھا اور ایک دو ملازم رکھ کر چھوٹے موٹے ٹھیکے لے کر ان پر کام بھی شروع کروا رکھا تھا۔

یوں بھی اس کا قیام اپنے گاؤں میں کم ہی ہوتا تھا اور وہ زیادہ وقت شہر ہی میں گزارا کرتا تھا۔

✿......✿......✿

ورما ملک نے بالآخر اسے جہنم کے آخری کونے میں دھکیلنے کا بندوبست کر لیا تھا۔ اس نے اختر کا انتخاب اب تخریبی کارروائیوں کیلئے کر لیا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ اب یہ مچھلی ان کے بچھائے ہوئے حرص و ہوس کے جال میں اس بری طرح پھنس چکی ہے کہ اس کا بچ کر نکل جانا ناممکن ہوگیا ہے۔ اب اس کا جینا مرنا صرف ان ہی لوگوں کے لیے تھا۔

چوہدری اختر کو انہوں نے تخریب کاری کے تربیتی سنٹر میں بھیج دیا تھا جہاں اسے توڑ پھوڑ کا خصوصی کورس کروانے کے ساتھ ساتھ دیسی ساخت کے بم بنانے اور انہیں کامیابی سے استعمال کرنے کی تربیت بھی دی گئی تھی۔ چوہدری اختر اس مرتبہ بھارت ویزہ لے کر گیا تھا اور اس نے ایک ''پھیرے باز'' کے روپ میں سفر کیا تھا اس طرح کے ''پھیرے باز'' اکثر بھارت اور پاکستان آتے جاتے رہتے تھے۔ یہ لوگ دونوں طرف کے ویزے حاصل کر کے سفر کرتے اور قانونی طریقے سے ادھر کا مال ادھر اور ادھر کا مال ادھر کر دیا کرتے تھے۔ یہ لوگ اس کام کے لیے دونوں طرف موجود کسٹم کے عملے کا تعاون خرید لیتے تھے۔

چوہدری اختر نے تین چار شناختی کارڈ بنا رکھے تھے اور ہر شناختی کارڈ پر اس نے ایک پاسپورٹ جا کروا رکھا تھا۔ پہلی مرتبہ وہ ایک ایسے ہی پاسپورٹ پر جعلی شناخت کے ساتھ سفر کرتا دہلی پہنچا جہاں ورما ملک اس کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ ان لوگوں نے چوہدری اختر کی رہائش کا بڑا وی آئی پی قسم کا بندوبست کیا ہوا تھا اور اس کو راجا اندر بنا کر یہاں رکھا تھا۔

دن میں کچھ حصہ وہ تربیت حاصل کرتا اور باقی سارا دن اور رات عیاشی کی نذر ہو جاتی۔

''را'' نے اس کے لیے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیئے تھے ایک ہفتہ اور وہ اپنے کام میں کامل ہوگیا تھا اور مزید دس روز بھارت میں عیاشی کے مزے لوٹنے کے بعد وہ پاکستان پہنچ گیا۔

روانگی سے پہلے اسے تین چھوٹے چھوٹے ٹارگٹ دے کر بھیجا گیا تھا۔

ان ٹارگٹ پر استعمال ہونے والے بم بھی اس نے خود ہی تیار کرنے تھے جس کے لیے خاص مواد اسے دہلی ہی میں فراہم کر دیا گیا باقی اسے پاکستانی مارکیٹ سے آسانی سے مل سکتا تھا۔

چوہدری اختر نے بڑے اطمینان سے اپنا سفر مکمل کیا۔

پاکستانی سرحد میں گاڑی داخل ہونے پر مقامی روایات کے مطابق اس نے اپنا سامان اٹھانے والے قلی سے آگے ''معاملہ طے کروانے'' کے لیے کہہ دیا تھا جس نے بڑی آسانی سے معاملات طے کروا دیئے۔

محض دو ہزار روپے رشوت دے کر وہ تین بڑے بڑے اٹیچی کیس اور ایک بوری سامان سے بھری ہوئی باہر نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔

وہ اپنے ساتھ اتنا سامان لے آیا تھا جسے مقامی مارکیٹ میں فروخت کرنے ہی سے اسے ہزاروں روپے کا فائدہ ہوا۔ ان میں وہ ہزاروں روپے شامل نہیں تھے جو اسے ''را'' نے دیئے تھے۔

✿......✿......✿

چوہدری اختر کو پہلا ٹارگٹ ایک مذہبی جماعت کے جلسے میں دھماکہ کرنے کا ملا تھا۔ اس مذہبی جماعت کا ایک خاص مسلک سے تعلق تھا جن کی اپنے مخالف مسلک والوں سے نہیں بنتی تھی۔

چوہدری اختر نے حاصل کردہ تربیت کے مطابق اطمینان سے اپنا کام کیا۔ مخالف مسلک کے خلاف جوش غضب میں بھرے مقرر کی تقریر میں مگن اور گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگانے والے اس جماعت کے بے چارے کارکنوں کو اس بات کی کانوں کان خبر نہ ہوسکی کہ کب چوہدری اختر نے جو ایک محفوظ کونے میں کھڑا تھا۔ وہاں موجود کرسیوں میں سے ایک کے نیچے پہلے سے تیار شدہ ایک بم رکھا اور اطمینان سے ہجوم کے درمیان راستہ بناتا۔ نعرے مارنے والوں کی آوازوں کے ساتھ آواز ملاتا وہ جلسہ گاہ کے آخری کونے تک پہنچ گیا۔

بم پر اس نے تین منٹ کا ٹائم دیا تھا۔

تین منٹ بعد جب وہ جلسہ گاہ کے باہر محفوظ کونے سے اپنی منزل کی طرف گامزن تھا تو اس کے عقب میں زور دار دھماکہ ہوا جس کے ساتھ ہی ہر طرف ایک طوفان بدتمیزی برپا ہو گیا۔

زخمیوں اور خوفزدہ لوگوں کی چیخ و پکار نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ اس کے دائیں بائیں لوگ دیوانہ وار جان بچانے کے لیے بھاگ رہے تھے۔

لیکن وہ......

سب سے الگ تھلگ بڑے اطمینان سے چلتا چلا جا رہا تھا۔

اسے اس بات کی قطعاً پرواہ نہیں تھی کہ یہاں کیا ہو رہا ہے یا اسے کوئی مشتبہ جان کر گرفتار بھی کر سکتا ہے۔ اسے صرف ایک بات کی خوشی تھی کہ اس کا مشن مکمل ہوا۔

ورما ملک نے اسے جو کام دیا تھا اس کا ایک حصہ اس نے مکمل کر دیا اور تیس ہزار روپے اس کی جیب میں مزید پہنچ گئے۔

اس طرح کے مزید دو دھماکے اس نے کرنے تھے اور پچاس ہزار روپے اسے معاوضہ مل جاتا۔

لیکن......

یہ پچاس ہزار ہی کہاں؟

اس کے ساتھ اسے دہلی یا پھر بھارت کے کسی دوسرے شہر میں جو عیاشی کے مواقع ملتے تھے اور اس روز کناٹ پلیس کی اس کافی شاپ میں سروس کرتی جس ماڈل گرل گائیتری کا تعارف اس کے ساتھ ورما ملک نے کروایا تھا اور کہا تھا کہ جب وہ اپنے مشن سے کامیاب واپس لوٹے گا تو وہ اسے کم از کم دس روز کے لیے گائیتری کے ساتھ بمبئی کی سیر کے لئے بھیجے گا۔

گائیتری کا سیکسی سراپا اس کی آنکھوں کے راستے اس کے لہو میں سرایت کر گیا تھا۔

جب بھی اس کا ذہن کناٹ پلیس کی اس کافی شاپ کی طرف جاتا اور گائیتری اس کی طرف مسکراہٹ اچھال کر اپنا خوبصورت اور نرم و نازک ہاتھ اس کی طرف بڑھاتی دکھائی دیتی تو اس کے روئیں روئیں میں بجلی سرایت کر جاتی۔ وہ گائیتری کا قرب حاصل کرنے کے لیے دیوانہ ہوا جاتا تھا۔

اس نے بھارتی ٹی وی کی سکرین پر گائیتری کو ایک صابن کی ایڈ میں دیکھا تھا۔ اس ایڈ میں گائیتری نے برائے نام ہی کپڑے پہنے ہوئے تھے اور اس کے بدن کے سارے نقوش

چوہدری اختر کے غلیظ ذہن پر اس بری طرح نقش ہو چکے تھے کہ اب کھرچنے پر بھی شاید نہ مٹ پاتے۔

جب اسے علم ہوا کہ کافی شاپ والی یہ گائیتری بھارتی ڈراموں، سٹیج اور فلموں میں بھی مختلف کردار ادا کرتی ہے اور ماڈلنگ کی دنیا میں اس کا اچھا خاصا نام ہے تو چوہدری اختر نے خود کو وی آئی پی قسم کا تماش بین سمجھنا شروع کر دیا تھا۔

"چوہدری صاحب اس سے پہلے آپ جن لڑکیوں کے ساتھ مزے لوٹتے رہے ہیں وہ سالیاں تو اس کی جوتی کے برابر نہیں...... ارے بڑے بڑے پھنے خاں اس کے پیچھے نوٹوں سے بھرے بریف کیس پکڑے کتے کی طرح دم ہلاتے پھرتے ہیں...... لیکن یہ بھی ہر کسی کو منہ نہیں لگاتی...... چوہدری اس مرتبہ تم کامیاب لوٹے تو تمہیں معمولی انعام نہیں ملنے والا...... ارے فلمسٹار ماڈل گرل گائیتری کے ساتھ دس دن اور راتیں گزارنے کی قیمت کا تم اندازہ ہی نہیں کر سکتے...... اس کے ساتھ تو ایک رات گزارنے کے لیے دلی کے سیٹھ لاکھوں روپے قربان کر دیا کرتے ہیں۔"

ورما ملک نے اس کی آتش ہوس کو بھڑکاتے ہوئے کہا۔

"ملک صاحب...... میں بھی اس چیلنج کو قبول کرتا ہوں اور اس سالی کو حاصل کرنے کے لیے جان کی بازی لگا دوں گا...... آپ سمجھئے کہ تینوں کام ہو گئے۔"

چوہدری اختر نے مرغے کی طرح گردن پھلاتے ہوئے کہا تھا۔

"چوہدری مردوں والی زبان کرنا...... اچھا تم بھی کیا یاد کرو گے چلو تین میں سے دو ٹارگٹ ہی ہٹ کر لو تو بھی انعام تمہاری جھولی میں ہو گا......"

ورما ملک نے اسے مکمل شیشے میں اتار لیا تھا۔

اور......

پہلے ٹارگٹ کو ہٹ کرنے......

پہلے مشن میں کامیابی حاصل کرنے......

مادر وطن کے کلیجے میں پہلا بھرپور خنجر اتارنے کے بعد......

چوہدری اختر پھولے نہیں سما رہا تھا۔

اس کے وجود میں ضمیر نام کی چڑیا شاید اس کی پیدائش کے ساتھ ہی اڑ گئی تھی اور رگوں میں ماں کے دودھ کی جگہ بے غیرتی اور ہوس دوڑنے لگی تھی۔ وہ اپنے گرد اگرد کے

ماحول سے مکمل لاتعلق بظاہر اس ماحول کا حصہ بنا دوسرے لوگوں کے ساتھ ہی محفوظ مقام کی طرف بھاگتا چلا جا رہا تھا۔

سڑک کے دورویہ لگے سائن بورڈز پر بنی عورتوں کی تمام تصویریں گائیتری کی تصویروں میں تبدیل ہوگئی تھیں۔

گائیتری جو اپنے آدھ ننگے بدن کے ساتھ بانہیں پھیلائے اس کی طرف بڑھتی چلی آرہی تھی تاکہ چوہدری اختر کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر اس کی آتش ہوس کو ٹھنڈا کرسکے۔

✿......✿......✿

اس دھماکے سے تین بے گناہ تو موقع پر ہی مارے گئے تھے جبکہ درجنوں کی تعداد میں زخمی ہوئے تھے۔ شاید زخمیوں کی تعداد بھی کم نہیں کیونکہ بم کے دھماکے سے اتنے لوگ زخمی نہیں ہوئے تھے جتنے بدنظمی کی وجہ سے ہجوم کے نیچے آکر کچلے گئے۔ اس واردات نے سارے شہر کو خوف کی چادر پہنا دی تھی۔ اخبارات کے فوٹو گرافر زخموں سے بے حال حاضرین جلسہ کی تصاویر تیزی سے سلولائیڈ کے فیتوں پر اتار رہے تھے۔

ان میں سے ہر ایک کی یہی کوشش تھی کہ اسے سب سے زیادہ کریہہ اور خوفناک منظر اپنے قارئین کو دکھانے کو مل جائے وہ زخموں سے تڑپتے، طبی امداد کے لیے بے حال لوگوں کی چیخ وپکار سے بے پرواہ اپنے کام میں مصروف تھے۔

عین ان لمحات میں جب فوٹو گرافر حضرات اپنے اپنے اخبار کی لیبارٹریوں میں اپنی فلمیں دھو رہے تھے۔ قریباً تمام بڑے بڑے اخبارات سے نیوز ایڈیٹروں کے ٹیلی فونوں کی گھنٹیاں یکے بعد دیگرے بجنے لگیں۔ کوئی شخص مخالف مسلک رکھنے والی تنظیم کی ایک ''گوریلا شاخ'' کا لیڈر بن کر ان سب کو باری باری فون کے ذریعے یہ پیغام پہنچا رہا تھا کہ دھماکہ انہوں نے کیا ہے اور وہ اپنے مسلک کے بے گناہوں کے خون کا بدلہ اب مخالف مسلک کے لوگوں کے قتل عام سے لیں گے۔ یہ دھماکہ فلاں دھماکے کا ردعمل ہے اب یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔

یہ ''را'' کے سٹیج کردہ ڈرامے کا دوسرا ایکٹ تھا۔

ایک کام انہوں نے اپنے ایک ایجنٹ چوہدری اختر سے کروایا تھا اور دوسرا کام وہ اپنے کسی دوسرے ایجنٹ سے کروا رہے تھے۔ ایک کا کام دھماکہ کر کے بے گناہوں کو خاک و خون میں لوٹانا تھا۔ دوسرے کا مشن دھماکے کے بعد فون کر کے یہ گمراہ کن اطلاع اخبارات کو پہنچا کر ایک غلط فہمی جنم دینا۔ انتقال کے جذبات کو ہوا دینا۔ عوام کو ایک دوسرے کے خلاف

بھڑکانا۔ مذہب اور مسلک کے نام پر گمراہ ہونے والے جذباتی مسلمانوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر اپنا الو سیدھا کرنا تھا۔ اس طرح غلط فہمیوں سے جنم لے کر پھیلنے والے انارکی سے ملک کو جو نقصان پہنچتا اس کئی گناہ زیادہ فائدہ ''را'' کو پہنچ جاتا۔

وہ یہی چاہتے تھے کہ اسلام کے نام پر حاصل کردہ اس ملک کے شہری اسلام کے نام پر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن جائیں۔ بھارت میں بسنے والے مظلوم اور مقہور مسلمانوں کی مدد کے بجائے...... کشمیر کے عتاب زدہ مسلمانوں کے کندھے سے کندھا ملانے کے بجائے......ایک دوسرے کا گلہ کاٹتے رہیں۔

ایک دوسرے کو اپنی گالیوں، دشنام اور گولیوں کا نشانہ بناتے رہیں۔

اور......

کسی کا دھیان ان کی طرف نہ جائے۔

اس طرح آسانی سے وہ اپنے کام میں جتے رہیں۔

✿......✿......✿

اخبارات نے فون پر ملنے والی اس اطلاع کو صفحہ اول کی زینت بنا دیا۔ جہاں خون میں لتھڑے لاشوں اور کراہتے ہوئے زخمیوں کی تصویریں چھپی تھیں۔ دھماکے کی خبر چھپی تھی۔ وہاں ایک کونے میں ایک چھوٹی سی سنگل کالمی سرخی جما کر یہ خبر بھی شائع کر دی گئی کہ مخالف مسلک رکھنے والوں کی تنظیم کے ''گوریلا گروپ'' کے فلاں مفرور لیڈر کی طرف سے ٹیلی فون پر یہ بیان جاری ہوگیا ہے کہ یہ دھماکہ انہوں نے کیا۔

اس سنگل کالمی سرخی نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ صبح جب ملک کے کونے کونے میں اخبارات پہنچے اور متعلقہ مسلک کے لوگوں کو اخبار کے ذریعے علم ہوا کہ ان کے پیاروں کو مخالف مسلک والوں نے مار ڈالا ہے اور وہ آئندہ بھی ایسا ہی کرنے کا عزم رکھتے ہیں تو ان کے دلوں میں بھی انتقام کی آگ بھڑکنے لگی۔

نادانستہ طور پر بغیر کچھ لئے دیئے، بغیر کسی مطلب اور مقصد کے وہ بھی اس ان دیکھی اور اندھی لڑائی میں کود پڑے۔ اس لڑائی میں جس کا انجام سوائے تباہی کے اور کچھ نہیں تھا۔ مخالف مسلک کے دفاتر پر حملے ہونے لگے۔ مخالف مسلک سے تعلق رکھنے والوں کے گھروں پر پتھراؤ ہونے لگا۔ دو تین چھوٹے چھوٹے شہروں میں جہاں متعلقہ مسلک والوں کا زور لگا انہوں نے مخالف مسلک رکھنے والوں کے علماء کرام کو مار ڈالا۔

رات گئے تک جب مخالف مسلک رکھنے والوں کی تنظیم کے اعلیٰ عہدیدار خود ایک ایک بڑے اخبار کے دفتر میں پہنچے اور انہوں نے قسمیں اٹھا اٹھا کر بیان جاری کئے کہ ان کی تنظیم کا کوئی گوریلا گروپ نہیں ہے اور ان کا اس دھماکے سے دور دور کا بھی تعلق نہیں ہے کسی نے اخبارات کو فون کر کے گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے وہاں یہ خبریں بھی پہنچ گئیں کہ اس مسلک کے تین علمائے کرام تین مختلف شہروں میں مخالفین کے حملوں سے مارے گئے ہیں۔ اس خطرناک صورتحال نے انتظامیہ کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔

فرقہ وارانہ کشیدگی کو روکنے کے لئے گورنر صاحب نے دونوں مسلک کے بڑے بڑے علمائے کرام کا ہنگامی اجلاس طلب کیا۔

امن کمیٹیاں قائم کی گئیں۔

ایک دوسرے کے ساتھ مذہبی رواداری اپنانے کا عہد کیا گیا۔

ایک دوسرے کے جذبات کو بھڑکانے والی حرکات پر قدغن لگانے کی تلقین اور وعدے ہوئے۔

لیکن......

ایک دوسرے کے ساتھ بغل گیر ہو کر، گرم جوشی سے ہاتھ ملا کر اخبارات کے لئے تصویریں کھنچوانے والوں کے دل ایک دوسرے کی طرف سے صاف نہیں ہوئے تھے۔

ان سب کی آنکھوں کے سامنے ان کے مسلک سے تعلق رکھنے والوں کے لاشے لہرا رہے تھے۔ ان کی ایک دوسرے کے تئیں بدگمانیاں جوں کی توں قائم تھیں۔

وہ گورنر صاحب کے سامنے تو بڑھ چڑھ کر ایک دوسرے کے لئے کلمہ خیر کہہ رہے تھے۔ ایک سے بڑھ کر ایک فراخدلی کا اظہار کر رہے تھے۔ ایک دوسرے کی زیادتی کو درگزر کر کے قرآن کے مطابق تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، والی آیت کی مسلسل تکرار کر رہے تھے۔

لیکن...... یہ بات دونوں ہی جانتے تھے کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔

محض گورنر صاحب کو مطمئن کرنا، انتظامیہ کو اپنے تئیں خوش گمانی میں مبتلا رکھنا چاہتے تھے۔ ان کے دلوں میں جو گرہ دشمنی کی بھیانک چال نے لگا دی تھی وہ مضبوط ہوتی چلی جا رہی تھی اور فی الوقت اس کے کھلنے کی کوئی راہ سجھائی نہ دیتی تھی۔ اگلے روز اخبارات نے ان کے گلے ملنے کی تصویریں شائع کر کے اس مسئلے کا اپنی دانست میں خاتمہ بالخیر کر دیا۔

☆......☆......☆

دس روز بعد دوسرے مسلک کی تنظیم نے اپنا مذہبی اجتماع کیا۔

اس اجتماع کے لیے انہوں نے اپنی دانست میں خاطر خواہ بندوبست کئے تھے۔

لیکن......

ان بے چاروں کو اس بات کا کیا علم کہ دوسرے شہر سے ان کے جلسے میں شرکت کرنے کے لئے آنے والے ان کے ہم مسلک بھائیوں کی ایک بس میں چوہدری اختر بھی اسی مسلک کے ایک گرم جوش کارکن کی حیثیت سے شامل ہے۔

اس کے چہرے پر موجود گھنی داڑھی، سر پر عمامہ اور گھٹنوں تک اٹھے شلوار کے پائنچے بظاہر اسے اپنے مسلک کا ایک سچا اور پر جوش پیروکار ظاہر کرنے کے لیے کافی تھے۔ دوسرے شہروں سے آنے والوں کی طرح اس نے بھی ایک بڑی سی گرم چادر اوڑھ رکھی تھی۔

ایک جیکٹ پہن رکھی تھی۔

اور......

ان دونوں میں تین چار ٹکڑوں میں ان کی تباہی کا سامان موجود تھا۔ اس نے بس میں بیٹھے ہوئے بڑے آرام سے اپنا کام مکمل کیا۔ بس اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق جلسہ گاہ سے ملحقہ سڑک پر کھڑی ہوگئی جہاں پہلے بھی ایسی متعدد بسوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔

پر جوش کارکن جنہیں جلسہ گاہ میں مناسب جگہ نہیں مل سکی تھی۔ اپنے لیڈروں کی ایک جھلک دیکھنے اور ان کی تقاریر سننے کے لیے بسوں کی چھتوں پر چڑھ کر بیٹھ رہے تھے وہ بے چارے اپنے مذہبی جوش و خروش کے ساتھ کئی کئی میل کا سفر طے کر کے، یہاں آئے تھے تو اپنے لیڈروں کو کیوں نہ دیکھتے۔

چوہدری اختر نے حسب سابق اپنا کام مکمل کیا۔

ٹائم بم کو چار منٹ کا وقفہ دیا۔

خاموشی سے بس سے نیچے اترا۔

اور......

چپ چاپ ہاتھ میں تسبیح پکڑے ایک محفوظ کونے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

اس کی ٹائمنگ بڑی شاندار تھی۔

عین ان لمحات میں جب وہ جلسہ گاہ کے بالکل آخری سرے پر جہاں اکا دکا لوگ ہی دکھائی دے رہے تھے۔ اچانک ہی ایک زوردار دھماکے سے فضاء دہل کر رہ گئی۔

دھماکے کے ساتھ ہی بس کو آگ بھی لگ گئی کیونکہ اس مرتبہ بم اس نے جس کپڑے میں لپیٹ کر رکھا تھا اسے بس کی ڈیزل والی ٹینکی کے بالکل اوپر رکھ دیا تھا۔

دھماکہ کیا تھا۔

قیامت صغریٰ تھی۔

کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

اس مرتبہ دوگنا نقصان ہوا۔بس کو لگنے والی آگ نے اس پر موجود درجنوں لوگوں کو زندہ جلا ڈالا ان بے چاروں کو چندمنٹ کی مہلت بھی نصیب نہ ہوئی اور ان کے بدن جل کر کوئلہ ہوگئے۔

اس دھماکے سے مرنے والوں کی تعداد مبالغہ انگیز حد تک بیان کی جارہی تھی۔سرکاری طور پر مرنے والوں کی تعداد بیس بتائی گئی۔ یہ وہ بدقسمت تھے جو جل کر مرے یا پھر جنہیں دھماکے سے پھٹنے والے بس کے ٹکڑوں نے مار ڈالا۔ درجنوں زخمی ان کے علاوہ تھے۔

ان میں وہ لوگ شامل نہیں تھے جو بدنظمی کی انتہا کو چھوتے ہوئے اپنی جان بچا کر بھاگتے ہجوم کے قدموں تلے آکر کچلے گئے۔

✿....✿....✿

چوہدری اختر......!!

''را'' کا تربیت یافتہ دہشت گرد۔

پاکستان کی آستین کا سانپ۔

مادر وطن کے دودھ پر پلنے والے اژدھا۔

ہوس وحرص کا اندھا۔

بھارتی ماڈل گرل گائیتری کے جسمانی حصول کے لیے باؤلا ہونے والا وحشی درندہ جس کا نام مسلمانوں جیسا صرف اسلئے تھا کہ اس نے مسلمان ماں کے پیٹ سے جنم لیا۔

چند ہزار روپوں کے لئے''را'' کی طرف سے بچھائے ہوس کے جال میں پھنسا شراب وشباب کی بدمستیوں میں غرق۔

اپنا مشن مکمل ہونے کے بعد۔

پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق یہاں سے قریباً دوکلومیٹر دور موجود اپنی کار تک پہنچا جو اس نے یہاں پارک کی ہوئی تھی۔

پرانے ماڈل کی اس کار کو جس کے پیچھے شیشے پر پاکستان کے ساتھ محبت کے اظہار کے تین چار سٹکر اور ایک محب وطن پارٹی کے ہردلعزیز لیڈر کی تصویر لگی ہوئی تھی، میں بیٹھ کر اپنے محفوظ ٹھکانے کی طرف چل دیا۔

اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر اس نے خود ہی اپنی شیو کی۔ پندرہ بیس روز کی بڑھی ہوئی داڑھی کے بالوں سے نجات حاصل کی۔

اور......

وہاں رکھی وہسکی کی بوتل سے دل بہلانے لگا۔

یہاں موجود اس کے ایک کارندے نے جس کے نزدیک وہ صرف ایک ''پھیرے باز'' تھا اس کے لیے مقامی ویڈیو سنٹر سے تازہ ترین بلیو فلمیں لاکر رکھی ہوئی تھیں۔ چوہدری اختر کی آمد کے بعد اس نے ایک فلم ویڈیو میں پھنسائی اور اسے چلا کر اپنے مالک کیلئے ایسی فلموں میں نظر آنے والے کردار کو یہاں پہنچانے کے لئے شہر کی ایک معزز طوائف کو فون کرنے لگا۔

اگلے دو گھنٹے بعد جب چوہدری اختر کو دنیا کی ہر لڑکی گائیتری دکھائی دینے لگی تھی۔

شہر کی معزز طوائف کی طرف سے فراہم کردہ ''مقامی گائیتری'' اس کے کمرے میں اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ داخل ہوئی۔

اور......

انسان نما درندہ چوہدری اختر اس پر کتے کی طرح جھپٹ کر اسے نوچنے لگا......!

✿....✿....✿

اخبارات کو پندرہ بیس روز بعد بھرپور دھماکے کی خبر ملی تھی۔

لیکن......

اس مرتبہ ہونے والی تباہی پہلے سے کئی گناہ زیادہ تھی۔

تصویریں بھی زیادہ تھیں۔

خبر بھی بڑی تھی۔

اس لئے قدرتی طور پر اس خبر کو اخبار میں بھی زیادہ ہی جگہ ملی تھی۔ اس مرتبہ پھر پرانا کھیل دہرایا گیا۔

اس کھلاڑی نے زبان بدل کر، انداز بدل کر، الفاظ بدل کر، پہلے جیسا بیان جاری

کیا۔ اس نے فون پر بڑے بڑے اخبارات کے متعلق ایڈیٹروں کو اپنی شناخت مخالف مسلک کے کمانڈو گروپ، کے جرنیل کی حیثیت سے کرائی۔

اس دھماکے کی ذمہ داری قبول کی۔

آئندہ کیلئے ایسے ہی خطرناک عزائم کا اظہار کیا۔

اور......

اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی بات دہرانے کے بعد یہ اعلان بھی کر دیا کہ انہیں کمزور سمجھنے والوں کی آنکھیں اب کھل گئی ہوں گی اور ان کے جلسہ میں دھماکہ کرنے والوں کے گوریلا گروپ کی کارروائی سے مرنے والے شہداء کی روحوں کو بھی چین اور قرار آ گیا ہوگا۔

اخبارات کے ذمہ دار ایڈیٹر صاحبان نے اپنے پیشہ ورانہ فرائض کے تقاضے پورے کرتے ہوئے۔

عوام کو باخبر رکھنے کے لئے۔

سماج دشمن عناصر سے چوکنا رہنے کے لئے۔

یا پھر......

Exclosive ''ایکسکلوسو نیوز'' کے چکر میں۔

پہلے کی طرح موجود فون کال کو بھی جوں کا توں اپنے اخبار کے ذریعے عوام تک پہنچا دیا۔

ایک مرتبہ پھر پہلے والی کہانی دہرائی گئی۔

کردار بدل گئے تھے۔

مقامات بدل گئے تھے۔

مرنے اور زخمی ہونے والوں کی تعداد میں کہیں کم کہیں زیادہ ہو گئی تھی۔

لیکن......

وہی خونیں ڈرامہ جوں کا توں دہرایا گیا تھا۔

وہی شیطانی کھیل جوں کا توں رچایا گیا تھا۔

فسادات کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔

بڑی مشکل سے ملک کے تین بڑے شہروں میں پیرا ملٹری فورسز کی خدمات حاصل کرنے کے بعد۔

دونوں مسالک کے کچھ جید علمائے کرام کو ان کے آبائی شہروں سے بے دخل کرنے اور کچھ جید علمائے کرائم کو کچھ شہروں تک پابند کرنے کے بعد اس شورش پر قابو پایا جا سکا۔

جب پاکستانی سکیورٹی ایجنسیاں ''را'' کے اس کھیل کو سمجھتے ہوئے مستقبل کے لئے پیش بندی کرنے کی فکر میں غلطاں تھیں۔

عین ان لمحات میں......

دہلی میں موجود ''را'' کے ایک ذیلی ہیڈکوارٹر میں جشن کامیابی منایا جا رہا تھا...... اس محفل کا دولہا ورما ملک تھا......

''را'' کا مایہ ناز ماہر سبوتاژ آفیسر آن سپیشل ڈیوٹی ورما ملک جس نے اپنی دانست میں پاکستانی ایجنسیوں کو ناکوں چنے چبا دیئے تھے۔

بے گناہ اور بے بس عوام کے خون سے ہولی کھیل کر جس نے اپنی ''دھرتی ماتا' کی رکھشا کی تھی......

اپنے دیس کی مہان سیوا کی تھی۔

۞......۞......۞

گائیتری

دونوں کام مکمل کرنے کے بعد دو تین روز بڑی بے چینی سے بسر کر کے اگلے روز چوہدری اختر نے بھارتی سفارت خانے کا رخ کیا۔

بھارتی ہائی کمیشن کے باہر ویزہ حاصل کرنے والوں کی بھی قطار لگی ہوئی تھی۔ وہ بھی معمول کے مطابق اس قطار میں لگ گیا۔

اس نے معمول کی ساری کارروائی مکمل کی تھی۔

مقامی پولیس سے گالیاں کھائی تھیں۔

قطار میں دھکے کھائے تھے۔

بالآخر ڈیوٹی پر موجود ایک حوالدار کی مٹھی گرم کرنے کے بعد کھڑکی کے نزدیک جگہ حاصل کی تھی۔

ویزہ سیکشن بند ہونے میں چند منٹ پہلے ہی اس کا نمبر آ گیا۔

اس سے آگے راوی اس کے لیے چین ہی چین لکھتا تھا۔

جس نام سے وہ سفر کرنے جا رہا تھا۔

جس پاسپورٹ پر اسے ویزہ حاصل کرنا تھا؟ اس کا نمبر......

اس سے متعلق دوسری تمام تفصیلات یہاں پہلے ہی سے موجود تھیں۔

آج کل بھارتی سفارت خانے نے بہت سختی کی ہوئی تھی اور وہ معمول سے بہت کم تعداد میں ویزے جاری کر رہے تھے۔

اس کے ساتھ معمول کی ساری کارروائی کی گئی۔

اسے دوسرے لوگوں کی طرح پریشان کیا گیا۔

لیکن......

اسے دوسروں کی طرح انکار کرنے یا اگلی تاریخ دینے کے بجائے ویزہ دے دیا گیا۔ ویزہ حاصل کرنے کے بعد کے مراحل بھی اس نے حسب روایت طے کئے۔

بھارتی ہائی کمیشن کے باہر نکلتے ہی اسے مقامی سکیورٹی والوں نے گھیر لیا اس کا پاسپورٹ دیکھا گیا۔

اس کا انٹرویو لیا گیا۔

الٹے سیدھے سوالات کر کے اسے پریشان کرنے کی کوشش کی گئی۔

دھمکیاں دی گئیں۔

الزامات لگائے گئے۔

لیکن......

اس سب کچھ کے لئے وہ ذہنی طور پر تیار تھا۔

یہ معمول کی ایکسرسائز تھی۔

وہ ذہنی طور پر اس سب کچھ کے لیے تیار تھا۔

اس نے تمام معاملات کا خندہ پیشانی سے ایک عام شہری کی طرح سامنا کیا۔ اپنی کسی حرکت سے اس نے اپنے آپ کو ابنارمل ظاہر نہیں کیا۔

دوسرے ویزہ ہولڈروں کی طرح سکیورٹی والوں کی منت سماجت کی اور انہیں اپنی اداکاری کے ذریعے اس بات کا یقین دلانے کے بعد کہ بڑا مظلوم انسان ہے اور واقعی اس طرح کے چھوٹے موٹے دھندے سے اپنی بیوہ ماں اور یتیم بہن بھائیوں کا پیٹ پال رہا ہے۔

اسے چھٹکارا مل گیا۔

اختر چوہدری اگلے روز ٹرین کے ذریعے بھارت جا رہا تھا۔ اپنے ٹھکانے سے دہلی پہنچنے تک اس کے دماغ پر ایک ہی شکل چھائی رہی۔

یہ تھی گائیتری۔

وہی حرافہ جس کے جسمانی حصول کے لئے اس نے اپنا خمیر ہی بدل لیا تھا اور وہ انسان کے بجائے درندہ بن گیا تھا۔

ایسا خونخوار درندہ جسے انسانی خون کی لت لگ گئی ہو۔

اس کی حالت تو ڈائن سے بھی بدتر تھی۔

ڈائن بھی سات گھر چھوڑ دیا کرتی ہے۔

لیکن

اس نے تو ایک گھر نہیں چھوڑا تھا۔

بے گناہ ہم مذہبوں، ہم وطنوں کے خون سے محض اپنے آقاؤں کو خوش کر کے شراب و شباب کے حصول کے لئے خون کی ہولی کھیلی تھی۔

اس ٹرین سے دوسرے پھیرے باز بھی سفر کر رہے تھے۔

ان میں کچھ چہرے اس کے شناسا بھی تھے۔

یہ لوگ ایک ہی دھندے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے آپس میں ایک برادری کی شکل اختیار کر گئے تھے۔

وہ سب جانتے تھے کہ ان کے پاس مختلف ناموں والے پاسپورٹ ہیں۔

ان کے چہروں سے ان کے ہم پیشہ ہی نہیں، دونوں طرف سے کسٹم والے، ایجنسیوں والے بھی آگاہ تھے۔

لیکن......

وہ مصلحتاً خاموش تھے۔

کچھ ان کے حصے دار تھے۔

کچھ کا منہ بند کر دیا گیا تھا۔

اور......

کچھ اسے دوسرے کی سردردی اپنے سر لینے والی بات سمجھ کر خاموش تھے۔

انہیں اس دھندے سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔

یہ پھیرے باز ایک دوسرے سے شناسا ضرور تھے۔

ایک دوسرے کے بزنس پارٹنرز بھی تھے۔

لیکن......

ہوشیار کاروباری سیٹھوں کی طرح وہ ایک دوسرے کو اپنا داؤ نہیں بتایا کرتے تھے۔

ان کی ایک ہی کوشش ہوتی تھی کہ جو "آئیٹم" وہ ڈال رہے ہیں اس کی دوسرے "پھیرے باز" کو ہوا بھی نہ لگے۔

اس طرح ان کے کاروباری مفادات محفوظ رہتے تھے۔

بسا اوقات وہ ایک دوسرے کے ساتھ اپنے خیالات اور مال کا تبادلہ بھی کر لیا

کرتے تھے۔

لیکن......

ایک بات پر ان کا اتفاق تھا کہ وہ اپنے ٹھکانے سے دوسرے کو آگاہ نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی سرگرمیاں ایک دوسرے سے پوشیدہ رہتی تھیں۔

ان کی ملاقاتیں اکثر ٹرین میں یا پھر دلی اور لاہور کے بیوپاریوں کے ہاں ہوا کرتی تھیں لیکن اس طرح کہ ان میں سے کسی کو یہ خبر نہ ہونے پائے کون کس کا گاہک یا خریدار ہے؟

یہ بھی "را" کی ہی پالیسی کا شاخسانہ تھا۔ وہ ان "پھیرے بازوں" کے درمیان ایک دوسرے سے خوف کی فضا پیدا کر کے اپنے لوگوں کی اصلیت کو پوشیدہ رکھتے تھے کیونکہ انہیں اس بات کا شک رہتا تھا کہ ان پھیرے بازوں میں اگر ان کے لوگوں موجود ہیں تو پاکستانی ایجنسیوں کے لوگ بھی موجود ہو سکتے ہیں۔

✡......✡......✡

چوہدری اختر کو بھی آڑ میسر تھی۔

آج بھی اس نے دہلی کے ریلوے سٹیشن پر پہنچنے کے بعد اپنے دوسرے ساتھیوں سے علیحدگی اختیار کی اور ریلوے سٹیشن ہی سے اسی نمبر پر فون کر کے اپنی آمد کی اطلاع دی جو اسے فراہم کیا گیا تھا۔

اس نمبر سے اسے ٹیکسی کے ذریعے دلی کے ایک مشہور علاقے میں موجود ایک دفتر میں آنے کے لئے کہا گیا۔ اختر جانتا تھا کہ یہ دفتر جس کے باہر بظاہر کسی ایکسپورٹ ایجنسی کا بورڈ لٹکا ہوا تھا دراصل "را" کا ایک ذیلی دفتر تھا۔ "را" والوں کے کئی "سیف ہاؤس" اس شہر میں موجود تھے جہاں وہ اپنے غیر ملکی مہمانوں کو خوش آمدید کہتے تھے۔ ان سے معاملات نمٹاتے تھے۔ ان کو رہائش اور "دیگر لوازمات" بہم پہنچاتے تھے۔

اور......

پھر انہیں یہیں سے اگلے مشن پر روانہ کر دیا کرتے تھے۔

اختر کو یہاں پہنچنے میں کوئی مشکل نہیں آئی تھی۔ وہ یہاں دو مرتبہ پہلے بھی آ چکا تھا۔

آفس ایک پلازہ کے دوسرے فلور پر بنا ہوا تھا۔ یہ مکمل فلور اس آفس کے لئے ہی مخصوص تھا۔

فلور کے دورویہ بنے لگژری کمروں کو دیکھ کر کوئی عقل کا اندھا بھی سمجھ سکتا تھا کہ یہ آفس کے بجائے کوئی شاندار ہوٹل یا پھر عیاشی کا اڈہ ہے...... آفس کے مین گیٹ پر بندوق بردار گورکھے

کو اس نے اپنا نام اور متعلقہ نام بتایا تو اس کا ہاتھ فوراً ہی سلام کو اٹھ گیا۔

شاید اسے مہمان کی خصوصی حیثیت سے پہلے ہی آگاہ کر دیا گیا تھا۔ جیسے ہی وہ مین گیٹ سے اندر داخل ہوا اسے ورما ملک دکھائی پڑا جو دونوں بازو پھیلائے اس کے نام کا نعرہ بلند کرتے ہوئے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”ویل کم چوہدری ویل کم......“

اس نے گرم جوشی سے چوہدری اختر سے بغل گیر ہوتے ہوئے کہا۔

جواب میں چوہدری نے اس سے زیادہ منافقت کا مظاہرہ کیا تھا۔ متعلقہ کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس نے چوہدری کا حال احوال دریافت کیا۔ چوہدری اختر کا سامان وہاں موجود ایک چپراسی نے سنبھال لیا تھا۔

”ویل ڈن چوہدری...... ویل ڈن...... یار تو نے تو کمال ہی کر دیا۔ افسر لوگ بہت خوش ہیں اور اس مرتبہ تمہیں توقع سے بڑا انعام ملے گا۔“

ورما ملک نے اس کے کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”ادھر آؤ...... اور دیکھو کہ کون تمہارا منتظر ہے۔“

یہ کہتے ہوئے ورما ملک نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا جہاں ایک لڑکی کھڑکی کی طرف پشت کیے شاید سگریٹ پی رہی تھی۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ ان کی طرف مڑی تو چوہدری اختر کو اپنی نبضیں ساکت ہوتی محسوس ہوئیں۔ یہ تو اس کی ”سیکس کوئین“ گائیتری تھی۔

وہی گائیتری جس کے حصول کے لیے وہ اپنی جان پر کھیل گیا تھا۔

گائیتری نے سگریٹ کو بڑی ادا سے ایک کونے میں دھری میز کی ایشٹرے میں بجھایا اور اس کی طرف بڑھی۔

”ہیلو سر......“

اس نے بڑے مہذب انداز میں چوہدری اختر کو اس کی توقع سے بڑھ کر عزت دیتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا اور گرم جوشی سے اسے دباتی چلی گئی۔

اختر خود کو فضا میں اڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

اسے اپنے بدن میں انگارے دوڑنے کا احساس ہو رہا تھا۔

”کیسے ہیں آپ...... ملک صاحب آپ کی بہت تعریف کر رہے ہیں۔ انہوں نے

آپ کی اتنی تعریف کی کہ میں آپ کے ساتھ وقت گزارنے پر مجبور ہو گئی...... اتنی شاندار شخصیت سے ملنے کو کس کافر کا دل نہیں چاہے گا۔“

اس نے آخری فقرہ کے الفاظ چباتے ہوئے ایسے انداز سے ادا کیا تھا کہ اختر کو اپنے دل کی دھڑکن رکتی محسوس ہوئی۔

اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کو کیا جواب دے۔

”جی میں کس قابل ہوں...... یہ تو ملک صاحب کا بڑا پن ہے۔“

بالآخر اس نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔

”اچھا بھئی...... اب میں کباب میں ہڈی بننے والا کون ہوں...... تم بھی سفر سے تھکے ہوئے ہو گے اور مس گائیتری بھی بڑی بے چینی سے تمہاری منتظر ہیں۔ اب تمہاری میزبان تمہارے قیام کے دوران مس گائیتری ہی ہوں گی۔ ہم کل صبح ملاقات کریں گے۔ وہ بھی اگر مس گائیتری نے اجازت دی تو...... کیونکہ اب سب کچھ ان کی مرضی سے ہوگا۔“

اس نے یہ کہتے ہوئے ایک فحش سا اشارہ بھی کر دیا تھا۔

”تھینک یو مسٹر ورما۔“

یہ کہہ کر گائیتری نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا جو شاید اس کے لیے باہر جانے کا اشارہ تھا اور دروازہ بند کر دیا۔

اگلے روز صبح ہونے تک وہ چوہدری اختر کی تھکن اتارتی رہی۔

اس دوران اس نے چوہدری اختر کو گناہ و لذت کے ایسے ایسے جہانوں کی سیر کروا دی تھی کہ اب وہ اس کے ایک اشارے پر اس کے قدموں میں کتے کے پلے کی طرح لوٹنے کو بھی تیار تھا۔

۞......۞......۞

صبح دیر گئے ان کے کمرے کے باہر دستک ہوئی اور ورما ملک اجازت لے کر اندر آ گیا۔

اس نے اس مداخلت پر شرمندگی کا اظہار بھی کیا تھا لیکن گائیتری نے بڑی فراخ دلی سے اسے معاف کر دیا۔

وہ اختر سے اجازت لے کر تھوڑی دیر کے لیے اپنے کسی کام سے چلی گئی۔ گائیتری کی روانگی کے بعد دونوں نے گپ شپ شروع کر دی۔ تھوڑی دیر بعد وہاں ایک فوجی آفسر آ گیا جس کے ساتھ ایک درمیانی عمر کا آدمی بھی تھا جس نے اپنا تعارف شکلا کے نام سے کروایا۔

چوہدری اختر علی کو علم تھا کہ ان میں سے کسی کا نام صحیح نہیں ہے وہ سب اپنے جعلی ناموں کے ساتھ انہیں ملتے ہیں۔

آنے والوں نے چوہدری اختر کی کھل کر تعریف کی اور اسے پہلے سے بتائے ہوئے معاوضوں سے دوگنا رقم ادا کردی۔

"آدھی رقم تمہارا انعام ہے...... اس مرتبہ ہمارے اعلیٰ افسران بہت خوش ہوئے ہیں انہوں نے بطور خاص تمہارے لئے یہ انعام کی رقم منظور کی ہے۔ آج تک اتنا بڑا انعام کسی ایجنٹ کو نہیں ملا...... اگر تم اس طرح دل لگا کر اور ہمت سے ہمارے لئے کام کرتے رہے تو تمہاری ہر منہ مانگی خواہش پوری کی جائے گی۔"

شکلا نے اس سے کہا۔

"سر! آپ حکم دیجئے...... اور پھر دیکھے......"

اختر نے تابع فرمان گدھوں کی طرح سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے چوہدری اختر ہم جس سے یاری لگالیں پھر آخر دم تک اس کی یاری نبھاتے ہیں۔ اب تمہیں کچھ بڑے کام دیئے جائیں گے جو تم نے کرنے ہیں۔ اگر کبھی خطرہ محسوس کرو تو بھاگ کر اس طرف آجانا ہم تمہیں ہر طرح کا تحفظ فراہم کریں گے اور جس لڑکی پر ہاتھ رکھو گے اس سے تمہاری شادی بھی کروادیں گے...... کیا سمجھے۔"

اس مرتبہ ورما ملک نے کہا۔

جواب میں سب شیطانوں نے مل کر قہقہہ لگایا۔

"چوہدری ہمیں اب اپنے جیسے تین چار اور شیر دل قسم کے جوان لا کر دو۔ تمہیں ہر کام پر الگ سے انعام ملے گا اور آج سے تمہارا شمار ہمارے بہت خاص آدمیوں میں ہونے لگا ہے۔ اس مرتبہ تمہارے ٹھکانے پر ہی ہمارا کوئی بندہ رابطہ قائم کرے گا اور وہیں تمہیں کام بتایا جائے گا...... خیال رکھنا کہ جو بندہ تمہیں ملے گا اسے وہاں تمہارے کمانڈر کی حیثیت حاصل ہوگی اور تمہیں اس کا ہر حکم ماننا ہوگا۔"

شکلا نے اسے بتایا۔

"ٹھیک ہے مہاراج جیسے آپ کا حکم۔"

اس نے بڑی انکساری سے گردن جھکائی۔

تھوڑی دیر تک اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد شکلا اور فوجی آفیسر شرما

وہاں سے چلے گئے۔

تم اپنا جو کام بھی دلی میں ہے وہ سمیٹ لو...... پھر سات آٹھ دن کے لیے گائیتری کے ساتھ بھارت کے جس مقام پر جانا پسند کرو وہاں چلے جاؤ...... بندوبست کر دیا جائیگا۔

ورما ملک نے کہا۔

"ٹھیک ہے مہاراج...... جیسا آپ کا حکم۔"

اختر نے معمول کے مطابق رٹا رٹایا فقرہ دہرایا۔

ورما ملک کی روانگی کے بمشکل دس منٹ بعد گائیتری وہاں آگئی۔ دونوں تھوڑی دیر بعد تیار ہو کر دہلی کی سیر کو جا رہے تھے۔

چوہدری اختر کی خدمات کا انعام اسے مل چکا تھا۔

اس کی جیبیں کرنسی نوٹوں سے بھری تھیں۔ ایک فاحشہ اس سے بندھی تھی اور اس کا ضمیر "را" کے پاس گروی پڑا تھا۔

اسی شام وہ بمبئے روانہ ہو گئے۔

آٹھ روز تک گائیتری نے اسے بندروں کی طرح ڈگڈگی پر نچایا۔ اس دوران اس نے گویا اپنی جنسیت کے سفلی علم سے چوہدری اختر کو اتنا مضبوط باندھ لیا کہ اب اس کے اشارے پر وہ آنکھیں بند کر کے جہنم میں بھی چھلانگ لگا سکتا تھا۔

دہلی واپس آنے پر جب وہ گائیتری سے الگ ہو رہا تھا اور گائیتری کامیاب اداکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے باقاعدہ ٹسوے بہا کر اسے بتا رہی تھی کہ اب وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تو چوہدری اختر کا دل چاہتا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہے وہ گائیتری کو حاصل کر کے رہے گا خواہ اس کے لیے اسے اپنے سارے گھر کو اپنے ہی ہاتھوں آگ کیوں نہ لگانی پڑے یہی ان لوگوں کی کامیابی کا راز تھا۔

"را" کی تربیت یافتہ فاحشائیں اپنے شکار کو اس طرح اپنے دام تزویر میں پھانستی تھیں اور ان کی جنسی کمزوریوں کو اتنے سائنٹیفک انداز میں ایکسپلائٹ کرتی تھیں کہ پھر ان کا شکار ان کے لئے اپنی جان سے گزر جانا باعث سعادت جاننے لگتا تھا......!!

"چوہدری صاحب اس مرتبہ آپ کو ذرا مشکل کام بھی ملے تو پلیز میری خاطر ضرور کیجئے گا میں آپ کے بغیر اب جی نہیں پاؤں گی۔"

گائیتری نے اس سے آخری بات یہی کہی تھی۔

اور......

حرص و ہوس کے اندھے چوہدری اختر نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ اس کے ایک اشارے پر اپنی جان سے بھی گزر جائے گا۔

اسے پاکستان واپس لوٹے ابھی چندروز ہی گزرے تھے جب ایک روز شام گئے اس کے دفتر کے فون پر کسی اسلم کا پیغام ملا۔فون اس نے خود ریسیور کیا تھا۔

اور......

چوہدری اختر کو ''اسلم'' سے دو باتیں کرنے کے بعد یہ سمجھ آگئی کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔انہوں نے اگلے روز شہر کی ایک تفریح گاہ میں ملنے کا پروگرام بنایا تھا۔

اسلم نے اسے اپنی شناخت بتانے کے بجائے اسے ایک مخصوص مقام پر کھڑے ہونے کے لئے کہا اور بتایا کہ وہ اسے خود ہی پہچان لے گا۔

''اسلم'' کے کورنام Cover name سے یہ فون انور کی طرف سے آیا تھا۔

✡......✡......✡

ساری رات اقبال نے کانٹوں کی سیج پر کاٹی تھی۔

وہ شب زندہ دار نہیں تھا۔

لیکن......

آج جیسے نیند کی دیوی اس سے روٹھ گئی تھی۔

اس کی نیند کے چرچے تھے۔ایک مرتبہ آنکھ لگ گئی اور کوئی سرہانے ڈھول بجاتا رہے تب بھی وہ کروٹ نہیں بدلتا تھا۔

آج نجانے کیوں اسے نیند نہیں آرہی تھی۔

وہ عموماً اپنے کوٹھے کی چھت پر سویا کرتا تھا جہاں رات کو ایسی خنکی ہو جاتی تھی کہ پنکھا لگانے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی تھی۔رات سونے سے پہلے وہ پنکھا بند کر دیا کرتا تھا اور صبح اس کی آنکھ تب کھلتی تھی جب سورج کی کرنیں اس کے بدن میں نیزے کی طرح اترنا شروع کر دیتیں۔

یوں تو ان لوگوں کی واپسی ہی بہت دیر رات گئے ہوئی تھی جس کے بعد یوں بھی اس کے جاگتے رہنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں بچتی تھی لیکن وہ جاگ رہا تھا۔

سلمیٰ اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ نیچے بڑے کمرے میں سو رہی تھی۔ان کی آمد

سے چندروز پہلے ہی اس کی والدہ نے پرانا کولر بدل کر نیا کولر لگا لیا تھا۔اسے اپنی بہن اور اس کے بچوں کی فکر ان کی آمد سے پہلے ہی دامنگیر تھی۔

اس وقت وہ لوگ کولر چلا کر چین کی میٹھی نیند سو رہے تھے۔

صبح موذن کی اذان پر بالآخر کروٹیں بدلتا اقبال اٹھ کر چارپائی پر ہی پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔اس نے بہت عرصے بعد مسجد میں جا کر نماز پڑھنے کا پروگرام بنایا تھا اس طرح ممکن تھا کہ اس کا کچھ وقت کٹ جاتا۔

والدہ حسب معمول صبح اذان کی آواز پر اٹھ کر وضو کے لئے غسل خانے کا رخ کر چکی تھی۔اقبال نے یہاں کچھ دیر بیٹھ کر انتظار کرنا ہی مناسب جانا۔کیونکہ گھر میں ایک ہی غسل خانہ تھا اور وہاں اس کی والدہ وضو کر رہی تھیں۔

ایک بات کی تو اسے اچھی طرح سمجھ آگئی تھی کہ اب اس کی راتوں کی نینداور دن کا چین حرام ہو جائیگا۔

سلمیٰ جو آگئی تھی۔

اسے کیا معلوم تھا کہ سلمیٰ اس طرح اچانک چاند بی بی کی طرح اپنی دل کی راجدھانی سے آئے گی اور بڑے ٹھسے سے اس کے دل میں براجمان ہو جائے گی کہ پھر وہ زندگی بھر اپنی نیند بھی نہیں سو پائے گا۔

اس محلے میں جہاں وہ رہتے تھے درجنوں لڑکیاں اس کی ہم عمر موجود تھیں۔

ہر دوسرے لڑکے کا ہر تیسری لڑکی سے معاشقہ چل رہا تھا۔

لیکن......کیا مجال جو کبھی اس سے متعلق ایسی کوئی خبر نکلی ہو۔وہ تو بڑا پریکٹیکل قسم کا بندہ تھا۔

والد کی وفات کے بعد کم عمری میں وہ مکمل مرد بن چکا تھا۔

وہ ایک جوان عورت کا معصوم بچہ تھا۔

خوبصورت بیوہ کی اولاد۔

لاشعوری طور پر وہ اپنی ماں کا نگہبان بن گیا تھا۔وہ اپنی ماں کو دن رات سلائی مشین کے سامنے زندگی گھسیٹتے دیکھتا تو دل ہی دل میں اس عزم کو دہراتا کہ جتنی جلد ممکن ہو وہ اپنی ماں کے دھونے دھو ڈالے گا۔

کتنے کشٹ اٹھائے تھے اس کی ماں نے اس کے لئے۔

اور......

اس نے بھی ایک لمحے کے لئے زندگی میں اس تلخ حقیقت کو نہیں بھلایا تھا۔ وہ چاہتا تو اعلیٰ تعلیم حاصل کر لیتا۔

بہت ذہین تھا وہ۔

اقبال کا شمار اپنے سکول کے ان چند گنے چنے لڑکوں میں ہوتا تھا جو اپنے سکول کا فخر ہوا کرتے تھے۔ اس نے پانچویں اور آٹھویں میں وظیفے کے امتحان پاس کئے تھے۔ میٹرک میں اپنے سکول میں ٹاپ کیا تھا اور ایف ایس سی میں بہترین نمبر حاصل کئے تھے۔

لیکن......

اب اس کے لیے اپنی ماں پر مزید بوجھ بننا ناممکن ہو گیا تھا۔

اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ماں کا کالا سر سفید ہو رہا تھا۔ خوبصورت آنکھوں میں موتیا اترنے لگا تھا اور وہ اپنی عمر سے کئی سال بڑی دکھائی دینے لگی تھیں۔

جب وہ محلے کے مختلف گھروں میں اپنی ماں کے ہاتھوں سے سلے لڑکیوں کے کپڑے دے کر سلائی کا معاوضہ وصول کرنے اور نئے کپڑے سینے کے لئے لاتا تو اس کا دل کٹ کر رہ جاتا ہر عید اور دوسرے کسی تہوار کے نزدیک تو اس کی ماں گویا مشین کے ساتھ خود مشین بن جایا کرتی تھی۔

میٹرک کے بعد جب اس نے سکول سے آنے کے بعد ٹیوشن پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا تب کہیں جا کر اس کے دل پر پڑا بھاری پتھر اپنی جگہ سے تھوڑا سا سرکا اور اس نے قدرے سکون کا سانس لیا۔

یہ اس کا عزم تھا یا ضد اسے اب تک سمجھ نہیں آئی تھی کہ نوکری حاصل کرنے کے اگلے ہی روز اس نے اپنی ماں کو سلائی کے کپڑے سینے سے منع کر دیا۔

اور...... جنت بی بی کو اس روز زندگی میں پہلی مرتبہ شدت سے احساس ہوا جیسے اس کے مرحوم خاوند نے اقبال کے روپ میں دوبارہ جنم لے لیا ہو۔

اس نے بہتیرا کہا کہ بیٹا یہ سلسلہ مکمل ختم نہ کرو...... کم از کم مجھے اپنی مرضی سے کچھ کام کرنے دو...... بہرحال مرضی اور مجبوری سے کام کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔

لیکن......

اس نے اپنی ماں کی ایک نہ سنی۔

فخر سے جنت بی بی کا سر اونچا ہو گیا۔

جنت مکانی خان صاحب بھی ایسے ہی تھے۔ اسی طرح اس کے آرام کا خیال رکھتے۔ اُسے کام کرنے سے زبردستی روک دیا کرتے۔ وہ تو اکثر جنت بی بی کو برتن دھوتے دیکھ کر آواز لگاتے۔

''اب بس بھی کرو...... کیا شادی کے برتن دھو رہی ہو۔''

''ابھی آئی...... آتی ہوں۔''

جنت بی بی جواب میں کہتی۔

لیکن......

ایک دو مرتبہ تو وہ خاموش ریڈیو سنتے رہتے پھر اچانک اپنی جگہ سے اٹھتے اور اسے بازو سے پکڑ کر اٹھا لاتے۔

''جنت بی بی...... ہم دو نفوس ہیں۔ میں اور میرا بیٹا۔ ارے اتنا کیا کام ہے جو ختم ہونے کو نہیں آرہا...... لعنت بھیجو بھئی یہ سنو نوشاد بیگم کیا کہہ رہی ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ ریڈیو کا والیوم ذرا اونچا کر دیتے۔

نوشاد بیگم کی لچک دار آواز جنت بی بی کو دہلی کے اس مکان کے پچھواڑے میں لے جاتی جہاں نیم کے ایک بڑے درخت کے نیچے بیٹھ کر وہ اور خان صاحب جو رشتے میں اس کے کزن بھی تھے گھنٹوں باتیں کیا کرتے۔

ادھر ادھر کی باتیں...... پھر کسی بزرگ کی آہٹ پر سہم کر الگ ہو جاتے۔

* * *

اب اس کے بیٹے نے بھی باپ کی ساری عادتیں اپنا لی تھیں۔ وہ بھی اس طرح اپنی ماں کو کہنے لگا تھا۔

اس نے گھر میں کام کرنے والی رکھوا دی تھی۔

کیا مجال جو اس کی ماں اس کے سامنے کوئی برتن یا کپڑا دھو پاتی۔

''بس اماں بس...... بہت کام کر لیا تو نے۔''

وہ کہتا اور ماں کو بالکل اپنے باپ کی طرح بازو سے پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے جاتا...... اسے رہ رہ کر اس بات کا افسوس ہوتا کہ ابھی تک اپنی ماں کی خواہش کے باوجود اسے بھارت کیوں نہیں لے جاسکا۔

لیکن......

زندگی ایسی الجھ کر رہ گئی تھی کہ وہ بہت کچھ چاہتے ہوئے کچھ نہ کر پاتا۔ متعدد مرتبہ

اس کے ضمیر نے ملامت کی کہ اسے اپنی ماں کی خواہش کا احترام کرنا چاہئے۔

لیکن...... مایا کے جس جال میں وہ پھنس گیا تھا اس نے اب آکٹوپس کی طرح اقبال کو جکڑنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی قابلیت نے اسے ترقی دلا کر سٹور انچارج بنا دیا اور ستم ظریفی حالات نے اس راستے پر چلا دیا تھا جس پر چلنا وہ خود پسند نہیں کرتا تھا۔

لیکن...... اسے یہ سب کچھ کرنا پڑا کیونکہ دو تین مرتبہ جب اس نے ایمانداری کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تو الٹی آنتیں گلے کو آنے لگیں۔

اب وہ خاصا ہوشیار ہو چکا تھا۔

اپنی تنخواہ سے تین گناہ رقم وہ اوپر کی آمدن سے بنا لیا کرتا تھا۔

اور...... ایک مرتبہ حرام کا چسکا لگ جانے کے بعد اس سے چھٹکارہ پانا ممکن نہیں تھا۔ اسے ایک ہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ جیسے وہ ایک ماہ کی چھٹی لے کر اپنی ماں کے ساتھ بھارت گیا اس کی موجودہ جاب باقی نہیں رہے گی یہاں کئی لالچی کتے اپنی لمبی لمبی زبانیں لٹکائے اس پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔

وہ اپنی والدہ کو اپنی مجبوری بتا کر ان سے درخواست کرتا کہ وہ اکیلی دہلی ہو آئیں۔

ایک مرتبہ تو ماموں بھی ساتھ جانے کو تیار ہو گئے لیکن جنت بی بی نہ مانی۔

اس بات کی سمجھ تو اسے بہت دیر بعد آئی کہ اس کی ماں کو اکیلے جانے کا خوف نہیں تھا بلکہ وہ اپنے بیٹے سے چند دنوں کی علیحدگی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اقبال کے ساتھ قائم رکھنے کے لئے تو ساری جوانی قربان کر دی تھی۔

لیکن......

اس روز جب خالہ ثریا ان کے ہاں آئیں اور اس نے ریلوے سٹیشن پر پہلی مرتبہ اپنی خالہ زاد سلمٰی کو دیکھا تو زندگی میں پہلی مرتبہ اسے شدت سے اس بات کا افسوس ہوا کہ اب تک اس نے اپنی ماں کی بات کیوں نہ مانی؟

اسے تو بہت عرصہ پہلے سلمٰی سے ملنا چاہئے تھا۔

سلمٰی کی ایک جھلک دیکھ کر اسے اپنے کالج کے زمانے میں پڑھی اختر شیرانی کی شاعری یاد آ گئی۔ اگر اختر شیرانی کی سلمٰی بھی ایسی ہی حسین تھی تو اسے اتنا بڑا رومانی شاعر ہی ہونا چاہئے تھا۔ اس روز جب زندگی میں پہلی مرتبہ اس کی ساری رات کروٹوں کی بھینٹ چڑھی تو اسے علم ہوا کہ وہ بھی اختر شیرانی بن گیا ہے۔

اب اسے ساری زندگی سلمٰی کے لئے شاعری کرنا تھی۔

وہ جو سراپا غزل تھی۔ جس کی ایک جھلک نے اس کی راتوں کی نیند حرام کر دی تھی

اس سلمٰی سے وہ اتنا قریب ہو کر بھی اتنا دور رہا۔

بیس منٹ تک انتظار کرنے کے بعد جب اسے غسل خانے سے آوازیں آنا بند ہو گئیں تو وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا تا کہ غسل خانے کا رخ کرے۔ سیڑھیوں کے خاتمے پر بنے چھوٹے سے چبوترے سے اس نے جیسے ہی دوسرے کمرے کی طرف مڑنے کا ارادہ کیا۔

اسے یوں لگا جیسے اچانک وہ پتھر کا ہو گیا ہو۔

جیسے اس پر کسی نے اسم اعظم پڑھ کر پھونک دیا ہو۔

اس کے سامنے سلمٰی کھڑی تھی۔

اس کی نیند سے بوجھل غزالی آنکھوں میں تیرتے سرخ ڈورے بہت دور اندر تک اسے اپنے کلیجے میں اترنے کا احساس ہوا۔

''سلاما علیکم''

خاموشی کا طلسم سلمٰی نے ہی توڑا۔ اس نے بڑے روایتی انداز میں اپنے دائیں ہاتھ کو قریباً ماتھے تک لا کر سمراٹ اکبر اعظم کے سامنے کورنش بجا لاتے ہوئے سلام کیا...... اقبال کے سامنے مغل اعظم کا دربار سج گیا۔

وہ شہزادہ جہانگیر بنا ایک طرف بیٹھا تھا اور انارکلی نے جو آج رات ہی ایران سے آئی تھی اسے خاندانی اور نہایت مودب کنیزوں کی طرح آداب کہا تھا۔

''آپ''

بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

اقبال کو احساس تھا کہ وہ اس کے علاوہ ایک لفظ بھی ادا نہیں کر پائے گا۔ اس کے پاس کہنے کو تو بہت کچھ تھا لیکن رعب حسن نے زبان گنگ کر دی تھی۔

''جی...... بس ہم صبح جلدی اٹھ جاتے ہیں۔ اماں کے ساتھ نماز پڑھتی ہوں ناں......''

سلمٰی نے جو خود بھی عجیب و غریب کیفیات کا شکار ہو رہی تھی اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے اپنے جلدی بیدار ہونے کا سارا الزام اپنی اماں کے سر دھر دیا۔ پھر وہ اس سے مخاطب ہوئی۔

''اور آپ......''

اس اچانک سوال نے اقبال کو گڑبڑا دیا۔

یوں جیسے کسی نے اس کے دل کا چور پکڑ لیا ہو۔ اس کا جی تو چاہا کہ سلمٰی سے کہہ دے وہ کبھی صبح کی نماز کے لئے نہیں اٹھتا وہ تو ساری رات سو نہیں پایا۔ ساری رات اس کے

سپنے دیکھتا رہا جواب اس کے سامنے سپنوں کی شہزادی بنی کھڑی تھی۔

لیکن......

وہ ایسا کچھ کہہ نہیں سکا۔

''میں مسجد جا رہا تھا۔''

اس نے صریحاً جھوٹ بولا اور خلافِ معمول واقعی غسلخانے کی طرف جانے کے بجائے مسجد کا رخ کیا جہاں نمازی اسے دیکھ کر حیران ہی رہ گئے۔

''شاباش بیٹا......تم نے اپنے باپ کی سنت کو زندہ کر دیا۔ مرحوم خان صاحب سب سے پہلے مسجد میں داخل ہونے والے نمازیوں میں سے تھے......اللہ غریق رحمت کرے بیٹا تیرا باپ بڑا نیک آدمی تھا۔''

پیش امام نے اسے پہچان کر اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

نماز کی ادائیگی کے دوران اس کا دل بھر آیا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ اسے اپنے والد کی یاد آج بہت عرصے بعد آئی تھی۔

والد کی وفات پر اس کی عمر بمشکل دس سال تھی لیکن باپ کا سراپا کبھی اس کے لاشعور سے مٹ نہیں پایا تھا۔

بڑے بوجھل دل لیکن نہ سمجھ آنے والے جذبات کے ساتھ وہ گھر واپس لوٹا۔

دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی اس کی ماں نے ''میرا لعل'' کہہ کر اسے سینے سے لگا لیا۔

''یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر کہ تو نے بیٹے کو باپ کے راستے پر چلا دیا۔ اے ثریا بہن تمہارا دم قدم سلامت رہے۔ ارے تمہاری آمد نے تو میری دنیا ہی بدل کر رکھ دی۔''

انہوں نے بیٹے کی بلائیں لیتے ہوئے بہن کو دعا دی۔ اس کی آمد واقعی جنت بی بی کے لئے بڑا نیک شگون تھی۔

اپنی ماں کے ان ریمارکس پر اقبال دل ہی دل میں خجالت محسوس کر رہا تھا یہ تو اس کا دل ہی جانتا تھا کہ اسے آج سالوں بعد علی الصبح کس نے مسجد کا راستہ دکھا دیا ہے۔

✡......✡......✡

نماز پڑھ کر وہ گھر آیا۔ ثریا خالہ بھی نماز سے فارغ ہو گئی تھیں البتہ انور ابھی تک سو رہا تھا اس کو ناشتہ تیار ہونے کے بعد اس کی ماں نے گہری نیند سے بیدار کیا اور انور اس طرح ہڑبڑا کر اٹھا جیسے اچانک ڈراؤنا خواب دیکھنے سے اس کی آنکھ کھلی ہو۔

آج چھٹی کا دن تھا......

پہلے ہی روز وہ اپنی خالہ اور اس کے بچوں کو اپنے شہر کی سیر کروانے لے گیا۔ اس درمیان اس کے لئے انور کا رویہ بڑا عجیب اور نہ سمجھ آنے والا رہا۔ وہ بظاہر ان کے ساتھ چل رہا تھا لیکن یوں لگتا تھا جیسے اس کا جسم یہاں اور دماغ کہیں اور رہا ہو۔

اقبال کو سمجھ نہ آ سکی کہ وہ جس سڑک سے بھی گزرتے انور اس کا نام اور اس سے پھوٹنے والے راستوں کی تفصیل اس سے کیوں دریافت کرتا رہا۔

''بھیا آپ کو کیا جغرافیہ کا امتحان دینا ہے۔''

بالآخر اس کے سوالات سے تنگ آ کر سلمٰی نے ہی کہا۔

''ارے نہیں سلمٰی......بس مجھے تو کریز ہے برصغیر کے تمام بڑے شہروں کے راستے از بر کرنے کا۔ اقبال بھائی آپ برا مت مانیے میری یہ بری عادت ہے۔ آپ جب دہلی آئیں گے تو دیکھئے گا میں انڈیا کے جن بڑے شہروں میں جاتا ہوں وہاں ریلوے سٹیشن، بسوں کے اڈے، ویگنوں کے اڈے اور ایئرپورٹس وغیرہ کی تفصیلات نوٹ کر کے رکھتا ہوں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان شہروں میں فلاں علاقے سے فلاں علاقے کی طرف جانے کے لیے کون سی بس ملے گی اور کرایہ کتنا ہوگا۔''

انور نے خود ہی اس سے کہہ دیا۔

''ارے سلمٰی آپ برا کیوں مان گئیں۔ بھئی یہ تو اچھی بات ہے۔ میں اقبال بھائی کو اپنے شہر کا ٹورسٹ میپ ہی لے دوں گا۔'' اقبال نے سلمٰی کا موڈ بدلنے کے لئے کہا۔

''نہیں اقبال بھائی......اتنے سستے میں آپ کی جان نہیں چھوٹے گی۔ آپ کو کئی جگہ میرے ساتھ جانا ہوگا۔ ان ٹورسٹ نقشوں کو میں نہیں مانتا۔''

اس نے قہقہہ لگایا۔

اور......

اقبال کو بادل نخواستہ اس کے ساتھ ہنسنا پڑا۔

سلمٰی نے البتہ اپنا منہ دوسری طرف کر لیا تھا۔

شام ڈھلے سب گھر واپس لوٹ آئے جہاں اقبال کی والدہ شدت سے ان کی منتظر تھیں۔ اس دوران انہوں نے معمول کے مطابق اپنے کاغذات کا اندراج بھی مقامی دفتر میں کروا دیا تھا۔

✡......✡......✡

سلمیٰ

اگلے روز اقبال کی دفتر روانگی سے کچھ دیر بعد ہی انور باہر جانے کو تیار تھا۔

''کہاں جارہے ہو بیٹا۔''

جنت بی بی نے پوچھ لیا۔

''خالہ ذرا باہر کی ہوا کھانے جارہا ہوں۔''

انور نے کہا۔

''ٹھہرو میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ کہیں راستہ بھول گئے تو۔''

بے چاری خالہ نے ہمدردی جتائی۔

''ارے نہیں خالہ آپ کیوں تردد کرتی ہیں۔ میں آپ کو کیا بچہ لگتا ہوں۔ بس دوپہر کے کھانے تک آجاؤں گا۔ ذرا گھوم پھر کر آپ کا شہر دیکھ لوں...... یہاں تو بیٹھے بیٹھے بور ہو جاؤں گا۔'' اس نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

''کہیں نہیں جاتا بہن یہ کمبخت مارا...... وہاں بھی اس کا یہی حال ہے۔ اس لڑکے کو تو ایک پل آرام نہیں کبھی یہاں کبھی وہاں......''

خالہ ثریا نے اپنی بہن کو مطمئن کیا۔

انور باہر آگیا۔ اس نے اگلے روز شہر سے متعلق خاصی معلومات حاصل کرلی تھیں۔

اب وہ ایک پر رونق بازار کی طرف جارہا تھا۔ اس نے پہلے روز ہی مقامی لباس شلوار قمیص پہن لی تھی جو اس کی خالہ نے اس کی آمد سے پہلے ہی اس کے لئے سلوا کر رکھی تھی اور یہاں وہ اتنے اعتماد سے گھوم رہا تھا جیسے اس شہر میں پلا بڑھا ہو کیا مجال جو اس کے کسی بھی انداز سے کچھ اجنبیت ٹپکتی ہو۔

یہ بڑا پُر رونق بازار تھا۔ چہل پہل تھی اور بازار کھلنے کے بمشکل ایک گھنٹہ بعد ہی

یہاں کھوئے سے کھوا چھل رہا تھا۔ انور نے بھی انسانوں کے اس سمندر کے درمیان رینگتے ہوئے سارے بازار کا چکر لگایا اس طرف آنے اور جانے کے تمام راستے خود گھوم پھر کر دوراہ گیروں سے پوچھ کر دریافت کئے اس نے خصوصاً ان تنگ و تاریک گلیوں کا جائزہ لیا تھا جس کی طرف یہاں کے مقامی مکینوں کے سوا اور کسی کا بھی دھیان نہیں جاتا ہوگا اور قریباً دو گھنٹے اس طرح گھوم پھر کر ضائع کرنے کے بعد اب اسے یہاں کا ایک ایک راستہ اور گلی محلے از بر ہو چکے تھے۔

اسے اب اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ کہاں کیا کرسکتا ہے؟

اچانک آن پڑنے والی افتاد کی صورت میں فرار کی کون سی راہ اختیار کرسکتا ہے؟

اور......

سب سے بڑھ کر یہ کہ کس جگہ تخریب کاری سے زیادہ سے زیادہ تباہ کن نتائج حاصل ہوسکتے ہیں۔

اس بازار میں دو گھنٹے گزارنے کے بعد اس نے ایک نزدیکی کیفے سے چائے پی۔ لوگوں کی باتیں سنیں۔ حکومت کے خلاف ان کی نفرت کا اندازہ لگایا۔

ان کے مسائل کو سمجھا۔

اور......

اپنی میز کے گرد بیٹھے دو بوڑھے اور مایوس پاکستانیوں کی ہاں میں ہاں ملانے کے بعد بڑے اطمینان سے کاؤنٹر پر بل ادا کر کے باہر آگیا۔ اس کی اگلی منزل تھی اس شہر کا سب سے بڑا اور جدید جنرل ہسپتال......!!

☼......☼......☼

اس کا نام شرکت جنرل ہسپتال تھا۔

شرکت جنرل ہسپتال تھا تو پرائیویٹ...... لیکن یہ ایک خیراتی ہسپتال تھا جسے پیچیدہ اور خطرناک امراض کی اس ملک میں بہترین علاج گاہ سمجھا جاتا تھی۔ جدید ترین آلات جراحی، بہترین لیبارٹری اور ماہرین امراض رکھنے والا یہ ہسپتال شاید برصغیر کا بہترین ہسپتال تھا جس کو کسی بھی طرح یورپ اور امریکہ کے جدید سہولیات کے حامل ہسپتال سے کم نہیں کہا جاتا تھا۔

یہ ہسپتال ایک سمبل تھا۔

انسانی عزم و ہمت اور لازوال ارادوں کے حامل انسان کی محنتوں کا ثمر......!!

اس کے پس منظر میں اس کی تعمیر کے پیچھے جس آہنی ارادوں کے حامل شخص کی شخصیت موجود تھی وہ تھا اس ملک کا بین الاقوامی شہرت کا حامل ایک کھلاڑی جسے ساری دنیا ارسلان کے نام سے جانتی تھی۔

ارسلان اپنی ذات میں ایک انجمن تھا۔

اس نے اپنے کھیل میں ہی خود کو نہیں منوایا بلکہ اپنے عزم سے وہ کر دکھایا جو اب تک اس ملک میں ناممکن سمجھا جاتا تھا۔ اس نے اعلان کیا وہ ایک ایسا ہسپتال بنانے جا رہا ہے جس کا مقابلہ دنیا کے کسی بھی بڑے ہسپتال سے کیا جا سکتا ہے۔ جہاں پاکستان کے غریب بے بس اور ناکس لوگوں کا مفت علاج ہوگا اور ایسے لوگ جو خطرناک عوارض کے ہاتھوں محض اس لئے مرجاتے ہیں کہ ان کے پاس دنیا کے بڑے بڑے ہسپتالوں میں جا کر علاج کروانے کے لئے پیسے نہیں ہوتے وہ ان ناداروں کا علاج اپنے ہسپتال میں کرے گا۔

سسکتی اور دم توڑتی انسانیت کے لئے وہ امید ایک شمع بن کر جلا اور اس کی روشنی دیکھتے ہی دیکھتے ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیل گئی۔ اپنے کھیل سے اس نے ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔

لیکن......

اب بھی وہ اپنے کھیل میں دنیا کا بہترین کھلاڑی مانا جاتا تھا۔

ساری دنیا میں موجود اس کے پرستار اس کے اس عظیم منصوبے میں حصہ دار بن گئے۔

دنیا کے کونے کونے سے اس کے ہسپتال کے لیے امداد جمع ہونے لگی۔ عطیات اکٹھے ہونے لگے۔ امدادی شو منعقد ہوئے۔ خیراتی ڈنر دیئے گئے۔ ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک بچوں، بوڑھوں، جوانوں، عورتوں نے اس کے ہسپتال کے لئے امداد جمع کرنی شروع کی۔

اور......

دیکھتے ہی دیکھتے ناممکن کو اس نے ممکن میں بدل دیا۔

اس نے وہ کر دکھایا جس کا کوئی خواب ہی دیکھ سکتا تھا۔

اس نے ساری دنیا کو بتا دیا کہ اس ملک کے حکمران ضرور کرپٹ اور بددیانت ہیں...... لیکن...... یہاں کی عوام بہت عظیم ہے۔ وہ کسی بھی ناممکن کو ممکن بنانے کی ہمت رکھتے ہیں اور وہ کچھ کر سکتے ہیں جس کا ترقی یافتہ ممالک کے عوام نے کبھی تصور بھی نہ کیا ہو۔

اس نے ساری دنیا کو بتا دیا کہ اس کے ملک کے عوام سے متعلق جو بے بنیاد

پراپیگنڈہ اور پھر پراپیگنڈہ کی بنیاد پر جو رائے قائم کی گئی ہے وہ غلط اور بے بنیاد ہے۔ یہ لوگ نہ بددیانت ہیں، نہ خائن......

یہ ڈاکو ہیں نہ لٹیرے......

یہ انسانیت کے دشمن نہیں، دوست ہیں دوست۔

افسوس ان پر مسلط کچھ درندہ نما انسانوں نے، کچھ بھیڑیوں نے جو بظاہر انسانوں کا روپ دھار کر ان کی قسمتوں کے مالک بن گئے ہیں انہیں ساری دنیا کے سامنے رسوا کر کے رکھ دیا ہے۔

ان سے منسوب تمام لعنتیں دراصل ان کے حکمرانوں کا کریڈٹ ہیں۔ وہ تمام گالیاں جو اس ملک کے عوام کو دی جاتی ہیں اس کے حق داران کے حکمران اور ارباب اختیار ہیں۔ یہ بے چارے نہیں۔

یہ تو معصوم، سیدھے سادے اور محنتی لوگ ہیں۔

افسوس ان کی معصومیت کو، ان کے سیدھے اور بھولے پن کو، ان کی خوبیوں کو ان کے حکمرانوں نے کیش کروایا اور اپنے پیٹ کو جہنم کی آگ سے بھرنے لگے۔ ان کی محنتوں کی کمائی کو لوٹ کر دولت کے انبار جمع کرنے لگے۔ ان کے نام پر دنیا بھر سے آنے والی امداد، گرانٹ، قرض اور دوسری اشیاء کو حلوائی کی دکان اور نانا جی کی فاتحہ کے مصداق سمیٹتے گئے اور مسلسل سمیٹ رہے ہیں۔

افسوس ان بے چاروں کو اپنے حکمرانوں کی بداعمالیوں کا ذمہ دار ٹھہرایا جا رہا ہے۔

ارسلان کے اس کارنامے نے ارباب اختیار کی راتوں کی نیند حرام کر دی۔ انہوں نے سوچا اگر ارسلان نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا تو کہیں وہ بے بس اور جبر کے شکنجوں میں جکڑے مقہور اور مظلوم عوام کی امیدوں کا مرکز ہی نہ بن جائے۔ اس مفروضے نے ان کی راتوں کی نیند اور دنوں کا چین حرام کر دیا۔ انہوں نے اپنے گماشتوں کو چوکس کیا۔

اور......

اس کے خلاف ایک طوفان بدتمیزی کھڑا کر دیا۔

اس کی ذات اور اس کے ہسپتال کو ہدف تنقید بنایا جانے لگا۔

ماضی کے حوالے سے گڑے مردے اکھاڑ کر اسے طعن و تشنیع کے تیروں سے چھلنی کیا گیا۔

لیکن......

اس کا عزم نا قابلِ تسخیر رہا۔

اس کے ارادے اٹل تھے۔

وہ ان سازشوں اور سازشیوں کے خلاف پہاڑ کی طرح کھڑا ہو گیا۔

عوام کی مدد سے اس نے شرکت ہسپتال کو چلا کر دکھا دیا۔

☆......☆......☆

''را'' کے پاکستانی ڈیسک نے ہسپتال کے حوالے سے ہونے والی تمام کارروائی کی تفصیلات اکٹھی کی تھیں۔ ورائے سوامی نے جو اس ڈیسک کا انچارج اور بلا کا شیطانی ذہن رکھنے والا تھا۔ ارسلان اور حکومت کے درمیان ہونے والی اس کشمکش کو اپنے حق میں کیش (Cash) کروانے کا منصوبہ بنالیا تھا۔

جس روز ارسلان کی طرف سے یہ بیان بین الاقوامی اخبارات میں جاری ہوا کہ حکومت نے اس کے ہسپتال جو اس ملک کے غریب اور نادار مریضوں کے لیے امید کی علامت بن چکا ہے اور جسے یہاں کے عوام نے بغیر کسی بیرونی سہارے کے اپنے خون پسینے کی کمائی سے تعمیر کیا ہے، اس ہسپتال کو اس کے ملک کے ارباب بست و کشاد نے اپنی انا کا مسئلہ بنالیا ہے۔

وہ نہیں چاہتے کہ اس ملک کے غریب عوام کو مفت طبی سہولتیں میسر آئیں۔ وہ اس ہسپتال کو بند کروانے پر تل گئے ہیں۔ ہسپتال کو چلانے کے لئے ملنے والی امداد کو روک رہے ہیں اور اس کے لئے اتنے بے پناہ مسائل پیدا کئے جا رہے ہیں کہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جائے۔

لیکن......

وہ بھاگے گا نہیں۔

وہ ڈٹ کر ان سازشوں کا مقابلہ کرے گا اور شرکت ہسپتال کو چلائے رکھے گا اس مشن کو بند نہیں ہونے دے گا۔

اس نے کھل کر حکمرانوں پر الزام لگایا کہ وہ اس عظیم منصوبے کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور اس کے لئے رکاوٹیں کھڑی کر رہے ہیں۔ اسے تباہ کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں جیسے ہی اس بیان کی گونج ''را'' کے پاکستان ڈیسک پر سنائی دی وہاں مٹھائیاں تقسیم ہونے لگیں۔ ورائے سوامی نے اس روز ''جام فتح'' منتخب کیا۔ اس نے اپنے ماتحتوں کے جام سے

جام ٹکراتے ہوئے انہیں مبارکباد دی کہ اب اس ملک پر ایک اور کاری ضرب لگانے کا موقعہ ملنے والا ہے...... انہوں نے اس صورت حال کا بھرپور فائدہ اٹھانے کا منصوبہ بنالیا تھا جس کے لئے بڑی شاندار پلاننگ کی گئی تھی۔

وہ ارسلان اور حکومت کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج کو اتنا وسیع کر دینا چاہتے تھے کہ پھر کوئی اسے پاٹ نہ سکے۔

اور......

اس کی آڑ میں ملک میں تخریب کاری کے ذریعے تباہ کاری کو رواج دے کر حکومت کا تختہ الٹانے کی فکر کر رہے تھے۔

انہوں نے ارسلان کے خدشے کو یقین میں بدلنے اور عوام کو حکومت سے مکمل گمراہ اور بدظن کرنے کے لئے تباہ کاری کا ایک خوفناک منصوبہ تیار کرلیا تھا۔

اور......

اس منصوبے پر عملدرآمد کا جائزہ لینے کے لئے انور اب شرکت ہسپتال کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے یہاں تک پہنچنے کے لئے معمول کی ٹرانسپورٹ حاصل کی تھی اور ویگن کے ذریعے یہاں پہنچا تھا۔

ہسپتال کے آؤٹ ڈور تک جانے اور واپس آنے سے اسے کون روکتا۔ یوں بھی یہ ہسپتال تھا جہاں جان بلب مریضوں کو لایا جاتا تھا کوئی فوجی چھاؤنی تو تھی نہیں کہ اس کی آمدورفت کو چیک کیا جاتا۔ کوئی ریکارڈ رکھا جاتا۔ یہی باور کیا گیا کہ وہ بھی یہاں داخل مریضوں کے لواحقین میں سے کوئی ایک ہوگا کسی نے اس کی نقل و حرکت کا نوٹس نہ لیا۔

ہسپتال میں اس نے اطمینان سے آدھا گھنٹہ گزارا اور یہاں کے معمولات کا بھرپور جائزہ لے کر واپس لوٹ آیا۔ اب وہ ایک ٹیلی گراف آفس سے لندن میں فون کر رہا تھا۔

لندن میں ''را'' کے کور آفس (Cover Office) کو اس نے اپنے بحفاظت پہنچنے اور ''ٹارگٹ'' کا سروے مکمل کرنے کی رپورٹ دی اور بتایا کہ اب وہ جلد ہی انہیں روبہ عمل ہونے کی تاریخ سے مطلع کرے گا۔

یہ ''کال'' اس نے چونکہ پبلک کال آفس سے کی تھی جہاں وہ اکیلا ہی نہیں درجنوں لوگ غیر ممالک میں اپنے عزیز و اقربا کو فون کرنے آتے تھے۔ اس نے بھی معمول کے مطابق ایک بین الاقوامی نمبر دے کر دس منٹ کی کال بک کروائی۔ اپنا نمبر آنے پر اسے ایک کونے

میں لگے فون باکس کی طرف روانہ کردیا گیا۔ اس بوتھ میں وہ اکیلا تھا۔ دروازہ باہر سے بند تھا لیکن وہ کھلا بھی ہوتا تو کچھ فرق نہیں پڑنے والا تھا کیونکہ اس نے یہاں معمول کی زبان میں بات کی تھی اور بڑی سادگی سے اپنی اب تک کی ساری کارروائی دوسری طرف پہنچا دی تھی۔

اس کی ساری گفتگو لندن میں موجود ''را'' کے Cover Office میں ریکارڈ ہونے کے بمشکل پانچ منٹ بعد دہلی میں ''را'' کے ہیڈ آفس میں اور وہاں سے اس کے مقامی ''باس'' تک پہنچ گئی تھی۔

یہاں سے فارغ ہو کر اس نے چوہدری اختر کو فون کیا اور اسے اپنا کوڈ نام بتا کر اگلے روز ملاقات کے لئے پہلے سے اپنے ذہن میں منتخب کردہ ایک تفریح گاہ میں طلب کر لیا۔

اب وہ مطمئن ہو کر گھر واپس جا رہا تھا۔

✡......✡......✡

''ویل ڈن ورما...... ویل ڈن۔''

فون بوتھ پر رکھنے کے بعد شکلا نے ورما کی طرف تحسین آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔ اس کی داد کو ورما ملک نے مسکرا کر نذر گزاری تھی۔ شکلا کو یہ کال ہیڈ آفس سے آئی تھی جن کی اطلاع کے مطابق ان کا بندہ اپنے سامان سمیت ''ٹارگٹ ایریا'' میں پہنچ چکا تھا۔

شکلا جانتا تھا کہ یہ انور سے متعلق اطلاع تھی۔

اسے اب تک یہی دھڑکا لگا تھا کہ کہیں اس کے سامان میں جانے والا ''ہائی ایکسپلوسو'' پکڑا ہی نہ جائے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو انہیں بڑی تنگی کا سامنا کرنا پڑتا۔

لیکن......

ورما ملک کی چال کامیاب رہی۔

اس نے واقعی انور پر محنت کی تھی جس کا نتیجہ ان کی مرضی کے مطابق نکلنے لگا۔

''سر۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن مبارکباد ابھی مجھے نہ دیجئے۔ ابھی مجھے انتظار ہے ان لمحات کا جب میرا یہ شیر دونوں بڑے کارنامے انجام دے گا۔ میں آپ کو پہلے ہی کہتا رہا ہوں کہ سر یہ پاکستانی اتنے عقل مند نہیں اور ان کی ''کاؤنٹر'' انٹیلی جنس اس کی تو بات ہی نہ کیجئے...... سر جب آپ کہیں گے بارود کے بھرے ٹرک سرحد کے پار پہنچا دوں گا اور کسی کے کانوں پر جوں نہیں رینگے گی۔''

ورما ملک نے مرغے کی طرح گردن پھلا کر بڑی نفرت سے کہا۔

شکلا جواب میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔

وہ جانتا تھا کہ ورما ملک اس وقت ہوا میں اڑ رہا ہے۔

لیکن......

اس تلخ حقیقت کا اسے احساس تھا کہ ورما ملک کے اندازوں کے برعکس پاکستانیوں کی ''کاؤنٹر انٹیلی جنس'' بڑی سمارٹ ہے۔ اب تک ان کے درجنوں ایجنٹ پکڑے جا چکے تھے۔ یہ تو ورما ملک کی خوش قسمتی تھی کہ اس کا ''مال'' خیریت سے دوسری طرف پہنچ گیا۔

لیکن......

ایسی ایک کامیابی کو مثال نہیں بنایا جا سکتا تھا۔

یوں بھی وہ عملی انسان تھا۔

وہ تھیوری سے زیادہ پریکٹیکل کا قائل تھا۔

جب تک سرحد پار سے پازیٹو رزلٹ نہ ملتا وہ کسی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ورما ملک کا شمار اس کے بہترین ماتحتوں میں ہوتا تھا اس نے انور پر بہت محنت کی تھی اور ابھی تک پازیٹو رزلٹ ہی مل رہے تھے۔

درائے سوامی نے شکلا کو اس ڈیسک کا انچارج بناتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اسے مکمل ''فری ہینڈ'' دے رہا ہے۔ اس امید پر کہ شکلا اس کے لئے بہترین نتائج حاصل کرے گا۔ شکلا کو بطور خاص وہ لوگ کشمیر سے پنجاب میں لائے تھے۔ اس کا شمار ''را'' کے ان افسران میں ہوتا تھا جو اس ادارے کا فخر سمجھے جاتے تھے۔

''ویل مسٹر ملک...... تم خود تمام معاملات کی براہ راست نگرانی کرو۔ شرکت ہسپتال والا ''پراجیکٹ'' کامیاب رہا تو یقین جانو دہلی میں تمہارے ساتھ ہمارا بھی شاندار استقبال ہوگا۔ بصورت دیگر تم درائے سوامی کو تو جانتے ہی ہو۔ اپنی فطرت میں وہ انتہائی کمینہ اور مکار شخص ہے جس سے کوئی بھی ماتحت بدترین کی توقع رکھ سکتا ہے۔''

اس نے ورما ملک کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

''سر! آپ صرف ایک ہفتہ اور دیکھ لیجئے۔ اس کے بعد شاید آپ کے ذہن میں موجود تمام خدشات غلط ثابت ہو جائیں۔''

اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

ایک پھیکی سی مسکراہٹ شکلا کے ہونٹوں پر بھی آئی۔

'' وش یو آل دی بیسٹ "Wish you all the best

اس نے ورما ملک کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

یہ اس کی طرف سے میٹنگ ختم ہونے کا اشارہ بھی تھا۔

ورما ملک تھوڑی دیر بعد ہی جیپ سے اس سرحدی علاقے میں واقع ''را'' کے اس ''مانیٹرنگ ڈیسک'' کی طرف جا رہا تھا جسے انہوں نے فی الوقت اپنے مقامی ہیڈ کوارٹر میں تبدیل کر لیا تھا جہاں وہ اس مشن سے متعلق تمام معلومات جمع کر رہے تھے جس مشن پر انہوں نے انور کو روانہ کیا تھا۔

جس گھناؤنے مشن کے لئے انہوں نے اختر چوہدری جیسے آستین کے سانپ پال رکھے تھے، اسے اب شدت سے دوسری طرف سے کسی اچھی خبر کا انتظار تھا جس کے بعد اس کے عہدے میں ترقی ہو جاتی اور اس کے فنڈز بڑھ جاتے۔

اور......

سب سے بڑھ کر یہ کہ یورپ کے عیاشی ٹورز کے لئے اسے چھٹی مل جاتی۔ عین ممکن تھا اس کی دیرینہ خواہش کے احترام میں اسکے اس کارنامے کا انعام ''ابراڈ پوسٹنگ'' کی صورت میں مل جاتا یوں بھی ''را'' کا یہ اصول تھا کہ وہ اپنے کسی بھی ایجنٹ کی کامیابی کی صورت میں اس کے ہینڈلر Handler کو تبدیل کر دیا کرتے تھے۔

شام گئے جب وہ گھر لوٹا تو اقبال گھر میں موجود تھا۔

'' آپ کہاں غائب تھے انور بھائی۔''

اس نے چھٹتے ہی دریافت کیا۔

'' یار بس تمہارا شہر دیکھ رہے ہیں۔ بھئی تم مصروف آدمی ہو اب تمہیں بار بار زحمت دینا اچھا تو لگتا نہیں۔''

اس نے کمال مکاری سے مسکراتے ہوئے کہا۔

'' اگر آپ اس طرح سہولت محسوس کرتے ہیں تو آپ کی مرضی ورنہ یقین جانئے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی اور نہ ہی میں تکلف کر رہا ہوں۔''

اس نے سلمٰی کی طرف دیکھ کر جواب دیا جو خود صبح سے پریشان تھی۔

'' بھیا کچھ بتا کر جایا کیجئے ناں...... آپ کی وہی دہلی والی عادتیں رہیں۔ ارے بھئی

یہ اجنبی شہر ہے۔ اماں صبح سے پریشان ہیں اور آپ کو پرواہ نہیں۔''

اس نے قدرے ناراضگی سے کہا۔

'' ہوگا تمہارے لئے اجنبی ہمارا تو اپنا شہر ہے۔ پاکستان بھی اس طرح ہمارا ملک ہے جیسے انڈیا۔'' اس نے لاپرواہی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لوگ کھانے پر اکٹھے تھے۔

جس کمرے میں ان کا سامان رکھا تھا اور جو اب ایک طرح کا ''گیسٹ روم'' بن چکا تھا۔ وہاں تین الماریاں موجود تھیں جن میں سے ایک پر انور نے قبضہ کر لیا تھا اور اس میں اپنا سامان رکھ کر تالا بھی لگا دیا تھا۔

گھر کا کوئی فرد اس کا نوٹس نہ لے سکا۔

اقبال نے تو اس پر غور ہی نہ کیا اور سلمٰی اور اس کی والدہ کو اپنے بھائی اور اپنے بیٹے کی عادت کا علم تھا وہ اس طرح دہلی میں بھی اپنی الگ الماری کو تالا لگا کر رکھنے لگا تھا۔

سارے دن کی بھاگ دوڑ نے انور کو تھکا دیا تھا اس لئے وہ رات کا کھانا کھانے کے تھوڑی دیر بعد لمبی تان کر سو رہا۔

یوں بھی اس کا ''ہوم ورک'' آج مکمل ہو گیا تھا اور اب وہ قدرے مطمئن ہو چکا تھا۔ گھر کے تمام لوگ۔ ٹی وی کے سامنے بیٹھے تھے جب اقبال کوٹھے پر آ گیا۔ وہ عموماً ٹی وی پروگراموں سے بور ہو جایا کرتا تھا۔ ابھی اسے کوٹھے کے ایک کونے میں دھری چارپائی پر بیٹھے چند منٹ ہی گزرے تھے جب سیڑھیوں میں آہٹ پر وہ چونکا۔ تھوڑی دیر بعد سلمٰی اس کے سامنے اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ موجود تھی۔

'' آپ اوپر چلے آئے۔ ہماری وجہ سے بور تو نہیں ہو رہے۔''

اس نے اچانک ہی اقبال سے پوچھا۔

'' ارے نہیں بھئی ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میں زیادہ ٹی وی کے سامنے نہیں بیٹھ سکتا۔''

اقبال نے جو ابھی تک اس کے سراپے میں کھویا ہوا تھا چونک کر کہا۔

سلمٰی بڑی بے تکلفی سے سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔

'' انور بھائی کی کسی بات کا برا مت مانئے۔ اس کی پر اسرار عادتوں نے ہمیں بھی بہت پریشان کر رکھا ہے۔ اس طرح وہ گھر سے اچانک تین تین چار چار روز کے لئے غائب ہو جاتے ہیں اور واپس آنے پر بڑے اطمینان سے کہہ دیتے ہیں کہ دفتر کے کام سے اچانک

جانا پڑا...... پہلے تو فون کر کے بتانے کی زحمت ہی نہیں کیا کرتے تھے اب کم از کم اتنا ہے کہ فون پر روانگی کی اطلاع دے دیتے ہیں۔ بس ان کی عادتیں نرالی ہیں۔ پہلے تو ایسے نہیں تھے۔ یہ ایک سال سے جب ریلوے میں ملازم ہوئے ہیں اس طرح کی حرکتیں کرنے لگے ہیں۔"

اس نے یہی سمجھا تھا کہ اقبال جیسے انور کی وجہ سے ناراض ہے۔

"ارے سلمٰی آپ کس چکر میں پڑ گئیں۔ میرے ذہن میں دور دور تک ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ تو بلکہ بہت اچھی عادت ہے ان کی...... دوسروں پر انحصار کرنا کیا ضروری ہے...... اگر وہ خود اس طرح بہتر انجوائے کر سکتے ہیں تو اچھی بات ہے۔ ویسے بھی وہ ہم دونوں سے بڑے ہیں...... ممکن ہے اس طرح وہ زیادہ اچھا محسوس کرتے ہوں۔"

اقبال نے کہا۔

"شکر ہے ورنہ میں تو......"

وہ ادھورا فقرہ کہہ کر اقبال کی طرف دیکھنے لگی جس کو سلمٰی کی آنکھیں براہ راست اپنے دل میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔

"کیسا لگا ہمارا ملک......"

اس نے سلمٰی کو بٹھائے رکھنے کا جواز ڈھونڈا۔

"بہت اچھا...... اقبال صاحب آپ بہت خوش قسمت ہیں جو آپ نے اس ملک میں جنم لیا۔ کاش میں آپ کو بتا سکتی کہ ہم وہاں کیسی زندگی جیتے ہیں۔ کاش......"

وہ کچھ اداس سی دکھائی دینے لگی تھی۔

"آپ لوگ پاکستان ہی کیوں نہیں چلے آتے۔"

اقبال نے اچانک ہی کہا۔

اور......

سلمٰی کے جواب نے اس کے دل کی دھڑکن بے قابو کر دی۔

"آپ رکھ لیجئے ناں ہمیں...... مت جانے دیجئے واپس۔"

سلمٰی نے کہا اور وہ اس کی طرف دیکھے بغیر مسکراتی ہوئی قریباً بھاگ کر نیچے گئی تھی۔

شاید اس کے منہ سے یہ بات بے اختیار ہی نکل گئی تھی۔

جب تک اقبال کے دل کی دھڑکنیں نارمل ہوتیں سلمٰی نیچے جا چکی تھی۔

اسے یوں لگا جیسے سلمٰی کی اس بات نے اچانک اسے یہاں سے اڑا کر پرستان کی

کسی خوبصورت وادی میں پہنچا دیا ہو۔

ایک عجیب سا سرور اس کے رگ و پے میں اترنے لگا تھا۔

بے خودی کی ایک عجیب سی لذت سے سرشار اقبال اضطراری کیفیت میں اٹھا۔ سیڑھیوں تک گیا اور پھر واپس آ کر چارپائی پر بیٹھ رہا۔ اسے ایک بے کلی سی لگ گئی تھی۔

وہ چاہتا تھا اڑ کر سلمٰی تک پہنچے اور اسے بتائے کہ اس نے ایک نظر ملنے کے بعد ہی سے اسے یہاں روکنے کا، اپنانے کا، اپنا بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

وہ رات بھی کروٹوں کی نذر ہو گئی۔

دیر گئے اس کی آنکھ لگی اور صبح سورج کی کرنیں بدن پر پڑنے سے وہ بیدار ہوا تو سلمٰی اپنے معمولات سے فارغ ہو کر اخبار پڑھ رہی تھی۔

اسے نیچے آتے دیکھ کر سلمٰی نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا کر دوبارہ اخبار کا مطالعہ کرنے لگی۔

دونوں ایک دوسرے سے نظریں ملانے سے ہچکچا رہے تھے۔

دونوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔

کیوپڈ مہاراج نے دونوں کے دلوں کو ایک ہی تیر سے نشانہ بنا لیا تھا۔ جس طرح رات اس نے کروٹیں لے کر گزاری تھی کچھ اسی کیفیت سے سلمٰی بھی گزر رہی تھی۔ وہ بھی ڈھنگ سے سو نہیں پائی تھی۔ اس کی بڑی بڑی بادامی آنکھوں میں تیرتے ڈورے معمول سے زیادہ سرخ ہو رہے تھے۔

سرمگیں آنکھوں کا سحر دو چند ہو گیا تھا۔

وہ بہت شرمیلی لڑکی تھی۔

اسے اب تک سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ رات اس نے جو بات کہی وہ کسی طاقت نے اس سے کہلوائی۔ شاید قدرت کو یہی منظور تھا۔

ورنہ تو دونوں زندگی بھر ایک دوسرے پر اظہار حقیقت نہ کر پاتے۔

دونوں ہی ان دیکھی آگ میں جلتے رہتے۔

✡......✡......✡

انور حسب معمول دیر سے اٹھا سب سے آخر میں ناشتہ کیا اور "ابھی آیا" کہہ کر باہر نکل گیا۔ آج اس نے اپنے دن کا آغاز ایک نزدیکی مارکیٹ میں موجود چھوٹے سے ہوٹل سے

چائے پینے سے کیا تھا۔

یہ معمولی سا ہوٹل تھا جہاں عموماً غریب لوگ آ کر سستا کھانا کھایا کرتے تھے ہوٹل کی میزوں پر دو تین اخبار دھرے رہتے تھے جن کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے مختلف لوگ ان کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھے۔

جب بھی ان میں سے کوئی جرائم یا مار دھاڑ کی خبر پڑھتا اسے اونچی آواز میں دوسرے تک پہنچانا ضروری سمجھتا جس کے بعد وہ اس پر باقاعدہ بحث کرتے اور کسی نتیجے پر پہنچنے کے بجائے ایک دوسرے کو ہی اس کے لئے مورد الزام ٹھہرا کر دوسری چٹ پٹی خبر پر مباحثہ شروع کر دیتے۔

ہوٹل کے مالک نے دیوار پر بڑے موٹے الفاظ میں ''یہاں سیاسی بحث کرنا منع ہے'' لکھوایا ہوا تھا۔

لیکن......

یہ لوگ صرف سیاست پر بحث کر رہے تھے۔

اپنے گھر سے کاروبار تک اور وہاں سے زندگی کے تمام شعبوں میں ہونے والی تمام برائیوں اور تباہیوں کا ذمہ دار حکومت کو گردان رہے تھے۔

کیا مجال جو وہ اس معاشرتی تباہی میں اپنا کوئی حصہ تسلیم کرنے پر تیار ہوں۔ انور بڑی دلچسپی اور دلجمعی سے ان کی باتیں سن رہا تھا اسے جلد از جلد اس ماحول میں سرایت کرنا تھا۔

یہ اس کی تربیت تھی کہ اپنے ٹارگٹ ایریا کے گرداگرد علاقے سے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات اسے حاصل ہوں۔ یہاں کی آبادی اور عوامی رائے تک اس معلومات میں شامل تھیں۔ اسے بتایا گیا تھا کہ ہر شہر کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے خصوصاً تاریخی اہمیت کے شہروں حامل کا اپنا ایک خاص ماحول ہوتا ہے۔

اسے اب اس ماحول کا حصہ نظر آنا تھا۔

اس کا پلس پوائنٹ یہ تھا کہ اس نے ایک مسلم گھرانے میں جنم لیا اور اب وہ ایک مسلمان ملک کا مہمان بن کر اس کی تباہی کا سامان کرنے آیا تھا۔ وہ ایسے ملک میں بم حملہ کرنے آیا تھا جس کے شہری اور حکومت اپنے بارے میں کم اور انڈیا کے مسلمانوں کے بارے زیادہ سوچا کرتے تھے۔

چوہدری اختر کو اس نے ملاقات کے لئے جس جگہ بلایا تھا وہ اس کی دانست میں

سب سے زیادہ محفوظ تھی اور اس نے ٹیلی فون پر اختر کو وہ مخصوص مقام بھی بتایا تھا جہاں اس کو پہنچنا تھا۔ دونوں نے ''را'' کے جس مرکز میں تربیت حاصل کی تھی وہاں انہیں آپس میں ملاپ کرنے کی تربیت بھی دی گئی تھی جس پر انہیں عمل کرنا تھا۔ اس تربیت کے مطابق اختر مقررہ وقت سے قریباً دس منٹ پہلے وہاں پہنچ گیا۔ وہ اس جگہ سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا جہاں انہیں آپس میں ملاقات کرنی تھی۔

یہ ایک تفریح گاہ تھی۔

یہاں لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا اور اختر چوہدری بھی یہاں اس حیثیت سے آیا تھا۔ تفریح گاہ کے ایک کونے میں موجود ایک بزرگ کے مزار کے ایک کونے میں لگے درخت پر اسے ملاقات کا پیغام ملا تھا۔

اپنی گھڑی پر مقررہ وقت ہوتے ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹہلتا ہوا اسی درخت کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا جہاں انہیں آپس میں ملنا تھا۔

ابھی اسے وہاں کھڑے بمشکل دو تین منٹ ہی گزرے تھے جب اسے ایک نوجوان اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔

یہ انور تھا......

چوہدری اختر کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ یہاں گزشتہ آدھ گھنٹے سے موجود ہے اور تفریح گاہ میں داخلے سے یہاں تک اس نے اختر کی مکمل نگرانی کی تھی اور اس امر کے اطمینان کے بعد کہ اس کا تعاقب نہیں کیا جا رہا نہ ہی کوئی اختر چوہدری کو چیک کر رہا ہے اور نہ ہی وہ کسی ''ٹریپ'' میں پھنسنے والا ہے یہ اس کی تربیت تھی۔ اسے نارمل حالات میں بھی احتیاط کرنی تھی تا کہ اس کی کسی غلطی سے اسے یا اختر چوہدری کو نقصان نہ پہنچے کیونکہ دونوں صورتوں میں اس کی کمبختی آ جاتی۔ وہ جانتا تھا کہ ''را'' کے شکنجے میں ایک مرتبہ پھنسنے کے بعد اس کے خود ساختہ قوانین کے آگے سر تسلیم خم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا۔

اس دھندے میں کسی بھی غلطی کی کم از کم سزا موت تھی۔ یہ کوئی لکھا ہوا آئین نہیں تھا۔

لیکن......

یہاں کوئی غیر معمولی بات بھی نہیں تھی۔

کچھ عرصہ ہی انٹیلی جنس میں گزارنے کے بعد انور نے جان لیا تھا کہ یہاں ایجنٹ کی قیمت ٹشو پیپر سے زیادہ کچھ نہیں اسے استعمال کر کے پھینک دیا جاتا ہے۔ کچھ رومال البتہ خاصی دیر تک چلتے رہتے ہیں۔

''کیا وقت ہوگا جناب۔''

اس نے اختر کو پہچانتے ہوئے کوڈ دہرایا۔

اختر نے اس کی شناخت اسی کوڈ سے کرنی تھی۔ اس نے چونکتے ہوئے گردن گھما کر اس اجنبی کی طرف دیکھا جس نے اسے پشت سے مخاطب کیا تھا۔

''معاف کیجئے میری گھڑی خراب ہے۔''

اس نے سنبھل کر جواب دیا۔

''سگریٹ تو آپ کے پاس ہوگی؟''

انور نے اگلا کوڈ دہرایا۔

''ماچس سے کام چلالیں گے۔''

اختر نے کہا۔

اور......

دونوں نے مطمئن ہوکر سر ہلا دیا۔

اب دونوں ایک دوسرے سے گرم جوشی سے مصافحہ کر رہے تھے۔ اختر کو احساس ہو رہا تھا جیسے اس نے اس سے پہلے نووارد کو کہیں دیکھا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرتے ہوئے معمول کے دو چار مزید جملوں کے تبادلے کے بعد اس گوشے کی طرف جا رہے تھے جہاں انہوں نے اگلا لائحہ عمل طے کرنا تھا۔

اچانک ہی اختر چوہدری کو یاد آ گیا کہ اس نے نووارد کو کہاں دیکھا تھا۔ اسے شاہ پور کا وہ تخریب کاری مرکز یاد آ گیا جہاں دونوں کی سرسری ملاقات ہوئی تھی۔

لیکن...... اسے سرراہے ملاقات ہی کہا جا سکتا ہے۔

چوہدری اختر نے اسے یاد دلانا مناسب نہ سمجھا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو اسے ''را'' کی طرف سے ہدایت مل جاتی۔ انہیں صرف اتنا ہی کرنا اور کہنا تھا جس کی ہدایت ملی ہو۔

چوہدری اختر کو اس کا چہرہ تو یاد آ گیا تھا۔

لیکن......

اسے اس بات کا علم نہیں تھا کہ اسلم کے نام سے ملاقات کرنے والا انور بھارتی نژاد ہے۔ وہ اسے بھی کوئی پاکستانی نوجوان سمجھ رہا تھا اور ایسا سوچنے میں وہ حق بجانب بھی تھا کیونکہ اسے یہی بتایا گیا تھا۔

یوں بھی اپنی تربیت اور خصوصی ہدایات کے مطابق جن پر انہیں سختی سے عمل کرنے کا حکم تھا اور جن میں سے کسی ایک کی خلاف ورزی پر وہ اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو سکتے تھے انہیں ایک دوسرے کی شناخت دریافت نہیں کرنی تھی۔

انہیں تو مطلب کے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ بات کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی اور نہ ہی وہ اپنے موضوع سے ہٹ کر کسی دوسرے موضوع پر گفتگو کر سکتے تھے۔ ''را'' کا پہلا تربیتی اصول یہی تھا کہ ایک ایجنٹ کا دوسرے ایجنٹ کی ذاتی زندگی سے متعلق معلومات حاصل کرنا جرم سمجھا جائے۔

یہاں تربیت پانے والے ایک کو یہ اصول بطور خاص سختی سے اپنانے کی ہدایت کی جاتی تھی کہ وہ کبھی ایک دوسرے سے متعلق جاننے کی کوشش نہ کریں اور اگر ایک جگہ کسی مشن کے سلسلے میں ملاقات ہونے کے بعد زندگی میں کبھی دوبارہ ملنے کا موقعہ ملے تو ایک دوسرے کے لئے قطعاً شناسائی ظاہر نہ کریں اجنبیوں کی طرح ملیں اور کوشش کریں کہ ایک دوسرے سے کنی کترا کر گزر جائیں۔

اس وقت انور کو اس کے ''باس'' کی حیثیت حاصل تھی اور انور کی ہدایات اور احکامات پر اسے عمل کرنا تھا۔ دونوں اس تفریح گاہ کے ایک محفوظ کونے میں بیٹھے تھے۔ انور نے وہاں گھومتے مقامی کینٹین کے بیرے کو اپنے ہیں بلا کر بڑی بے تکلفی سے چائے کا آرڈر دیا تھا۔ اس کے لہجے اور اعتماد سے یہی دکھائی دیتا تھا جیسے اس کا تعلق اسی علاقے سے ہو۔

اس کی کسی حرکت سے اجنبیت کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔

اس نے چوہدری اختر سے چھوٹتے ہی کام کی گفتگو شروع کر دی۔ انور کو فی الوقت تین ٹارگٹ ملے تھے جو اس نے چوہدری اختر کو بتا دیئے اور جیسے ہی اس نے یکے بعد دیگر تینوں ٹارگٹ اسے بتائے چوہدری اختر کو فوراً گائیتری یاد آ گئی۔ اس کے ساتھ گزارے زندگی کے بہترین لمحات اور اس کی دم رخصت وہ بات جب اس نے کہا تھا۔

''چوہدری...... اگر تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہے اور مجھے پانا چاہتے ہو تو اس مرتبہ جو کام سونپا جائے وہ کر کے دکھانا......''

اب اسے سمجھ آئی کہ گائیتری نے کیوں ایسی بات کی تھی۔ واقعی یہ کوئی معمولی کام نہیں تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے شرکت ہسپتال میں بم دھماکہ کرنے کا پروگرام بتایا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اختر کے دل میں یہ بات ضرور آئی کہ وہاں تو پہلے ہی جان بلب مریض

ہوتے ہیں انہیں مار کر آخر بھارت کے سورما کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

لیکن......

دوسرے ہی لمحے یہ خیال اس کے ذہن میں پانی پر لکھی تحریر کی طرح محو ہو گیا اب وہاں سوائے گائیتری کے اور کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار گائیتری کے ساتھ گزری راتوں کی فلم چل رہی تھی اور اس کے جنسی قرب کے لئے باؤلا ہوا جاتا تھا۔ اسے بس ایک ہی بات سمجھ آ رہی تھی کہ اگر اس نے اپنے گھناؤنے مقصد میں کامیابی حاصل کر لی تو انعام میں اسے گائیتری مل جائے گی۔

اور......

وہ ہوس کا مارا درندہ گائیتری کے حصول کے لئے اپنی ماں کو بھی قتل کرنے سے دریغ نہ کرتا۔ اس شیطانی کام میں اپنا بھرپور حصہ ڈالنے کے لئے وہ فوراً تیار ہو گیا۔ انور نے اسے بتایا کہ اس کے پاس ''ایجنسی'' کی طرف سے کیا کیا سامان موجود ہے اور اسے مزید کیا کیا درکار ہے۔ اس کے بعد ہی وہ مطلوبہ دھماکہ خیز مواد تیار کر سکتے تھے۔ اس نے چوہدری اختر کو اگلے 48 گھنٹوں میں مطلوبہ سامان مہیا کرنے کا حکم دیا تھا۔ چوہدری اختر کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

اس نے ہامی بھر لی۔

دونوں ایک منصوبہ کی تفصیلات طے کرنے کے بعد الگ ہو گئے۔

انور یہاں سے سیدھا گھر جانے کے بجائے دوبارہ شرکت ہسپتال پہنچ گیا اس نے یہاں ایک مرتبہ پھر گھوم پھر کر اطمینان سے صورت حال کا جائزہ لیا اور ایک خاص جگہ کا انتخاب کرنے کے بعد گھر کی طرف چل دیا۔

جب وہ گھر پہنچا تو حسب معمول والدہ اور سلمیٰ اس کی منتظر تھیں۔

''کہاں دفع ہو جاتے ہو۔''

اس کی ماں نے غصہ سے پوچھا۔

''ارے اماں میں بچہ تھوڑی ہوں۔''

کہہ کر وہ دوسرے کمرے کی طرف چلا گیا۔

کھانا گھر والوں کے ساتھ کھا کر وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھ گیا جہاں اب اقبال بھی

آ گیا تھا۔ جس کی حالت سلمیٰ سے کچھ الگ نہیں تھی دونوں ہی بہت شرما کر ایک دوسرے سے نظریں ملاتے اور چراتے رہے۔

ٹی وی پر کرکٹ کا میچ چل رہا تھا اور سلمیٰ بڑھ چڑھ کر پاکستان کی حمایت کرتی دکھائی دے رہی تھی۔ انور بھی کبھی کبھی اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتا۔

لیکن......

یہاں بیٹھے ہوئے اس کا ذہن کہیں اور تھا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے شرکت ہسپتال کا آؤٹ ڈور گھوم رہا تھا اور مقام بھی جسے اس نے بم نصب کرنے کے لئے منتخب کیا تھا۔

اقبال اور سلمیٰ ایک دوسرے سے کبھی کبھی کوئی بات کہہ دیتے تھے۔ اس اثنا میں خالہ بھی اندر آ گئیں۔ انور کچھ دیر تک بادل نخواستہ ان کے ساتھ بیٹھا رہا پھر اٹھ کر دوسرے کمرے میں آ گیا۔

گرمی اپنے جوبن پر تھی۔

لیکن......

دھوپ کی براہ راست زد میں آنے سے قدرے محفوظ اس پرانے محلے میں جس کے دو بڑے کمروں میں اقبال میاں نے کولر فٹ کروا رکھے تھے گرمی کا احساس نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔

انور موسم سے بے نیاز اپنے کام میں جت گیا۔

اس نے جان بوجھ کر کمرے کو اندر سے کنڈی لگائی اور الماری کھول کر اپنے سامان کا جائزہ لینے کے بعد جو وہ بھارت سے لایا تھا مطمئن ہو کر سر ہلاتے ہوئے دوبارہ بیگ بند کر کے اسی طرح رکھ دیا البتہ اس نے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکال لیا جس پر لکیریں کھینچ کر شاید بم بنانے کا کوئی طریقہ درج کیا گیا تھا۔

اس نے اب دروازے کی کنڈی کھول دی تھی اور بغور اس کاغذ کا جائزہ لینے کے بعد اسے دوبارہ اسی طرح لپیٹ کر اپنی قمیص کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ کاغذ کے اس پرزے پر تباہ کن دھماکے دار بم بنانے کی ترکیب لکھی تھی گو کہ اسے یہ سب کچھ زبانی یاد تھا۔

لیکن......

احتیاطاً اس نے دوبارہ اسے دہرا لیا تھا۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ کام میں کوئی کمی رہ جائے۔

انور تھوڑی دیر بعد جان بوجھ کر وہیں سو یا رہا۔ وہ یوں بھی اس کمرے میں سویا کرتا تھا۔ دیر گئے تک اس کی آنکھ نہ لگی۔ آمدہ خدشات کے احساس نے اسے خاصا پریشان کیا ہوا تھا۔

لیکن......

اس نے سب کو یہی تاثر دیا جیسے وہ گہری نیند میں سو رہا ہو۔

صبح وہ معمول کے مطابق اٹھا اور بظاہر سب سے چہک چہک کر باتیں کرتا رہا لیکن اندر سے وہ بہت خوفزدہ تھا۔ یہ احساس کہ اگر وہ پکڑا گیا یا ناکام رہا دونوں ہی صورتوں میں اس کا انجام کیا ہوگا اسے لرزا کر رکھ دیا تھا۔

گرفتاری کی صورت میں یہاں اس کے لئے زندہ درگور ہونے والی بات تھی اور ناکامی کی صورت میں وہاں بھارتی انٹیلی جنس اسے زمین میں گاڑ دیتی۔ کیونکہ ان لوگوں کے نزدیک ایسی کسی بھی ناکامی کی کم از کم سزا ایک بدترین زندگی یا دردناک موت تھی۔ بہت کم ایسے باہمت لوگ تھے جو خودکشی کر کے اپنی جان چھڑالیا کرتے تھے۔ بیشتر تو زندہ درگور ہو کر رہ گئے تھے۔

اقبال کی روانگی کے بعد اس نے گھر والوں کو دوپہر کے بعد واپس لوٹنے کی اطلاع دی اور باہر نکل گیا۔ ایک مرتبہ پھر وہ شرکت ہسپتال جا رہا تھا۔

اس نے آج آخری مرتبہ اپنے ذہن میں طے کردہ ٹارگٹ کا جائزہ لیا یہاں گھوم پھر کر وقت گزارا ڈیوٹی پر موجود دو سکیورٹی گارڈز کی نقل و حرکت کا جائزہ لیا اور اندازہ لگایا کہ یہ دونوں مریضوں کے لواحقین کو ڈسپلن میں رکھنے کے علاوہ اور کسی طرف توجہ نہیں دے پاتے۔ وہ یہاں ''آؤٹ ڈور'' میں مریضوں کے لواحقین کے روپ میں بیٹھا تھا...... اور اسے حیرانگی ہو رہی تھی کہ آخر کسی ہسپتال میں دھماکہ کروانے کی اس کی ایجنسی کو کیا ضرورت پیش آئی ہے...... لیکن......

قریب ہی موجود ایک اخبار کا مطالعہ کرنے کے بعد اسے جیسے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔

اخبار کے صفحہ اول پر ارسلان کا بیان شائع ہوا تھا کہ حکومت اس کے ہسپتال کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہے اور اس خیراتی ہسپتال کو تباہ کرنے کے لئے ہر ممکن طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ ارسلان نے کہا تھا کہ حکومت ایسے تمام ہتھکنڈے اختیار کر رہی ہے جن کی مدد سے ہسپتال کو بند کیا جا سکے یا پھر ایسے حالات پیدا کر دیئے جائیں کہ یہاں مریضوں کا علاج ممکن ہی نہ رہے...... اس نے اپنے بیان کے آخر میں کہا تھا کہ اسے ٹیلی فون اور خطوط کے ذریعے دھمکیاں دی جا رہی ہیں اور مجبور کیا جا رہا ہے کہ ہسپتال سرکار کو سونپ دے یا پھر اسے بند

کر دے۔ بصورت دیگر اسے سنگین نتائج کے لیے تیار رہنے کی وارننگ دی جا رہی تھی۔

اس بیان کے مطالعے کے بعد اس کے ہونٹوں پر خود بخود ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔

اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔

اس کی ایجنسی والے بڑا بھیانک کھیل رچا رہے تھے۔

اس ایک دھماکہ سے وہ اپنی مرضی کے نتائج حاصل کر سکتے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ عوام اور حکومت کے درمیان غلط فہمی اور نفرت کی ایک مضبوط دیوار کھڑی کر سکتے تھے جسے شاید پھر کوئی طویل عرصے تک پھلانگ ہی نہ سکتا۔

اپنی گھڑی کی طرف اس نے دیکھا اور کچھ سوچتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اب وہ اطمینان سے چلتا ہوا ہسپتال سے باہر آ گیا اور ایک ویگن کے ذریعے اس تفریح گاہ کی طرف چل دیا جہاں اس نے اختر سے ملاقات کرنی تھی۔

اس تفریح گاہ کے نزدیک ہی ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں اس نے دوپہر کا کھانا کھایا اور اپنے طے شدہ وقت سے قریباً پندرہ بیس منٹ پہلے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہوٹل سے تفریح گاہ کا فاصلہ بمشکل تین چار منٹ کا تھا لیکن اس نے وہاں کچھ دیر پہلے پہنچنا تھا۔ پہلے سے طے شدہ ایک جگہ پر پہنچ کر اس نے اب اس مقام پر نظریں جما دی تھیں جہاں چوہدری اختر نے آ کر کھڑے ہونا تھا۔

چوہدری اختر کو اس نے تفریح گاہ کے مین گیٹ سے اندر داخل ہوتے دیکھ لیا تھا اور یہ اطمینان بھی حاصل ہو گیا تھا کہ کوئی اس کا تعاقب نہیں کر رہا۔ مطلوبہ وقت پر اختر اپنی تربیت کے مطابق اس جگہ آ کر کھڑا ہو گیا۔

تین چار منٹ تک وہ بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلتا رہا پھر اچانک اس کی نظر اپنی طرف آتے انور پر پڑی۔ دونوں دیرینہ آشناؤں کی طرح ایک دوسرے کی طرف لپکے اور بڑی گرم جوشی سے ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ روایتی انداز میں دونوں نے ایک دوسرے کی خیریت دریافت کی تھی۔

''چلو کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

انور نے اسے ایک طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

چوہدری اختر وفادار ملازموں کی طرح اس کے تعاقب میں چلنے لگا اور دونوں ایک گھنے درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔ گرمیوں کی دوپہر تھی اور یہاں سوائے سکولوں کالجوں

سے بھاگ کر آنے والے لڑکی لڑکوں کے اور کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ لوگ بھی زمانے کی نظروں سے چھپنے کے لئے اس طرح مختلف کونوں کھدروں میں دبکے ہوئے تھے۔

''امید ہے تم نے ٹارگٹ ایریا کا سروے مکمل کرلیا ہوگا۔''

انور نے بیٹھتے ہی کہا۔

''ہاں...... میں نے وہاں کا اچھی طرح جائزہ لیا ہے۔''

چوہدری اختر نے کہا اور اسے ہسپتال سے متعلق تفصیلات بتانے لگا۔

انور نے اسے قطعاً اس بات کا احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ ہسپتال کا جائزہ لے آیا ہے وہ بڑی سنجیدگی اور دلجمعی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔

''تمہارے خیال سے کون سی جگہ مناسب رہے گی۔''

اس نے اختر سے دریافت کیا۔

اور......

اختر نے اپنے ذہن میں طے شدہ اس جگہ سے متعلق بتا دیا۔

اس نے آؤٹ ڈور کی ڈسپنسری کے نزدیک کاؤنٹر کا انتخاب کیا تھا۔

''ہوں ں......''

انور نے اس کی بات سن کر لمبی ہوں کہی اور کچھ دیر فضا میں گھورنے کے بعد اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''یہ جگہ کیسی رہے گی؟''

یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکال کر اس کے سامنے بچھا دیا جس پر ہسپتال میں داخلے کے دروازے سے آؤٹ ڈور تک کا سارا نقشہ بنا ہوا تھا۔ اس نے اس نقشے میں ایک خاص جگہ انگلی رکھی۔

چوہدری اختر چونکے بنا نہ رہ سکا۔

اس چھوٹے سے کاغذ پر انور نے اپنے ہاتھ سے نقشہ بنا کر مکمل تفصیلات لکھی تھیں اور ایک ایک پوائنٹ پر نشان لگا کر اس کا دروازے سے فاصلہ بھی درج کیا تھا۔

ایسے نقشے بنانے کی تربیت اس کو دی گئی تھی جس کے ذریعے تخریب کار اپنے منتخب ٹارگٹ سے فرار کے راستے تک کا فاصلہ اور وقت لکھا کرتے تھے اور ٹارگٹ کے متبادل راستوں کی مکمل تفصیلات جن میں راستے میں آنے والی معمولی رکاوٹیں بھی درج ہوں، بیان

کی جاتی تھیں۔

تین دن تک ہسپتال کا سروے کرنے کے بعد اس نے بڑے اطمینان سے یہ نقشہ تیار کیا تھا۔ چوہدری اختر حیران رہ گیا۔

''اچھا چھوڑو یہ بتاؤ تم نے اس جگہ کا انتخاب ہی کیوں کیا؟''

اس نے کاغذ دوبارہ تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھتے ہوئے سوال کیا۔

اور......

چوہدری اختر جو ذہنی طور پر اس سے خاصا مرعوب دکھائی دے رہا تھا یہ بتانے کی کوشش کرنے لگا کہ اس نے ڈسپنسری والے کاؤنٹر کا انتخاب کیوں کیا ہے؟

''ہوں......تو یہ بات ہے اب میری دلیل بھی سنو۔''

انور نے اس کی بات بڑی سنجیدگی اور انہماک سے سننے کے بعد کہا۔

اور......

اس نے اپنے طے کردہ ٹارگٹ سے متعلق دلائل دینے شروع کئے جو چوہدری اختر سے بہر حال زیادہ مضبوط تھے۔

اس نے دو تین منٹ ہی میں چوہدری اختر کو اس بات پر ذہنی طور پر رضا مند کر لیا تھا کہ ڈسپنسری کے کاؤنٹر سے وہ جگہ زیادہ محفوظ تھی جس کا انتخاب انور نے کیا تھا۔

''میرے خیال سے آپ نے صحیح جگہ کا انتخاب کیا ہے۔''

اس نے بالآخر کہا۔

''دیکھو میرے دوست مجھے خوش کرنے کے لئے میری ہاں میں ہاں نہ ملانا۔ میں اس شہر کا رہنے والا نہیں ہوں۔ میرا گھر یہاں سے ڈیڑھ دو سو میل دور ہے...... میرا صوبہ بھی دوسرا ہے۔ جبکہ تم اس شہر کے نزدیک رہتے ہو اور تمہارا آنا جانا یہاں لگا رہتا ہے۔ میں نے تو ایجنسی کے اصول کے مطابق اپنی رائے پیش کی ہے کیونکہ حفاظتی اقدامات میں اگر معمولی سی بھی کوتاہی ہو گئی تو اس کا بہت نقصان ہوگا...... اور تمہاری جان بھی میری جان کی طرح ہی قیمتی ہے...... اگر تم واقعی اس بات کو مانتے ہو کہ یہ جگہ زیادہ محفوظ رہے گی تب ہی ہاں کرنا۔ محض اس لئے میری ہاں میں ہاں نہ ملانا کہ میں یہاں تمہارا کمانڈر ہوں...... کیونکہ کامیابی اور ناکامی دونوں صورتوں میں ہم برابر کے حصہ دار ہوں گے۔''

انور نے اس کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔

لیکن......

جلد ہی اس نے اندازہ لگا لیا کہ اختر نے واقعی قائل ہونے کے بعد اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

''مصالحے کا بندوبست کیا۔''

اس نے اگلا سوال داغا۔

''کل سارا مال پہنچ جائے گا۔''

چوہدری اختر نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

''ہوں......اس کا مطلب ہے پرسوں تیاری شروع کر دیں۔''

انور نے پوچھا۔

''جیسے آپ کی مرضی۔''

چوہدری اختر نے کہا۔

''جگہ کا انتخاب ہو گیا''

انور نے بم کی تیاری والی جگہ سے متعلق سوال کیا تھا۔

''ہاں......اور بڑی محفوظ جگہ ہے......میرا اپنا ڈیرہ ہے۔''

چوہدری اختر نے بظاہر بڑے اعتماد سے کہا۔

لیکن......

انور کی طرف سے غیر متوقع جواب موصول ہوا۔

''نہیں...... نہ ہی تمہارا ڈیرہ، نہ تمہاری کونینس Canvance نہ ہی تمہارا کوئی آدمی کوئی شناسا کچھ نہیں...... یہ سارا کام الگ ہوگا...... کسی جگہ کو کرائے پر دو چار روز کے لئے کوئی جگہ لے لو...... کسی ہوٹل کا کمرہ بک کروالو...... کسی بھی درمیانے درجے کے ہوٹل کا جہاں پولیس کا زیادہ آنا جانا نہ ہو......اور ہاں اس شہر میں نہیں......نزدیکی شہر میں...... میری بات سمجھ گئے ناں......''

وہ چوہدری اختر کو احکامات جاری کر رہا تھا۔

چوہدری اختر پیدائشی بدمعاش تھا۔

اس کا خون چند لمحے کے لئے ضرور کھولا......لیکن، دوسرے ہی لمحے اسے نارمل ہونا پڑا۔ دوسری طرف بھارتی انٹیلی جنس کا معاملہ تھا اور سب سے بڑھ کر گائیتری...... وہ گائیتری

کے حصول کے لئے اس کی جسمانی رفاقت کے لئے باؤلا ہوا جاتا تھا۔ اس نے گائیتری کے ساتھ مزید کچھ راتیں گزارنے کے لئے ہر قربانی دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ایک ڈیرے پر لگی ڈش پر جب بھارتی ٹی وی کے چینل دکھائی دیتے تو ہر دوسرے تیسرے گھنٹے پر گائیتری کا کوئی اشتہار ضرور چلتا تھا۔

کبھی وہ کسی صابن کے اشتہار میں۔

کبھی کسی جوتے کے اشتہار میں......

اور......

کبھی کسی مرد کی بانہوں میں ناچتی کسی شراب یا بیئر کے اشتہار میں دکھائی دیتی تو چوہدری اختر کے خون میں چونٹیاں رینگنے لگتیں۔

اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس ماڈل گرل کے ساتھ زندگی کی آٹھ پر تعیش راتیں گزار چکا ہے۔

''چوہدری اختر...... گائیتری جیسے ماڈل کی ایک رات کی قیمت لاکھوں ہے...... یہ بات کبھی نہ بھولنا۔ اور وہ اپنی مرضی کی مالک ہے...... چاہے تو کروڑوں پر لات مار دے...... اس ملک کے بڑے بڑے سیٹھ نوٹوں کے بریف کیس بھر کر اس کے پیچھے کتے کی طرح دم ہلاتے گھومتے پھرتے ہیں......لیکن تم بڑے خوش قسمت ہو کہ اسے تمہاری مردانگی پسند آ گئی ہے......اسے کبھی ناراض ہونے کا موقعہ نہ دینا......''

ورما ملک کے کہے الفاظ اسے رہ رہ کر یاد آتے اور وہ گدھا اپنی ''مردانگی'' پر فخر کرنے لگتا۔

اسے علم نہ ہو پاتا کہ کتنا زبردست نفسیاتی حملہ اس پر ہوا تھا۔ ان لوگوں نے اختر کو باندھ کر رکھ دیا تھا۔ بے دست و پا کر دیا تھا۔

اور......

وہ بے وقوف خود کو مرد سمجھ رہا تھا۔

''را'' نے اس کی مردانگی پر ہی تو حملہ کیا تھا۔ بس انداز ذرا مختلف تھا۔

۞......۞......۞

ٹھیک ہے میں آج ہی کرم پورہ میں ہوٹل بک کروالوں گا۔''

اس نے انور سے کہا۔

"کوشش کرنا وہاں ٹیلی فون کی سہولت موجود ہو۔"

انور نے کہا۔

"ضرور ہوگی...... خاصا ڈیویلپ علاقہ ہے۔"

اختر نے جواب دیا۔

"اور ہاں...... یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کسی بھی مرحلے پر تمہاری اصل شناخت سامنے نہ آئے۔ داڑھی نہ منڈوانا...... امید ہے تمہارے پاس متبادل شناخت کا شناختی کارڈ ہوگا نہ ہو تو بنوالو...... اس ملک میں ہر جعلی کاغذ مل جاتا ہے...... ہر دونمبر چیز موجود ہے۔"

انور نے کہا۔

"ایسا ہی ہوگا۔"

چوہدری اختر نے جواب دیا۔

انور نہیں جانتا تھا اس کے پاس پہلے ہی دو تین شناختی کارڈ موجود رہتے تھے۔ اس نے تو کبھی معمول کے مطابق دوسرے شہروں میں اپنا اصل نام استعمال نہیں کیا تھا پھر یہاں کیوں کرتا......

"سامان وہیں جمع کرلو...... جتنی جلدی ممکن ہو...... کل ملتے ہیں لیکن یہاں نہیں۔"

انور نے اسے اگلی ہدایات جاری کیں۔

دونوں اگلے روز شام کی ملاقات کا وعدہ کر کے اور ایک جگہ کے انتخاب پر مطمئن ہونے کے بعد الگ ہو گئے۔

گھر پہنچ کر انور نے معمول کے مطابق دن گزارا۔

اس روز وہ جان بوجھ کر اقبال کے ساتھ ایک مقامی سینما میں فلم شو دیکھنے گیا تھا تاکہ اسے اپنی کسی غیر معمولی سرگرمی کا احساس نہ ہونے دے۔

فلم پر سلمٰی بھی ان کے ساتھ گئی تھی گو کہ وہ سب لوگ مڈل کلاس گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان کے نزدیک بھی یہی بہترین اور مناسب عیاشی تھی جو انہیں بغیر کسی روک ٹوک کے مل جاتی تھی۔

فلم دیکھتے ہوئے اس کا ذہن کہیں اور تھا......

گو کہ اس نے پاکستانی سینما میں پہلے کبھی فلم نہیں دیکھی تھی اور یہ فلم بھی بڑی دلچسپ تھی لیکن اس کے دماغ میں کوئی اور فلم چل رہی تھی۔

وہ چشم تصور سے اپنے منصوبے میں کامیابی کے بعد خود کو اپنے افسر اعلیٰ سے خصوصی

انعام حاصل کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

ہزاروں روپے کی رقم، ولایتی شراب شباب اور عیاشی کرنے کے لئے ہر سہولت اسے اور کیا چاہئے؟

اس نے سوچا۔

لیکن......

اس کے برعکس سلمٰی اور اقبال کسی اور دنیا میں گم تھے۔

سلمٰی کا کہا فقرہ اقبال کے دل و دماغ پر چھا گیا تھا اور سلمٰی سوچ رہی تھی کہ یہ بات اس کے منہ سے کسی طاقت نے اگلوا دی۔

شاید محبت نے......

محبت سے زیادہ طاقتور جذبہ اور کون سا ہوسکتا ہے اس دنیا میں؟ واقعی اسے بھی اقبال کی طرح اقبال سے پہلی نظر میں محبت ہوگئی تھی۔

وہ دہلی کے کالجوں کی پڑھی تھی۔ جہاں ہر بے حیائی موجود تھی...... ایک سیکولر معاشرے میں جنم لیا تھا اس نے۔

اس کے گھر کا ماحول نیم مذہبی سہی۔ وہ خود مسلمان سہی۔

لیکن......

ماحول کے اچھے برے اثرات موسم کی طرح انسانی مزاج پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس بات کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا کہ وہ اس سے بچ کر رہے۔

اس کے حلقہ احباب میں نام نہاد مسلم گھرانوں کی وہ لڑکیاں بھی تھیں جن کے غیر مسلموں سے یارانے تھے اور وہ غیر مسلم لڑکیاں بھی جو مسلمان لڑکوں کے ساتھ گلچھڑے اڑایا کرتی تھیں۔

درجنوں لڑکوں نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔

ان میں اپنے بھی تھے اور پرائے بھی۔

لیکن......

اس نے اپنی کلاس فیلوز کے برعکس کسی کو لفٹ نہیں کروائی۔ ایسی ہر پیش کش کو ٹھکرا دیا وہ بڑی ریزرو قسم کی لڑکی تھی۔

اپنی ماں کی مکمل کاپی......

اس پر باپ سے زیادہ ماں کی تربیت کی چھاپ تھی جس طرح اس کی ماں نماز روزے

کی پابند تھی۔ بالکل اسی طرح اس سیکولر سماج میں رہتے ہوئے وہ بھی صوم وصلوٰۃ کی پابند تھی۔

اس کے دماغ میں تو کبھی کبھی مسلم پرستی کا کیڑا بھی کلبلانے لگتا تھا۔ جب کبھی بھارت کے کسی شہر میں فسادات ہوتے اور مسلمانوں کو نشانہ بنایا جاتا تو اس کا دل خون کے آنسو رویا کرتا تھا۔

جب سے کشمیر میں مجاہدوں نے بھارتی استبداد کے خلاف بندوق اٹھائی تھی اسے خواہ مخواہ اپنے مسلمان ہونے پر فخر ہونے لگا تھا۔

باپ کی کانگریسی ذہنیت کے برعکس اس نے دل سے کبھی خود کو بھارتی نہیں سمجھا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ بھارت کے مسلمان سر اٹھا کر جئیں۔ ہندوؤں کے ہاتھوں کی کٹھ پتلیاں نہ بنے رہیں۔ نہ ہی دوسرے درجے کے شہری بن کر شودروں جیسی زندگی گزاریں۔

وہ کبھی کسی سے بحث نہیں کرتی تھی...... نہ ہی اس نے کبھی گھر میں کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا نہ ہی وہ جوشیلی اور جذباتی مسلمان لڑکیوں کی طرح اپنے نظریات کا پرچار کیا کرتی تھی۔

جو کچھ بھی تھا اس کے دل میں تھا وہ اپنے ذاتی نظریات کو اپنا ذاتی مسئلہ سمجھ کر کسی اور کے سامنے ڈسکس کرنا مناسب نہیں سمجھتی تھی۔ ہاں جب کبھی ضرورت محسوس ہوتی وہ بغیر کوئی منافقت کے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر اپنی بات کہہ دیتی...... یہ جانے بغیر کہ اس کا کیا مطلب لیا جائیگا۔

اسے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہا کہ جب کبھی ان کے گھر میں مسلمانوں پر زیادتی کے حوالے سے کوئی بھی بات ہوتی جس گرم جوشی کا مظاہرہ اس کی اور والدہ کی طرف سے کیا جاتا اس کے والد اور بھائی کی طرف سے نہیں ہوتا تھا۔ سلمٰی کی اب بھی یہی خواہش تھی کہ اس کا بھائی ان مسلمان نوجوانوں کی طرح سوچے جو مقبوضہ کشمیر میں سرگرم جہاد تھے۔

دراصل افغان جہاد کے بعد سے بھارتی مسلمانوں کی زندگیاں بھی بدلنے لگی تھیں...... وہ مسلمان لڑکے جو کسی بھی طرح اس جہاد میں حصہ لے کر واپس آتے اپنے ساتھ جہادی نظریات بھی لے کر آتے تھے جن کا پرچار وہ اپنی سوسائٹی میں کرتے۔ بھارتی حکومت اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کے لئے یہ بات بطور خاص باعث پریشانی تھی کہ گزشتہ کچھ عرصہ سے خصوصاً فساد میں مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں کے خلاف مزاحمت ہونے لگی تھی۔

اس سے پہلے تو کبھی وہ مزاحمت کرتے ہی نہیں تھے۔

بس بے چارے بلوائیوں کے ہاتھوں گاجر مولی کی طرح کٹتے رہتے اور بے بسی

سے لٹتے چلے جاتے تھے۔

لیکن......

اب کچھ عرصے سے وہ ہر سطح پر اپنی حد تک ہندو بلوائیوں کو جواب دینے لگے تھے۔

بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیوں کی یہ طے شدہ رائے تھی کہ اس کا سبب افغان جہاد ہے۔ بھارت کے دینی مدارس کے نوجوان چوری چھپے اس جہاد میں حصہ لے کر واپس آتے تھے اور بدلے ہوئے مسلمان دکھائی دیتے تھے۔

یہ جہادی اثرات دینی مدارس کے طلبہ سے اب کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے مسلمان طلبا اور طالبات تک پہنچنے لگے تھے۔

اور......

سلمٰی بھی ان میں سے ایک تھی......!!

* * *

اقبال نے بہت عرصے بعد ان کی خواہش پر سینما کا رخ کیا تھا۔ پردہ سکرین پر فلم چل رہی تھی۔

لیکن......

اس کی نظریں پردہ سکرین سے زیادہ اپنے ساتھ دائیں ہاتھ بیٹھی سلمٰی پر جمی تھیں۔

سلمٰی اس کے اور انور کے درمیان بیٹھی تھی......

یہی کچھ اس کی بھی کیفیت تھی۔

دونوں کی نظریں متعدد مرتبہ ایک دوسرے کی طرف چوری سے دیکھتے ہوئے ٹکراتیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کی نظروں کی چوری پکڑی تھی۔

اقبال نے ابتدا ہی سے زندگی کے بڑے نشیب وفراز دیکھ لئے تھے۔ باپ کی کم عمری میں وفات کے بعد ماں کی دن رات محنت...... معاشرے کا بے رحمانہ برتاؤ اور بے پناہ محنت سے کامیابی اور مطلوبہ مقاصد حاصل کرنے کے تلخ تجربات اس کے ساتھ ساتھ سفر کرتے آئے تھے۔

گزشتہ دو سال سے البتہ اس نے دوران ملازمت ہیرا پھیری کر کے دو کے دس اور پھر دس کے بیس بنانے سیکھ لیے تھے۔

لیکن......

یہ روپ اس نے اپنی مرضی سے نہیں معاشرے کے جبر سے دھارن کیا تھا۔ یہی

وجہ تھی کہ تھوڑی بہت حرام کی کمائی کے باوجود وہ بھٹکا نہیں تھا۔ اس کے ہمکار جو اسی دھندے میں لگے تھے اپنی ساری کمائی گندے کاموں پر لٹاتے تھے۔

لیکن...... اس نے زندگی میں ابھی تک کسی عورت سے آنکھیں ملا کر بات کرنے کی ہمت بھی نہیں کی تھی۔

سلمٰی کو دیکھنے کے بعد جو گزشتہ رات اس کے منہ سے نکلے ایک فقرے نے اس کے دل و دماغ میں آندھیاں چلا دی تھیں۔ وہ شدت سے چاہنے لگا تھا کہ اپنا حال دل کسی بھی طرح سلمٰی تک پہنچا دے۔

لیکن کیسے؟

یہ تھا وہ سوال جو بار بار اس کے دل و دماغ کو کچوکے لگا رہا تھا۔ کیا وہ سلمٰی کو کبھی یہ بتا پائے گا کہ اس کی ایک جھلک نے ہی اقبال کے خرمن دل پر بجلیاں گرا دی تھیں اور جو بات اس رات اچانک سلمٰی کے منہ سے نکل گئی تھی دراصل وہی اس کے دل کی آواز تھی۔

اس نے یہی چاہا تھا کہ اب سلمٰی کبھی واپس نہ جائے ہمیشہ کے لئے یہیں کی ہو کر رہ جائے؟

پردہ سکرین پر بھی کچھ یہی منظر چل رہا تھا۔

وہاں بھی کوئی ہیرو اپنی ہیروئن پر اظہار محبت کرنے کے لئے اچانک اس کے کمرے میں گھس آیا اور اب ہیروئن کی توقعات کے بالکل برعکس بڑی دیدہ دلیری سے اس کے سامنے ڈائیلاگ بول کر اظہار عشق کرنے لگا تھا۔

یہ فلم کا اثر تھا یا پھر اس جذبے کا جس نے اقبال کو بے بس کر دیا تھا۔ اسے علم نہ ہو سکا کہ وہ کون سی پراسرار قوت تھی جس نے اس کے داہنے ہاتھ کو حرکت دی اور سلمٰی کے بائیں ہاتھ پر جو کرسی پر دھرا تھا رکھ دیا۔

ایک لمحے کے لئے سلمٰی کو یوں لگا جیسے اس کے بدن میں چار سو چالیس وولٹ کرنٹ دوڑ گیا ہو۔ لیکن وہ بھی جیسے مسمریزم کے زیر اثر دکھائی دے رہی تھی۔

اسے اپنا سارا جسم بے حس محسوس ہو رہا تھا۔ سوائے آنکھوں اور دماغ کے بدن کے اور کسی بھی حصے نے اس کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

وہ اقبال کے ہاتھ کی کپکپاہٹ واضح طور پر محسوس کر رہی تھی اسے اس بات کا تو علم ہی نہیں تھا کہ ایسا ہی لرزہ اس اچانک حرکت سے اقبال کے سارے بدن میں بھی کوئی غیر مرئی طاقت حلول کر گئی تھی جس نے اس کے سارے جسم کا کنٹرول خود سنبھال لیا تھا۔

سلمٰی نے ہمت کر کے ایک مرتبہ اس کی طرف دیکھا۔ عین ان ہی لمحات میں اقبال

نے بھی اس کی طرف کنکھیوں سے دیکھا تھا۔ اسے سلمٰی کے ہونٹوں پر چپکی مسکراہٹ صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اندھیرے میں بھی اس کی آنکھوں نے اپنا فسوں پھونک دیا تھا۔ اس کی بہت گہری آنکھوں میں پلنے والا سحر اقبال کو اپنے رگ و پے میں اترنے کا احساس ہوا۔

اور......

اس احساس کے تابع اس نے کسی ”معمول“ کی طرح سلمٰی کے ہاتھ پر دھرے سے اپنے کپکپاتے ہاتھ کی انگلیوں کو پھیلا کر اس کے نرم و نازک ہاتھ کو باقاعدہ اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

سلمٰی مزاحمت تو کیا کرتی۔

اس کے لیے تو اپنی دھڑکنیں سنبھالنا ہی کار دارد تھا۔

اسے یوں لگا جیسے ابھی چند لمحوں میں اس کا بے قرار دل سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر آن گرے گا۔ اقبال کی ہتھیلی کا پسینہ اس کے ہاتھوں کے مساموں میں اتر کر اس کے سارے بدن میں خون کی طرف گردش کر گیا۔

لذت و سرور اور انبساط کی لہروں پر اس کا جسم پھول کی طرح تیرنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ یہ لمحے امر ہو جائیں۔ اقبال اسی طرح اس کا ہاتھ تھامے اسے پریوں کے جہان میں لے جائے اور دونوں اڑتے ہوئے افق کی ساری حدیں پھلانگ جائیں...... یہی کچھ اقبال کے بھی جذبات تھے۔

لیکن......

اچانک ہی ہال کی روشنیاں جلیں کیونکہ فلم کا ہاف ٹائم ہو گیا تھا۔ دونوں نے گھبرا کر ہاتھوں کو اپنی پوزیشن پر واپس لیا۔ دونوں کے سانسوں کا زیر و بم اور دلوں کی دھڑکنیں ابنارمل تھیں۔

دونوں ہی ایک دوسرے کے دام محبت میں پھنس چکے تھے...... اقبال نے جیسے ہی اس کی طرف دیکھا سلمٰی کے چہرے کی نیلاہٹ، آنکھوں کا فسوں دو چند ہو گیا اس نے شرما کر اپنے سینے پر دھرے دوپٹے کو بڑے سلیقے سے اپنے کندھوں پر پھیلا لیا۔

دونوں زیر لب مسکرا رہے تھے جب ایک بوتلیں فروخت کرنے والے نے اقبال کی طرف آرڈر طلب نظروں سے دیکھا اور اس نے تینوں کے لیے بوتلیں لے لیں انور کی بوتل تو ہاف ٹائم ختم ہونے سے پہلے ہی خالی ہو گئی تھی لیکن وہ دونوں بڑی مشکل سے بوتلوں والے کے واپس لوٹنے تک آدھی آدھی بوتل خالی کر پائے تھے۔

مال پہنچ گیا

تینوں ٹیکسی میں گھر واپس لوٹے تھے۔

اقبال اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا اور دونوں بہن بھائی پچھلی سیٹ پر دونوں خاموش تھے اور انور چہک رہا تھا۔

وہ گھر پہنچنے تک فلم پر تبصرہ کرتا آیا۔

دونوں نے ہی با دل نخواستہ اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

اپنے محلے کے باہر ٹیکسی سے اتر کر گھر کی طرف جاتے ہوئے اقبال نے کہہ ہی دیا۔

''شاید سلمٰی کو فلم پسند نہیں آئی۔''

''ارے نہیں...... بہت زیادہ۔ بہت شاندار۔''

سلمٰی نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔

اور......

اقبال کو اپنے سوال کا جواب مل گیا۔

وہ اب ایک فاتح کی طرح گھر کے دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ جیسے سلمٰی نے گویا اس کے اظہار محبت کو سند عطا کر کے اس کے لئے کسی بڑے اعزاز کا اعلان کر دیا ہو...... اسے کسی ستارہ امتیاز سے نواز دیا ہو۔

اپنے سینے پر سلمٰی کی محبت کے ستار سجانے کے بعد اس کے جذبات میدان جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد انعام میں ملے میڈل سجانے والے افسر سے کچھ کم نہیں تھے......

دونوں بہنوں نے ان کے لیے کھانا تیار کر رکھا تھا۔

سب نے مل کر کھانا کھایا اور انور حسب سابق چپکے سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

دونوں عورتیں بھی اپنے بستروں کی طرف جانے کے لئے پر تول رہی تھیں۔

لیکن......

اقبال اور سلمٰی ایک دوسرے کے سامنے سے اٹھنا نہیں چاہتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی محبت کے سحر میں اس طرح بندھ گئے تھے۔ جیسے تماشا دکھانے والا مداری اپنے معمول کے ہاتھ اور پاؤں زمین سے باندھ دیا کرتا ہے۔

دونوں ہی ان لمحات کو ابدی کرنے کے متمنی تھے۔ لیکن، وقت دونوں کی قید سے آزاد تھا شام سے رات کی طرف سفر طویل ہونے لگا تھا۔ ان کی ماؤں کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگی تھیں۔

''آؤ بیٹی...... اب سو جائیں...... بہت رات ہوگئی...... اقبال نے صبح آفس بھی جانا ہوگا۔''

ثریا خالہ نے اپنی بیٹی سے کہا۔

''ہائے اماں...... مجھے تو نیند نہیں آرہی...... آپ چلئے میں ابھی آئی...... دن میں سوتی رہی ہوں ناں۔'' سلمٰی نے اپنی ماں سے کہا۔

اور......

اقبال نے اس کی طرف مسکراہٹ اچھال دی۔

''اقبال بیٹا میں چارپائی پر بستر لگا آئی ہوں۔''

سامنے کوٹھے کی سیڑھیاں اترتی اس کی ماں نے اعلان کیا۔

''اچھا ماں جی...... آپ آرام کیجئے میں کپڑے بدل کر سو جاؤں گا۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا اور دوسرے کمرے میں کھونٹے سے ٹنگے اپنے کپڑوں میں سے رات کو پہننے والے کپڑوں کا انتخاب کرنے لگا۔

کپڑے بدل کر واپس پلٹا تو کمرے میں سلمٰی اکیلی تھی۔

اس نے اقبال کو اس طرف آتے دیکھا تو ہاتھ میں پکڑا رسالہ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

''اور سلمٰی آپ کو برا تو نہیں لگا...... دراصل مم میں......''

اس نے موقعہ غنیمت جان کر سلمٰی کی مہر تصدیق لگوانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''نہیں اقبال...... آپ نے ایسا کیوں سوچا...... میں تو خود......''

سلمٰی نے بات ادھوری چھوڑ کر شرماتے ہوئے نظریں جھکا لیں۔

''سلمٰی میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔''

اقبال نے حوصلہ کیا۔

"اور میں بھی......"

یہ کہہ کر سلمٰی نے بڑے اعتماد سے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

دونوں کی نظریں ٹکرائیں اور دونوں ہی نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں لکھا سچ پڑھ لیا۔

"اچھا آپ آرام کیجئے......آپ کو صبح آفس بھی جانا ہوگا۔"

اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے......خدا حافظ۔"

کہہ کر اقبال روحانی کیفیت سے سرشار اوپر چلا گیا۔

✿......✿......✿

دوسرے روز انور مقررہ وقت پر مقررہ جگہ پہنچ گیا تھا۔

اس نے اپنی معمول کی پریکٹس دہرائی اور چوہدری اختر سے ملاقات کی جس نے اسے بتایا کہ اس نے مطلوبہ ہوٹل میں کمرہ حاصل کر لیا ہے۔

اس نے ہوٹل ہی کا چھپا ہوا ایک کارڈ اسے تھما دیا جس پر ہوٹل کا فون نمبر لکھا تھا۔ اپنے کمرے کا نمبر اس نے انور کو بتا دیا تھا۔

"سامان کب تک پہنچ جائے گا۔"

انور نے کارڈ اپنی جیب میں ڈالنے سے پہلے اس پر چوہدری اختر کا وہ نام اور شناخت جس کے تحت وہ ہوٹل میں مقیم تھا درج کر لی تھی......اور اس سے اگلا سوال کر دیا تھا۔

"آج مل جائے گا۔"

اختر نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے تم سامان ہوٹل لے جاؤ......وہاں شام پانچ اور سات بجے کے درمیان میرے فون کا انتظار کرنا۔"

اس نے آخری ہدایت دے کر اختر کو رخصت کیا۔

اختر بغیر کوئی سوال کئے اٹھ کر چلا گیا اور اس کی روانگی کے کچھ دیر بعد انور بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ جان بوجھ کر چوہدری اختر کو اپنے میزبان ہونے کا تاثر بھی دیتا آیا تھا۔ اس طرح وہ چوہدری اختر کو اس وہم کا شکار رکھنا چاہتا تھا کہ اس کا تعلق بھارت سے نہیں پاکستان

ہی سے ہے۔ کیونکہ بظاہر اس کی کسی بھی حرکت سے ماحول سے اجنبیت کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ "را" اپنے ہر ایجنٹ کی تربیت اس بنیاد پر کرتی تھی اس کی شناخت کبھی دوسرے ایجنٹ پر ظاہر نہ ہو۔

گو کہ ان دونوں کی حیثیت ہی "را" کے نزدیک کرائے کے ٹٹوؤں سے زیادہ نہیں تھی لیکن فی الوقت وہ انور کو بہرحال چوہدری اختر پر ترجیح دے رہے تھے۔ اس کی وجہ انور کا بھارتی مسلمان ہونے سے زیادہ اس پر "را" کے تربیتی اخراجات تھے۔

انہوں نے چوہدری اختر کو ایک حد تک ہی تربیت دی تھی لیکن انور کو انہوں نے اس فن میں اوج کمال تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ ان کا یہ اصول رہا تھا کہ اپنے زرخرید کسی بھی گدھے کا ایک حد تک ہی استعمال کیا کرتے تھے۔ پھل میں سے رس نکال لینے کے بعد وہ اسے گندگی کے ڈھیر پر پھینک دیتے......چوہدری اختر سے بھی انہوں نے خاصا کام لے لیا تھا۔

اور......

جرائم پیشہ ذہنیت کے حامل اور ماضی کے ریکارڈ ہولڈر چوہدری اختر سے یہ توقع عبث تھی کہ وہ غداری کے عوض مادر وطن کی فروخت کے عوض سے حاصل ہونے والی بے پناہ دولت کو چھپا کر رکھتا۔

پاکستان کی کاؤنٹر انٹیلی جنس کی کارکردگی ان سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ وہ جانتے تھے کہ جلد یا بدیر اپنی کسی نہ کسی غلطی سے اختر ضرور مشتبہ ہو جائے گا جس کے بعد پھر اس کا بچ نکلنا ناممکن تھا۔

ایک مرتبہ پاکستانی ایجنسی کی نظروں میں آنے کے بعد کسی بھی ایجنٹ کا بچ نکلنا اب تک تو ممکن نہیں ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بھی اپنے پیسے پورے کرنے پر تلے تھے۔

گائیتری کے ساتھ اختر کو زندگی میں عیش و لذت کا آخری پنگھوڑا جھلانے کے بعد اب وہ اپنے اس بکرے کو ذبح کروانے پر تیار تھے۔ اس سے زیادہ وہ اس کا استعمال نہیں چاہتے تھے جبکہ انور کو بہرحال ان کے "ہینڈلر" Handler کی حیثیت حاصل تھی جس کے ذریعے انہوں نے چوہدری اختر جیسے ایجنٹوں کو بھی آپریٹ کرنا تھا۔ اس لئے انہیں انور کی بہرحال حفاظت کرنی تھی۔

✿......✿......✿

چوہدری اختر نے اس کے حکم پر عمل کرنا تھا۔

وہ اگلے روز مقررہ وقت پر ہوٹل میں موجود تھا جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔فون اس کے کمرے میں ملایا گیا تھا اور وہ کمرے سے نکلنے کے لیے پر تول رہا تھا جب اسے کسی ''اسلم'' کے فون کی اطلاع ملی۔

چوہدری اختر مستعد ہو کر بیٹھ رہا۔

''کیا ہے چوہدری صاحب......''

دوسری طرف سے انور نے بڑی بے تکلفی سے پوچھا تھا۔

چوہدری اختر نے ''سب اچھا'' کی اطلاع دی۔

''مال تو امید ہے منڈی سے پہنچ گیا ہوگا۔''

اگلا سوال ہوا۔

''ہاں جی بالکل پہنچ گیا۔بلکہ ڈلیوری کے لیے تیار ہے۔''

اختر نے جواب دیا۔

جہاں اس نے قیام کیا تھا یہ شہر بیرون ملک ایکسپورٹ ہونے والی اشیاء کی منڈی تھی یہاں کے ہنرمندوں کی بنی اشیاء کی بیرون ملک بڑی مانگ تھی جس سے بڑا زرمبادلہ کمایا جاتا تھا۔یہی وجہ تھی کہ اس چھوٹے سے شہر میں بڑے بڑے بیوپاریوں اور غیر ملکیوں کا بھی آنا جانا لگا رہتا تھا۔

اس صورتحال کو سمجھ کر سرمایہ کاروں نے یہاں تین اچھے سٹینڈرڈ کے ہوٹل بنا رکھے تھے جہاں وہ اپنے گاہکوں کو فور سٹار قسم کی سہولتیں دیا کرتے تھے۔انور نے بھی یہاں گاہک کی حیثیت سے آنا تھا اور چوہدری اختر بھی ایک دوسرے نام سے یہاں بیوپاری کی حیثیت سے قیام پذیر تھا۔

''ٹھیک ہے......تم ایسا کرو ہوٹل کے نزدیک خان سپورٹس کی دکان پر آجاؤ۔میں وہاں تمہارا منتظر ہوں گا۔''

یہ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا۔

چوہدری اختر بھونچکا رہ گیا۔

اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ''اسلم'' یہاں موجود ہے۔وہ تو یہی سمجھ رہا تھا کہ اس نے دوسرے شہر سے فون کیا ہے۔

لیکن......

اسے علم نہیں تھا کہ اسلم اس کے یہاں قیام کے بعد سے مسلسل اس ہوٹل کے گرد منڈلاتا رہا تھا۔یہاں سے اس کے گھر کا فاصلہ تھا ہی کتنا......

پرائیویٹ کار کے ذریعے وہ ڈیڑھ گھنٹہ میں یہاں آتا اور اگلے ڈیڑھ دو گھنٹے میں واپس پہنچ سکتا تھا اس لئے اس نے ایک لمحے کا توقف نہیں کیا تھا۔وہ تو اگلے روز دن میں دو مرتبہ چوہدری اختر کا تعاقب کر کے اسے شہر سے ہوٹل تک بھی پہنچا آیا تھا۔اس طرح اس نے اس بات کا یقین کر لیا تھا کہ چوہدری اختر کسی ٹریپ میں نہیں آیا۔

اب بھی وہ اسے اختر کے ہوٹل کے پی سی او سے فون کر کے اس کے ہوٹل کے باہر اس طرح کھڑا تھا کہ اختر کا دھیان ہی اس کی طرف نہ جاتا کیونکہ یہ چھوٹے سے شہر کا بڑا پر رونق بازار تھا اور انسانوں کی ایک بھیڑ یہاں صبح سے رات گئے تک چلتی رہتی تھی۔

خان سپورٹس یہاں کی مشہور دکان تھی جس سے اختر کے ہوٹل کا فاصلہ دس منٹ کا تھا اور یہاں سے وہ اس دکان تک پیدل بھی جا سکتا تھا۔وہ اپنے کمرے کو تالا لگا کر آیا اور اب پیدل ہی جا رہا تھا۔اس امر سے بے خبر کہ انور اس کا تعاقب کر رہا ہے۔

انور کی نظریں اس پر جمی تھیں دونوں کے درمیان فاصلہ بھی کچھ زیادہ نہیں تھا جیسے ہی اختر چوہدری خان سپورٹس والی دکان کے نزدیک پہنچا انور بھیڑ کے درمیان راستہ بنا کر اس طرح اچانک اس کے سامنے نمودار ہوا جیسے وہ پہلے ہی سے یہاں اس کا منتظر تھا اختر کو مزید حیران ہونے کا موقعہ دیئے بغیر اس نے بڑی بے تکلفی سے اس سے مصافحہ اور پھر معانقہ کیا اور دونوں یہیں ایک چائے کے سٹال پر بیٹھ گئے۔انور نے سیلز مینوں کی طرح ایک چھوٹا سا بیگ اٹھایا ہوا تھا۔

دونوں آپس میں کچھ دیر تک بڑے شناساؤں کی طرح باتیں کرتے رہے......

''میرے خیال سے تمہارے ہوٹل چلتے ہیں۔''

انور نے ہی تجویز پیش کی۔

''ٹھیک ہے۔چلئے......''

اختر چوہدری نے نوکروں کی طرح سر جھکا کر جواب دیا۔

اور......دونوں ہوٹل میں آگئے۔

کاؤنٹر مین نے اختر کو پہچان کر بڑے ادب سے سلام کیا کیونکہ ہوٹل کے ملازمین نے اس کی دریا دلی کی بڑی تعریف کی ہوئی تھی۔

''میر صاحب کے لیے اچھی سی چائے بنوا کر میرے کمرے میں بھیج دو......''

اس نے کاؤنٹر والے سے انور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اوکے سر......''

کاؤنٹر بوائے نے تعظیم گزاری۔

''آئندہ کبھی میری مرضی جانے بغیر میرے لئے کسی چیز کا آرڈر نہ کرنا۔''

انور نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

اختر چوہدری کو یوں لگا جیسے کسی نے زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کر دیا ہو۔

''معافی چاہتا ہوں۔''

''اب جتنی دیر تک چائے نہیں آجاتی ہم کام کی بات نہیں کر سکتے۔''

انور نے باتھ روم کا دروازہ کھول کر اس کا جائزہ لیتے ہوئے اختر کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ اختر نے خاموشی سے گردن جھکا لی اور وہ سامنے آرام دہ کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ اس درمیان اس نے دیکھا کہ اسلم نے کمرے کی ہر شے کو ٹھونک بجا کر دیکھ لیا تھا جس کے بعد وہ قدرے مطمئن ہو کر وہاں بیٹھا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو اختر نے خود اٹھ کر دروازہ کھولا اور ویٹر کی شکل پر نظر پڑتے ہی اس کی جان میں جان آئی۔

''برتن رات کو ڈنر کے ساتھ لے جانا۔''

اس نے ویٹر کو خالی ٹرے لوٹاتے ہوئے اس میں پہلے ہی ٹپ کا ایک نوٹ رکھ دیا تھا۔

''اوکے سر''......

ویٹر نے مؤدب لہجے میں کہا۔

اور......

جیسے ہی وہ باہر نکلا اختر چوہدری نے کمرے میں دھرے سنگھار میز کی دراز سے ''ڈونٹ ڈسٹرب'' کا سٹکر نکال کر کمرے کے باہر لٹکا دیا......!!

اب وہ ہمہ تن گوش تھا۔

چائے کے دو کپ انور نے خود تیار کیے تھے۔

''سامان نکالو......''

اس نے اپنا بیگ کھولتے ہوئے چوہدری اختر سے کہا۔

''او۔کے۔''

کہہ کر اختر نے اپنی مسہری کے نیچے ادھر اپنا سفری بیگ کھولا اور اس میں سے مطلوبہ سامان نکال کر انور کے سامنے رکھ دیا جس نے ایک ایک چیز کا بغور جائزہ لینے کے بعد مطمئن ہو کر جب تک سر اثبات میں نہیں ہلایا چوہدری اختر کی جان پر بنی رہی۔

''ویل ڈن......شاباش۔''

انور نے اپنا اطمینان ظاہر کیا۔

اب اس نے اپنے بیگ میں سے مطلوبہ سامان نکال کر باہر رکھ لیا تھا اور بڑے انہماک سے اپنے کام میں جت گیا۔

چائے پیتے ہوئے وہ چوہدری اختر سے ادھر ادھر کی باتیں بھی کرتا جا رہا تھا اور اپنا کام بھی۔ اس کے کام کی خوبی یہ تھی کہ ابھی تک اس نے اختر کو کسی بات کی سمجھ نہیں آنے دی تھی۔

وہ اسے پے در پے سرپرائز دے رہا تھا۔

اختر ذہنی طور پر ابھی لنگوٹ کس رہا ہوتا تھا کہ وہ بلا کی طرح اس کے سر پر نازل ہو جاتا۔ اس نے واقعتاً اختر چوہدری پر نفسیاتی فتح حاصل کر لی تھی اور اب وہ اس سے خاصا مرعوب دکھائی دینے لگا تھا۔

دو گھنٹے کی محنت شاقہ کے بعد اس نے اپنے بیگ میں موجود ایک اور چھوٹے سے بیگ میں بم تیار کر لیا تھا۔ جس میں ایک چھوٹی سی گھڑی نصب تھی۔ جس پر اب صرف ٹائم فکس کرنا باقی تھا۔ اس بیگ کا اور اس میں موجود بم کا سائز کسی بھی طرح ہاتھ میں پکڑے چھوٹے سے دستی بیگ سے زیادہ نہیں تھا۔

اپنے بیگ ہی میں موجود ایک چھوٹے سے میٹر سے جس میں پیلے نیلے اور لال رنگ کی تاریں بھی لگی تھیں اس نے آخری مرتبہ اپنے بنائے ہوئے بم کو چیک کیا اور پھر مطمئن ہو کر سر ہلا دیا۔ چوہدری اختر نے بھی یہ تربیت حاصل کی ہوئی تھی لیکن اس نے اندازہ لگا لیا کہ ''اسلم'' کو اس میں کمال حاصل ہے۔

''اسے کل صبح تک سنبھال کر رکھنا......امید ہے تمہیں ٹائم دینے کا طریقہ ضرور آتا ہو گا۔ کل صبح 9:00 بجے شرکت ہسپتال کے مین گیٹ پر ملاقات ہو گی......تم صبح یہاں سے

چیک آؤٹ کر کے سیدھے وہیں آ جاؤ گے...... اس کے بعد کی باتیں وہیں ہوں گی...... اور ہاں کل ملک صاحب سے بات ہوئی تھی...... گائیتری تمہیں بہت یاد کرتی ہے...... ملک صاحب نے کہا تھا۔ دونوں کام مکمل ہوتے ہی فوراً وہاں آ جانا...... یار تم نے کیا جادو کر دیا ہے اس لونڈیا پر...... سالی دن رات تمہارا ورد کرتی ہے...... اس کا بس چلے تو اڑ کر تم تک پہنچ جائے۔"

اس نے آخری فقرے چوہدری اختر کے سامنے وہ دہرائے تھے جو اسے پہلے سے بتائے گئے تھے۔

اس مرحلے پر اسے نفسیاتی طور پر قابو اور نارمل رکھنے کے لئے اس "یاد دہانی" کی بہت ضرورت تھی۔ چوہدری اختر کو اس بات کا علم ہی نہیں تھا کہ گائیتری کو شاید اس کا نام بھی یاد نہیں رہا تھا۔

وہ اب اختر جیسے کسی اور گدھے کو بے وقوف بنا رہی تھی۔

اور......

اس کے ساتھ ہی چند راتیں گزارنے کے بعد اپنے افسران کے حکم پر اس کو بھی گائیتری نے وہی کچھ کہا ہوگا جو اس نے چوہدری اختر کو آخری لحات میں کہا تھا۔ بات کچھ بھی رہی ہو......

لیکن......

یہاں جب "اسلم" نے اس کو گائیتری کی یاد دلائی تو اس کے دماغ میں جنم لینے والے معمولی خدشات نے بھی دم توڑ دیا۔

بم کی تیاری کے بعد اس پر جو معمولی سی گھبراہٹ طاری ہوگئی تھی وہ بھی ختم ہوگئی۔

اب وہ گائیتری کے جسمانی حصول کے لئے ایسے درجنوں بم نصب کر سکتا تھا۔

"اچھا میں چلتا ہوں...... کل ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ۔"

اس نے کمرے ہی میں اختر کی طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

اختر سمجھ گیا تھا کہ یہ دراصل اشارہ ہے اس کی طرف سے کہ اختر کو اسے چھوڑنے کے لئے نیچے تک آنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اور......

اس نے ایسا ہی کیا۔

انور کی کمرے سے روانگی کے بعد اس نے چھوٹے سے ہینڈ بیگ کو اپنے سفری

بیگ میں منتقل کیا اور اسے دوبارہ اپنی جگہ پر رکھنے کے بعد دروازے کے باہر سے "ڈونٹ ڈسٹرب" کا سٹکر اتار کر کمرے کو تالا لگا کر نیچے ہال میں آ گیا۔

اس نے جیسے تیسے آج کی رات بسر کرنی تھی......

اپنی بدفطرت کے ہاتھوں اس نے ایسی کوئی بھی رات گزارنے کا سامان پہلے ہی کر لیا تھا۔ اس ہوٹل کے ایک ویٹر نے جو اپنے "گاہکوں" کی پہچان میں ماہر تھا اس کی شب بسری کا مکمل سامان ضرورت پڑنے پر کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ اختر دراصل اس ویٹر کی تلاش میں ہال کمرے میں آیا تھا جو اختر کو نیچے آتے دیکھ کر سیدھا اس کی میز کی طرف جا رہا تھا۔

"یس سر"

اس نے بڑے مؤدب لہجے میں گر کہا۔

"آج...... مال اچھا ہونا چاہئے۔"

چوہدری اختر نے اس کے کان کے نزدیک سرگوشی کی۔

ویٹر قدرے جھک کر میز صاف کرتے ہوئے اس کی بات سن رہا تھا۔

"سر...... آپ کا دل خوش ہو جائے گا...... خادم کو یاد رکھیں گے۔"

ویٹر نے کاروباری مسکراہٹ سے جواب دیا۔

اختر نے اسے اپنی مرضی کے مطابق کچھ سنیکس لانے کے لیے کہہ دیا تھا۔ ویٹر نے اس کے سامنے تھوڑی دیر بعد سنیکس لا کر رکھ دیئے۔ اختر کی فراغت کے بعد جب وہ برتن اٹھانے آیا تو اس نے برتن اٹھاتے ہوئے جھک کر چوہدری اختر کے کان میں سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"رات نو اور دس کے درمیان سر!"

اور......

اختر جواب میں کچھ کہنے کے بجائے صرف مسکرا کر رہ گیا۔

جب ویٹر بل لے کر آیا تو اس نے جہاں بل کے ساتھ بل کی رقم کے برابر ٹپ اسے دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہزار ہزار کے دو نوٹ بھی الگ سے رکھ دیئے تھے۔

ویٹر نے کمال پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دونوں نوٹ اپنی قمیص کی اگلی جیب میں "شکریہ" کہہ کر رکھ لئے تھے اور اب اطمینان سے بل جمع کروانے کیشئر کاؤنٹر کی طرف جا رہا تھا۔

چوہدری اختر بازار کی طرف نکل گیا۔

اس نے اپنی داڑھی بڑھا کر حلیہ کچھ ایسا بنا لیا تھا کہ اس کے قریبی ساتھی بھی اسے بغور دیکھنے پر ہی پہچان پاتے۔

نو بجے تک آوارہ گردی کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ ٹھیک ساڑھے نو بجے اس کے دروازے پر مانوس دستک ہوئی۔ ویٹر ایک لڑکی کیساتھ باہر کھڑا تھا۔ اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی اختر نے دروازہ کھول دیا۔

دونوں اندر داخل ہو گئے۔

لڑکی نے اسے ادب سے سلام کرتے ہوئے اپنے جسم سے لپٹی چادر اتار کر ایک طرف پھینکی اور اپنے بڑے سے دستی بٹوے سے شراب کی ایک بوتل نکال کر باہر رکھ دی۔

"واہ بھئی واہ۔"

اختر چوہدری نے پہلے ویٹر اور پھر لڑکی کی طرف تحسین بھری نظروں سے دیکھا۔

"سر......صبح میں سات بجے آ جاؤں گا......ذرا احتیاط کرنی پڑتی ہے ناں......"

ویٹر نے ادب سے سر کو خم دے کر کہا۔

"ٹھیک ہے......"

اختر نے کہتے ہوئے دروازہ کھولا اور ویٹر وہاں دھرے چائے کے برتن اٹھا کر باہر نکل گیا۔

چوہدری اختر نے کمرے میں خطرناک بم کی موجودگی کو صبح تک بھلائے رکھنے کا سامان کر لیا تھا رات دیر گئے تک وہ اپنی درندگی کو تسکین پہنچاتا رہا جس کے بعد بیدم ہو کر سو رہا۔

صبح سات بجے ہوٹل کے آپریٹر نے حکم کے مطابق اسے فون کر کے گہری نیند سے جگا دیا۔ اختر کا بستر سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

لیکن......

اسے بادل نخواستہ اٹھنا پڑا کیونکہ ساڑھے سات بجے کا وقت اس نے ایک کار ڈرائیور کو دے رکھا تھا۔ جس کی کار کے ذریعے اسے شرکت ہسپتال کے نزدیک ایک جگہ جانا تھا لڑکی اس دوران غسل کے بعد تیار کھڑی تھی غالباً وہ خاصی دیر سے اس بزنس میں تھی اور وقت کی اہمیت کا احساس رکھنے والی......

اختر نے اسے طے شدہ معاوضے کے ساتھ ایک بڑا نوٹ بطور ٹپ دیا۔ لڑکی نے

کاروباری مسکراہٹ اس کی طرف اچھالتے ہوئے کمرے کا دروازہ کھولا اور "آئندہ ضرورت پڑنے پر کسی بھی خدمت کے لیے حاضر" کا فقرہ کہہ کر چپ چاپ جس طرح چادر لپیٹ کر آئی تھی اسی طرح اپنے گناہ آلود جسم اور داغدار روح کے ساتھ چادر میں منہ چھپائے وہاں سے چلی گئی۔

انور نے چوہدری اختر کے کمرے سے ہوٹل کے مین گیٹ تک کا سفر بلی کی طرح دبے پاؤں طے کیا تھا۔

وہ اس طرح چل رہا تھا کہ کاؤنٹر پر ایک گاہک کے ساتھ مصروف کلرک کی نظریں اس پر نہ پڑیں وہاں موجود کسی کو بھی اس کا علم نہ ہو سکا اور وہ اس طرح چپ چاپ ہوٹل کے مین گیٹ سے باہر نکل آیا۔

یہاں سے بازار پھر بازار سے مقامی کوچ سٹینڈ تک کا سفر اس نے پیدل طے کیا تھا۔ اس دوران وہ بڑی ہوشیاری سے اپنے چاروں اطراف کا جائزہ لیتا آیا تھا اور اب اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ کوئی اس کا تعاقب نہیں کر رہا۔ کوچ کے اڈے سے اس نے عام مسافروں کی طرح ٹکٹ لیا اور اگلے دو گھنٹوں میں وہ اپنے ٹھکانے تک پہنچ گیا تھا۔

اپنے شہر میں پہنچنے کے بعد اس نے فوراً مقامی پی سی او سے غیر ملکی کال بک کروائی اور اب تک کی کارگزاری کی ساری رپورٹ دینے کے بعد اگلی ہدایت حاصل کر کے فون بند کر دیا۔

اب وہ بڑا مطمئن ہو کر گھر جا رہا تھا۔

گھر پہنچا تو سلمٰی اور اقبال موٹر سائیکل پر کہیں گئے ہوئے تھے۔ انور نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا سلمٰی یہاں موجود نہیں ورنہ وہ بھی اس سے سوالات شروع کر دیتی۔

کہاں گئے تھے؟

کہاں سے آئے ہو؟

بتائے بغیر کیوں جاتے ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے بجائے اپنی والدہ اور خالہ کے سوالات کے جوابات دینے کے فوراً چائے چائے کا شور مچا دیا پھر انہیں ایک مقامی تاریخی عمارت میں اب تک کا سارا وقت گزارنے کی کہانی سنا دی اور ٹی وی لگا کر بیٹھ گیا۔

اقبال کا دل اب دفتر میں نہیں لگتا تھا۔

وہ جس جگہ کام کر رہا تھا وہاں زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا ہر کسی کی خواہش ہوا کرتی تھی کیونکہ وہاں زیادہ وقت گزارنے کا مطلب زیادہ پیسے کمانا...... پہلے اقبال بھی اس فارمولے پر نہ صرف یقین رکھتا بلکہ عمل بھی کرتا تھا۔

لیکن......

اب تو سلمیٰ کے بغیر دو پل گزارنا بھی اس کیلئے ممکن نہیں رہا تھا۔ آج بھی جب وہ دفتر کی چھٹی کے وقت سے ایک گھنٹہ پہلے ہی سٹور کو تالا لگا کر جانے کی تیاری کر رہا تھا اس کے ساتھی بڑی حیرانگی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"خیریت میاں صاحب زادے۔"

بٹ صاحب نے پوچھ لیا۔

"بس بٹ صاحب طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ گھر جا کر آرام کروں گا۔"

اس نے بٹ صاحب کی طرف دیکھ کر بیماروں جیسی شکل بنائی اور آفس کے لاؤنج میں کھڑی اپنی موٹر سائیکل کو کک مار کر سٹارٹ کرتا باہر آ گیا۔

وہ سلمیٰ سے بہت کچھ کہنا سننا چاہتا تھا۔

لیکن......

گھر میں وقت ہی نہیں ملتا تھا...... دونوں کو تنہائی کب میسر آتی تھی۔ اگر کچھ لمحات ملتے بھی تو دونوں اپنی روایتی شرم و حیا کے ہاتھوں مجبور ایک دوسرے کی طرف ٹکر ٹکر دیکھنے کے علاوہ کچھ کر ہی نہیں پاتے تھے۔

اقبال گھر کی طرف جاتے ہوئے دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ آج بھی معمول کی طرح انور گھر پر موجود نہ ہوتا کہ وہ سلمیٰ کے ساتھ اکیلے باہر جا سکے۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ سلمیٰ کیا اس کے ساتھ جانے پر اس کی ماں یا خالہ کو کوئی اعتراض ہرگز نہیں ہوگا۔

گھر موٹر سائیکل کھڑی کرنے کے بعد جب اس نے اپنی ماں کی شکل پر نظر پڑتے ہی پہلا سوال انور سے متعلق کیا اور جب اسے نفی میں جواب ملا تو خوشی سے اس کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

"اوہو...... میں نے تو پروگرام بنایا تھا۔ اس لئے آج دفتر سے جلدی آ گیا۔"

"اے بیٹا تم اپنے کسی پروگرام میں اسے شامل نہ کیا کرو...... اس کا تو یہی معمول ہے۔"

اس کی خالہ نے جو اقبال کی آواز پر کمرے سے باہر آ گئی تھیں جواب دیا......

"اوہو......"

اقبال نے بظاہر کف افسوس ملا۔

"ارے بیٹا تم سلمیٰ کے ساتھ چلے جاؤ ناں...... اس بے چاری کو خواہ مخواہ قیدی بنا رکھا ہے...... بھئی ادھر کا ماحول یہاں سے ذرا مختلف ہے۔ لڑکیاں سارا دن گھر میں پڑی رہیں تو بیمار پڑ جائیں۔"

خالہ ثریا نے کہا۔

اقبال کے لئے جیسے بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔

وہ سیدھا سلمیٰ کے کمرے تک چلا گیا۔

سلمیٰ ٹیپ ریکارڈ پر کیسٹ لگائے کچھ سن رہی تھی اور کسی کی موجودگی سے بے پرواہ ساتھ میں گنگنا بھی رہی تھی جب دروازے پر آہٹ ہوئی اور اس نے یک لخت چونک کر دیکھا سامنے اقبال کھڑا تھا۔

"ڈسٹرب تو نہیں کیا تمہیں۔"

اس نے سلمیٰ کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں...... میں کون سا ہوم ورک کر رہی تھی...... سخت بوریت ہو رہی تھی سوچا آپ کی اجازت کے بغیر آپ کی کچھ کیسٹس ہی سن لی جائیں...... برا مت مانئے گا۔"

سلمیٰ نے سنبھل کر اپنے دوپٹے کو ڈھنگ سے سینے پر پھیلاتے ہوئے کہا۔

"لیکن آپ آج جلدی نہیں آ گئے۔"

اب وہ اقبال سے مخاطب تھی۔

"میں نے سوچا آپ کو کچھ گھما پھرا لائیں۔ اپنا شہر ہی دکھا دیں اور کچھ حال دل بھی سنا دیں۔"

آخری فقرہ اس نے قدرے سرگوشی سے کہا تھا۔ سلمیٰ کے کان کی لوئیں سرخ ہو گئیں۔ سرمئی رنگ اچانک اس کے چہرے کی سنولاہٹ پر غالب آنے لگا تھا اور وہ اقبال سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھی۔

"باتیں کرنی تو کوئی آپ سے سیکھے۔"

بمشکل وہ اتنا ہی کہہ پائی۔

اچانک ہی اس کی ماں کمرے میں آ گئی۔

''گھوم آؤ بیٹی...... اب وہ موا تو گھر ہے نہیں...... چلو تم ہی اقبال کے ساتھ گھوم آؤ۔ بے چارہ لڑکا آفس سے چھٹی لے کر بھی آیا اور انور بھی غائب ہے۔''

خالہ ثریا نے کہا۔

''خالہ آپ بھی چلئے ناں......''

اقبال نے یوں ہی کہہ دیا۔

''بیٹا میرا تو جی بہت چاہتا ہے لیکن چل نہیں سکتی ناں...... پھر موسم بھی ایسا ہی ہے کہیں طبیعت بگڑ گئی تو پھر لینے کے دینے پڑ جائیں گے...... تمہاری ماں کے پاس سے اٹھ کر جانے کو اب جی ہی نہیں چاہتا۔'' خالہ نے کہا۔

''آیئے چلیں۔''

اقبال نے سلمیٰ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کہا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اب ایک لمحہ مزید یہاں ضائع کرے کیا معلوم انور ہی نہ ٹپک پڑے۔

''چلئے۔''

سلمیٰ نے بھی ان لمحات کو غنیمت جانا اور اسی طرح اٹھ کر باہر آ گئی۔

اقبال نے نوٹ کیا تھا کہ وہ یوں بھی زیادہ بننا سنورنا پسند نہیں کرتی تھی اور قدرے سادہ طبیعت رکھتی تھی۔ بس ایک انور ہی ان سب سے متضاد تھا۔ ایک مرد ہونے کے ناطے اقبال نے اس کے اندر چھپے شیطان کو دیکھ لیا تھا اور وہ بے چارہ بھی سوچ رہا تھا کہ شاید اس لئے انور ان کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزارتا کیونکہ اکیلے سے ذہنی آوارگی کے مواقع زیادہ میسر آ سکتے ہیں۔

سلمیٰ کے لئے زندگی میں کسی مرد کے برابر موٹر سائیکل پر بیٹھنے کا یہ پہلا موقعہ تھا۔

گھر کے باہر والی سڑک پر جا کر اس نے موٹر سائیکل سٹارٹ کی اور سلمیٰ کے ساتھ وہاں تک پیدل ہی آیا تھا۔ سلمیٰ اس کے پیچھے لیکن قدرے ہٹ کر بیٹھی تھی۔

''محترمہ کیا گرنے کا ارادہ ہے۔''

''میں سمجھی نہیں۔''

سلمیٰ نے جان بوجھ کر پوچھا۔

''ارے بی بی...... اگر میرے اور اپنے درمیان اتنا فاصلہ رکھ کر بیٹھو گی تو ہم دونوں

کا ہی خدا حافظ۔ یہ چار نہیں دو پہیوں والی گاڑی ہے...... اور یہاں کی ٹریفک بھی دہلی سے کچھ کم نہیں۔''

اس نے کہا اور سلمیٰ مسکرا کر رہ گئی۔

اس نے وہاں سے گزرتی موٹر سائیکلوں کے پیچھے بیٹھنے والی دوسری عورتوں کی دیکھا دیکھی اقبال کی کمر کے گرد بازو حمائل کر لیا تھا۔

لیکن......

اس عمل سے اس کے دل و دماغ پر جو ایک کیف سا سرور طاری ہونے لگا تھا وہ اسے مدہوش کئے جا رہا تھا اور دوسری طرف اقبال کو اپنے سارے جسم میں خون کے ساتھ ایک بے نام سا سرور سرایت کر جانے کے احساس نے کسی اور ہی جہان میں پہنچا دیا تھا۔

گھر سے اس تفریح گاہ تک پہنچتے ہوئے سلمیٰ نے گرم سانسوں نے اس کو گردن سے پاؤں تک مدہوش کر ڈالا تھا۔

باغ جناح کے سائیکل سٹینڈ پر اپنی موٹر سائیکل روکنے کے بعد جب سلمیٰ پچھلی سیٹ سے اتر کر اس کے سامنے کھڑی ہوئی تو اقبال کو یوں لگا جیسے کسی نے اسے بڑے خوبصورت خواب سے اچانک جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا ہو۔

سائیکل سٹینڈ سے ٹوکن وصول کرتے ہوئے اس کے ہاتھوں کی لرزش سلمیٰ نے بخوبی محسوس کر لی تھی۔ خود اس پر بھی یہی کیفیت سوار تھی۔

دونوں باغ کے ایک محفوظ کنج میں بیٹھے تھے۔

دونوں ہی ایک دوسرے کی طرف سے کسی بات کے منتظر تھے۔

دونوں ہی اپنے دلی جذبات کا اظہار ایک دوسرے پر کرنا چاہتے تھے۔

لیکن......

دونوں ہی کو گفتگو کے لئے کوئی آغاز میسر نہیں آ رہا تھا۔

بالآخر مرد ہونے کے ناطے اس نے ہمت کی اور عجیب سی بات کر دی۔

''یہ انور بھائی کیا وہاں بھی اسی طرح......''

اس نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''جی ہاں...... ان کی عادت پچھلے ایک سال سے اچانک بدل گئی ہیں۔ جب سے انہوں نے کسی محکمے میں نوکری کی ہے۔ اس طرح گھر سے غائب ہو جاتے ہیں اور بھی گندی

عادتیں اپنالی ہیں۔"

سلمٰی سے نہ رہا گیا۔

اقبال نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

بس وہاں کا ماحول ہی ایسا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہاں شراب وغیرہ پر پابندی ہے۔"سلمٰی نے بے اختیار کہا۔

اور......

اقبال کو سب کچھ سمجھ آ گیا۔

اب وہ مزید اس موضوع پر بات کر کے سلمٰی کو تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔

"آپ کے معمولات کیا ہیں؟"

اس نے سلمٰی کی طرف دیکھ کر چاہا کہ گفتگو کا موضوع بدل جائے۔

اور...... سلمٰی نے اسے اپنے گھر، کالج، سماج، سہیلیوں کے متعلق باتیں بتانی شروع کر دیں۔ اقبال کو یوں لگا جیسے اس نے یہ سوال کر کے پینڈورا باکس کھول دیا ہو۔ سلمٰی بڑے جوش وخروش سے اسے سب کچھ بتا رہی تھی۔ بات کرتے کرتے جب وہ اچانک ہنستی اور اس کے موتیوں ایسے دانت نمایاں ہوتے تو چہرے کی سنولاہٹ دو چند ہو جاتی اس کے گالوں پر گڑھے پڑنے لگتے اور اقبال کو یوں محسوس ہوتا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں پکڑ کر زور سے بھینچ دیا ہو۔

مقامی کینٹین کا ویٹر ان کے سامنے مشروب کی دو بوتلیں رکھ گیا تھا جو اب دونوں گھونٹ گھونٹ کر کے حلق سے اتار رہے تھے۔

اقبال نے واضح طور پر محسوس کیا کہ سلمٰی کو بھارتی سماج سے سخت نفرت ہے اور یوں لگتا تھا جیسے وہ وہاں بادل نخواستہ ہی زندگی بسر کر رہی ہے۔

"اقبال مجھے پہلے تو شاید اس کا علم نہیں تھا لیکن یہاں آنے کے بعد احساس ہوا ہے کہ آزادی کتنی بڑی نعمت ہے۔ کاش میرے والدین نے بھی پاکستان آنے کا فیصلہ خالہ کی طرح کیا ہوتا۔"

یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔

اقبال کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔

"بس سلمٰی اب تم وہ سب کچھ بھول جاؤ...... اب تم یہیں رہو گی۔ یہیں ہمارے

پاس...... دنیا کی کوئی طاقت اب ہمیں جدا نہیں کر سکتی...... سلمٰی...... میں نے پہلے تمہارا نام ہی سنا تھا...... دیکھا نہیں تھا...... دیکھا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے میں ہمیشہ سے تمہاری ہی کھوج میں رہا ہوں...... میری تو تلاش مکمل ہو گئی ہے سلمٰی......"

اس نے بے اختیار سلمٰی کے ہاتھ پر پھر ہاتھ رکھ دیا۔

"اقبال یہ میری خوش قسمتی ہو گی...... میرے جذبات بھی آپ سے مختلف نہیں ہیں۔ میں بھی آپ ہی کو تلاش کرتی یہاں تک آ گئی ہوں۔"

اس نے مضبوطی سے اقبال کا ہاتھ تھاما اور پھر ویٹر کو اپنی طرف آتے دیکھ کر دونوں نے ہاتھ الگ کر لئے۔

شام ڈھلے تک دونوں ایک دوسرے کے ساتھ محبت کے عہد و پیمان باندھتے رہے۔ جب سلمٰی نے اسے وقت کی نزاکت کا احساس دلا کر خواب سے بیدار کیا اور دونوں نے بادل ناخواستہ گھر کی طرف رخت سفر باندھا تو دونوں بہت مطمئن تھے۔

جیسے دونوں نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا ہو۔

جیسے دونوں نے اپنے سر پر دھری بوجھ کی گٹھڑی سے نجات حاصل کر لی ہو۔

اقبال نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ آج ہی اپنی ماں کو اپنے حال دل سے آگاہ کرے گا اور زندگی بھر کیلئے اس کا ساتھ مانگ لے گا۔

اس نے کہا تھا اب وہ خود دہلی آئے گا۔ اسے ہمیشہ ساتھ لے جانے کے لئے اور پھر اسے ہمیشہ کے لیے یہاں اپنی بنا کر اپنے پاس رکھ لے گا۔

کسی نادیدہ طاقت نے سلمٰی کو یقین دلایا تھا کہ پکے رنگ والے اس لڑکے کے دل و دماغ پر اس کی محبت کا بھی بہت پکا اور نہ اترنے والا رنگ چڑھ گیا ہے اور اس نے جو کچھ کہا ہے وہ ضرور کر کے دکھائے گا۔

گھر پہنچے تو انور آ چکا تھا۔

ماموں بھی ان دونوں کے منتظر تھے۔

انہوں نے آج اپنے گھر میں ان کے لئے کھانا پکوایا تھا اور اب انہیں لینے کیلئے آئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد تمام لوگ نزدیک ہی موجود ماموں کے گھر جا رہے تھے۔ آج خلاف معمول انور بڑھ چڑھ کر ان کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا اور بڑا چہک رہا تھا۔ اس نے پہلی مرتبہ گھر والوں سے بڑی بے تکلفی سے بات چیت کی تھی۔ کھانے سے فراغت پر وہ لوگ گھر

واپس لوٹے تو اقبال اپنی ماں کو اپنے ساتھ ہی چھت پر لے آیا۔

خیریت بیٹا۔

ماں نے اپنے سانس سنبھالتے ہوئے کہا۔

''خیریت ہی ہے اماں......بس آج یونہی تم سے باتیں کرنے کو جی چاہتا تھا۔''

اس نے ماں کو اپنی چارپائی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''میں کوئی بھاگی جارہی تھی بیٹا......ایسی ہی کیا بات ہے جو صبح نہیں ہوسکتی۔''

جنت بی بی سمجھ رہی تھی کہ اس کا بیٹا کیا کہنے والا ہے۔

وہ تو خود اس شبھ گھڑی کی کب سے منتظر تھی۔ اپنی بہن تک لے جانے میں اس کا یہی مقصد کارفرما تھا۔

وہ تو اللہ تعالیٰ سے کب سے اس رشتے کی پائیداری کی دعا مانگتی آئی تھی۔

اور......

جب اس کے بیٹے نے منہ سے وہ الفاظ نکالے جنہیں سننے کے لئے اس کے کان کب سے منتظر تھے اس کا دل بھر آیا۔

''یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔''

کہتے ہوئے اس نے بے اختیار اپنے بیٹے کو سینے سے چمٹا لیا۔

آج بہت عرصہ بعد اقبال کو یوں لگا جیسے وہ دوبارہ بچہ بن گیا ہو وہی چھوٹا سا بچہ جسے اس کی ماں بچپن میں معمولی سردی یا کوئی آواز بلند ہونے پر اس طرح اپنے سینے سے چمٹا لیا کرتی تھی۔

''بیٹا میں تو اللہ سے نہ جانے کب سے یہ دعائیں مانگ رہی تھی۔ ارے جب ثریا یہ کچھ سنے گی تو اس کا دل کتنا خوش ہوگا۔''

اس نے بیٹے کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔

اقبال کو آج سمجھ آئی تھی کہ اس کی والدہ گزشتہ کئی سالوں سے کیوں بھارت جانے اور اپنی بہن سے ملاقات کے لئے اتاؤلی ہوئی جاتی تھی اور کیوں وہ اس کے بغیر نہیں جارہی تھیں۔ اس نے اپنی ماں کے دل کی بات کہہ دی تھی۔

اگلے روز جب اقبال کے دفتر جانے کے بعد دونوں بہنیں علیحدگی میں بیٹھیں اور جنت بی بی نے اپنی بہن کو اقبال اور اپنی خواہش سے آگاہ کیا اور یہ بھی بتایا کہ اس کی خواہش

پر ہی وہ اپنی بہن سے بات کررہی ہے تو ثریا بیگم کا دل بھر آیا۔

''تمہارے منہ میں گھی شکر جنت بی بی......تم نے میری لاج رکھ لی جانے کب سے سلمیٰ کو تیری امانت سمجھ کر پال رہی ہوں۔''

یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

دونوں بہنیں اپنے خاندان کے پیاروں کی یاد میں سوگوار اور شادی مرگ کی سی کیفیت کا شکار ایک دوسرے سے بغل گیر ہوگئیں۔

''میرا خیال ہے اس میں بیٹی کی رضامندی بھی شامل ہے۔''

جنت بی بی نے اگلی بات بھی بتادی۔

''بہن میری طرف سے ہاں سمجھو ان کی طرف سے بھی انکار ہرگز نہ ہوگا۔ بس یہ ہے کہ تمہیں ایک مرتبہ شگن کرنے کے لئے دہلی ضرور آنا پڑے گا تم تو ان کو جانتی ہو۔ خان صاحب پانی پت کے ہیں اور ہر بات میں خاندان کا منہ دیکھنا ان کی فطرت ہے۔

میرے بس میں ہوتا تو سلمیٰ کا ہاتھ تمہیں سونپ کر ہی جاتی......بس ذرا خان صاحب کی طبیعت کا احترام ہے۔''

ثریا خالہ نے کہا۔

''تم بے فکر رہو آپا جیسا کہو گی انشاء اللہ ویسا ہی ہوگا۔ تمہارے بیٹے کے لئے ویزوں کا حصول کچھ ایسا مسئلہ نہیں ہے۔ اس بہانے میں اور تمہارے بھائی دونوں بزرگوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھ آئیں گے۔''

جنت بی بی نے کہا۔

دونوں بہنیں مستقبل کے منصوبے بنانے لگیں......!!

دونوں پھر ایک پروگرام پر متفق ہوگئیں......!!

۞......۞......۞

دھماکہ اور......

چوہدری اختر ہدایات کے مطابق عین وقت پر ہسپتال پہنچ گیا تھا۔

جیسے ہی وہ ایک رکشہ سے برآمد ہوا سڑک کے دوسرے کونے پر کھڑے انور نے اس کی طرف چلنا شروع کردیا۔ دونوں کا ٹکراؤ ہسپتال کے مین گیٹ کے نزدیک ہوا تھا۔ دونوں نے حسب سابق ایک دوسرے کی خیریت دریافت کی۔ چوہدری اختر نے ہاتھ میں وہی چھوٹا سا بیگ پکڑا ہوا تھا جس میں تباہی کا سامان نصب تھا۔ اس نے دیکھا انور کے ہاتھ میں خاکی رنگ کا ایک بڑا سا لفافہ پکڑا ہوا تھا جس میں اس شہر کی مشہور لیبارٹری کا نام چھپا تھا۔

اس نے لفافہ چوہدری اختر کی طرف بڑھا دیا۔

چوہدری اختر نے اس کی بات سمجھتے ہوئے دل ہی دل میں اس کی ہوشیاری کی داد دی کیونکہ لفافے میں کچھ ایکسرے دکھائی دے رہے تھے۔ اس بات کا تو اسے بھی علم تھا کہ یہ ایکسرے اس نے کوڑے کرکٹ کے کسی ڈھیر سے اٹھا کر اس میں رکھے ہوں گے۔

لیکن......

اب کوئی ان کی طرف شک کی نظروں سے نہیں دیکھ سکتا وہ بالکل مریضوں کے لواحقین کی طرح سر جھکائے اور قدرے حواس باختہ مین گیٹ سے اندر داخل ہوئے۔ ان جیسے درجنوں لوگ یہاں پہلے ہی موجود تھے اس لئے کسی نے ان کی موجودگی کا نوٹس نہ لیا......

چوہدری اختر نے انور کی ہدایت پر بطور خاص یہ احتیاط برتی تھی کہ وہ شکل اور کپڑوں سے کوئی غریب قسم کا دیہاتی نظر آئے۔ ابھی تک اس نے اپنی داڑھی نہیں منڈوائی تھی اور مونچھوں کے بالوں نے سارے ہونٹ ڈھانپ لئے تھے۔

انور نے اسے اپنے پیچھے آنے کی ہدایت دی تھی دونوں چلتے ہوئے آؤٹ ڈور میں ایک کونے میں دوسرے بنچ پر بیٹھ گئے۔ یہ چھوٹا سا پتھر کا بنچ تھا جس پر دو آدمیوں کے بیٹھنے کی

گنجائش ہی تھی۔ آؤٹ ڈور کے بڑے سے ہال میں مختلف دفاتر تینوں کونوں پر بنے تھے۔ درمیان میں موجود خلا میں مریضوں اور ان کے لواحقین کے بیٹھنے کی جگہ بنائی گئی تھی۔ چوتھی سمت البتہ خالی تھی ادھر داخلے کا دروازہ اور شیشے کی ایک دیوار پھیلتی دکھائی دے رہی تھی۔ مریضوں کی سہولت کے لئے آؤٹ ڈور کے ایک کونے میں موجود لیبارٹری سے ملحقہ باتھ روم تھے۔ جنہیں مریض اور ان کے لواحقین استعمال کرتے تھے۔ اختر نے ان باتھ روموں میں سے ایک کو اپنی شیطانی کارروائی کے لئے منتخب کیا تھا۔ وہ ان سب غسل خانوں کا بھرپور جائزہ لے چکا تھا اور اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ان میں سے کون سا باتھ روم ان کے لئے زیادہ مناسب رہیگا۔

''ہمیں اس بات کی پرواہ نہیں کہ جانی نقصان کتنا ہوتا ہے...... دہشت پھیلنی چاہئے۔ دہشت......عوام کو خوفزدہ ہونا چاہیے۔''

آخری لمحات پر مسٹر سنگھ کے کہے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

اور......

اس نے بھی اپنے آقاؤں کے احکامات کا احترام کرنا زیادہ مناسب سمجھا تھا۔

''جاؤ باتھ رومز کا ایک چکر لگا آؤ...... تین نمبر باتھ روم میں ضرور جانا۔''

اس نے چوہدری اختر کو ہدایت دی جو کچھ گھبراہٹ کا شکار دکھائی دے رہا تھا جبکہ وہ خود بالکل مطمئن تھا۔

چوہدری اختر اس کے حکم پر کسی میکانکی عمل کے تابع اٹھا۔ وہ واقعی اس وقت باتھ روم تک جانے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔

اس کی واپسی قریباً تین چار منٹ بعد ہوگی۔

''ہوں؟''

انور نے اس کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

''ٹھیک ہے تین نمبر سے ہی آیا ہوں۔''

چوہدری اختر نے تھوک نگل کر کہا۔

''چوہدری صاحب حوصلہ کریں۔ گائیتری تو آپ کی بہادری کی بہت تعریف کرتی تھی۔ آپ پر تو لرزہ طاری ہو رہا ہے۔ اپنے آپ کو سنبھالئے۔ اگر تمہیں اس کام میں کچھ دقت محسوس ہو رہی ہے تو واپس چلتے ہیں۔ میں ان لوگوں کو بتا دیتا ہوں کہ تم گھبرا گئے تھے لیکن اس

کا انجام تم جانتے ہو ناں......"

انور نے اس پر زبردست نفسیاتی حملہ کر کے اس کی بزدلی کو وقتی دلیری میں بدلنا چاہا۔ چوہدری اختر فوراً سنبھل گیا۔

انور کی گفتگو کے آخری فقرے نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیئے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ واقعی اگر وہ یہ کام نہ کر سکا تو اس کا انجام بہت برا ہوگا۔ گائیتری تو گئی جہنم میں......لیکن بھارتی انٹیلی جنس والے اس کے خلاف تمام ثبوت پاکستانی ایجنسیوں تک پہنچا کر اسے کتے کی موت مروا ڈالیں گے۔ ایک مرتبہ ان لوگوں کے چنگل میں پھنسنے والے کی حالت دھوبی کے کتے کی طرح ہو جاتی تھی پھر وہ گھر کا رہتا تھا نہ گھاٹ کا۔ چوہدری اختر کو اس بات کا علم تھا کہ یہ لوگ جس کو اپنے "وائیو چکر" (شیطانی چکر) میں پھنسا لیں وہ پھر ساری زندگی اپنی مرضی سے جی نہیں سکتا۔ وہ جانتا تھا کہ کسی کام میں ناکامی کی صورت میں بھی مقامی ایجنٹ دوبارہ سرحد عبور کر کے ان سے معافی کے طلبگار ہوتے تھے اس نے ایک مرتبہ سرحدی پوسٹ پر ایک ایسے شخص کو دیکھا تھا جس کا ایک بازو قریباً جلا ہوا تھا اسے بتایا گیا کہ اس نے ایک مشن ادھورا چھوڑا تھا اور پھر خود ہی ادھر معافی مانگنے آیا تھا جس پر مسٹر سنگھ نے اسے بڑی اذیتیں دی تھیں۔ اس کا سارا بازو گرم سلاخوں سے اس بری طرح داغا گیا تھا کہ اب وہ ایک ہاتھ سے قریباً معذور ہو کر رہ گیا تھا۔

لیکن......

ابھی تک ان کے لئے کام کر رہا تھا۔

خود اسے ورما ملک نے کہا تھا۔

"چوہدری صاحب ہم اپنے یاروں کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ اپنی بہو بیٹیاں ان کو پیش کر دیتے ہیں لیکن......ان کی ناکامی کی صورت میں پھر ہم ان کے خون کے پیاسے بھی ہو جاتے ہیں......ہم ناکام رہنے والوں کے دوست نہیں......ہماری دوستی صرف کام کرنے والے اور کامیابی حاصل کرنے والوں سے ہے......ہم ناکام لوگوں کے دوست کبھی نہیں بنتے۔ یہ اس کھیل کا اصول ہے یہاں ہارنے والے کی سزا موت ہے موت......یہ موت کا کھیل ہے چوہدری اختر......اسے تم جیسے جوان مرد ہی کھیل سکتے ہیں۔ تم بھی کبھی ناکام نہ لوٹنا......یاد رکھنا تمہاری ناکامی کی صورت میں تمہیں کوئی نہیں بچا سکتا......میں بھی نہیں......بھگوان بھی نہیں۔"

یہ باتیں ورما ملک نے گائیتری کے ساتھ دو تین راتیں بیتانے کے بعد اس سے کہی تھیں۔ ان دنوں اس پر گائیتری کی جنسیت کا بھوت سوار تھا۔

یوں بھی اس نے یہ سودا کوئی مہنگا نہیں جانا تھا۔

گائیتری جیسی خوبصورت عورت کے حصول کے لئے تو دو ملکوں کی جنگ ہو سکتی تھی۔ واقعی اسے پانے کے لئے موت سے دوستی کوئی مہنگا سودا نہیں تھا۔ اس نے تب گائیتری کی موجودگی میں گردن پھلاتے ہوئے کہا تھا۔

"ملک صاحب......ہم نے بھی زندگی میں کبھی ہارنے والے گھوڑے پر داؤ نہیں لگایا......جب اس کھیل میں آ ہی گئے تو اس کے اصول تو ماننے پڑیں گے۔"

اور......

ورما ملک مسکرا کر رہ گیا۔

اس نے رُخ بدل کر گائیتری کو آنکھوں کے اشارے سے شاباش دی کہ شکار واقعی اس کے قابو میں ہے۔

"کیسی بات کرتے ہو اسلم صاحب......میں نے کب انکار کیا ہے۔"

اس نے گھبرا کر اور سنبھل کر جواب دیا۔

"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ تم نے انکار کیا ہے لیکن تم خود پر قابو تو پاؤ۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ یہ تو معمولی کام ہے......تم نہیں کر سکتے تو میں کر دیتا ہوں۔"

انور نے دوبارہ حملہ کیا۔

"نہیں......نہیں......میں خود کروں گا۔ بتاؤ کیسے کرنا ہے۔"

"ہوں......یہ ہوئی ناں بات......تو سنو۔"

اس نے سرگوشی کے انداز میں چوہدری اختر کو سمجھانا شروع کیا۔

چوہدری اختر نے ہونقوں کی طرح اس کی ہر بات پر ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بظاہر یہی تاثر دیا کہ وہ بالکل نارمل ہے۔

انور نے اپنی بات مکمل کرنے کے بعد چوہدری اختر سے دوبارہ پوچھا کہ اس نے کیا کیا کرنا ہے اور مطمئن ہو کر سر ہلا دیا۔

"او۔ کے اب تم جاؤ......تین نمبر باتھ روم خالی ہے گڈ لک۔"

اس نے حکم دیا۔

اور......

چوہدری اختر بے وقوف اور خوفزدہ ملازم کی طرح اس کی تعمیل میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ایکسرے رپورٹس وہیں رہنے دی تھیں اور چھوٹا سا دستی بیگ پکڑے دوبارہ باتھ روم کی طرف جا رہا تھا۔

انور نے اسے جاتے دیکھا اور جیسے ہی باتھ روم کا دروازہ بند ہوا وہ رپورٹس والے لفافے سمیت اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

پہلے اس نے اپنا رخ آؤٹ ڈور کے ڈسپنسری کاؤنٹر کی طرف کیا پھر اس کے اوپر سے چکر لگا کر قدرے ویران سیڑھیوں سے ہوتا ہوا برآمدے میں آ گیا۔

پہلے فلور کے اس برآمدے کے کونے میں موجود چھوٹے سے سٹور کے بند دروازے کے نیچے اس نے لفافے میں موجود ایکسرے رپورٹس جو اس نے واقعی کسی کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے اٹھائی تھیں اندر پھینکیں۔ خالی لفافے کو دوہرا کرنے کے بعد توڑ مروڑ کر دوسرے کونے میں رکھے ''ڈسٹ بن'' میں پھینکا اور بڑے اطمینان سے چلتا ہوا برآمدے کے دوسرے کونے پر موجود سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا اب وہ دوبارہ آؤٹ ڈور میں تھا جہاں سے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا......

اس سارے عمل میں اس نے بمشکل تین منٹ صرف کئے ہوں گے۔

یہاں سے نکل کر اس نے مین گیٹ کا رخ کیا اور اب ہسپتال کے مین گیٹ کے سامنے سے گزرتی سڑک کے دوسرے کونے میں ہسپتال کے مریضوں اور ان کے لواحقین کی خدمت کے لئے بنے دو معمولی سے ہوٹلوں میں سے ایک ہوٹل کے لکڑی کے بینچ پر بیٹھ کر دکاندار کو چائے لانے کے لئے کہہ دیا۔

اسے اب دھماکے کا انتظار تھا اس کے بعد ہی اس نے یہاں سے جا کر اپنے مالکان کو رپورٹس دینا اور ان سے اگلے احکامات وصول کرنے تھے۔

بڑے اطمینان سے وہ چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔

✿......✿......✿

چوہدری اختر نے باتھ روم نمبر تین میں پہنچ کر دروازہ اندر سے لاک کیا اور اپنے بے قابو دل کی دھڑکنوں کو نارمل کرنے لگا۔

انور کی ہدایت کے مطابق اس نے کموڈ کے اوپر لگے شاور سپلائی دینے والے پانی کی لائن کو پہلے بند کیا پھر شاور ٹپ میں موجود پانی کو پلاسٹک کے ڈبے پر لگے ہینڈل کو کھینچ کر فلش کر دیا۔

اب اس نے کانپتے ہاتھوں سے وہ ڈھکن اتار کر اس طرح نیچے رکھا کہ معمولی سی آواز بھی پیدا نہ ہو۔

اس اطمینان کے بعد کہ اب اس میں پانی نہیں آ رہا۔ اس نے اپنے چھوٹے سے بیگ کو کھولا اور اس میں انور کے تیار کردہ بمشکل آدھا فٹ لمبائی چوڑائی والے انتہائی تباہ کن بم کے عین درمیان لگی گھڑی کو تین منٹ کا ٹائم دے کر اس کی ٹک ٹک سننے کے لئے کان اس کی طرف لگائے۔

گھڑی کی ٹک ٹک اس کے دل کی دھک دھک سے ہم آہنگ تھی۔

یہ سارا ہال ایئر کنڈیشنڈ تھا۔

لیکن......

چوہدری اختر کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ رہی تھیں۔

اس کے بدن پر لرزہ اور ہاتھوں میں رعشہ طاری تھا۔ زندگی بچانے کی لگن نے اسے موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔

اس کے ذہن میں صرف ایک ہی دھن سوار تھی کہ اگر وہ ناکام رہا تو مارا جائے گا۔ کامیابی کی صورت میں کم از کم سرحد پار کی طرف سے تو موت کا خطرہ نہیں رہے گا جہاں تک ادھر کا سوال ہے عین ممکن ہے کہ وہ ان لوگوں کی نظروں سے بچا رہے۔

آخر اب تک بھی تو وہ بچا ہی رہا تھا۔

بم لگانے سے پہلے وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ معمولی سا کام ہے۔ بم انور نے بنانا ہے اور اسے وہاں رکھنا ہے۔

جہاں اسے بم رکھنا تھا وہ کوئی فوجی چھاؤنی نہیں ایک ہسپتال تھا جہاں لوگ زندگی کی بھیک مانگنے آیا کرتے تھے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ کوئی ایسا وحشی درندہ بھی ہے جو یہاں بم رکھ کر جان بلب مریضوں اور ان کے زندہ درگور لواحقین کی جان لینے کی سازش بھی کر سکتا ہے۔

لیکن......

اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کی سوچ غلط تھی۔

احساس جرم تھا۔

احساس ندامت تھا۔

یا پھر...... پاکستانی ایجنسیوں کا خوف، گرفتاری کا ڈر جس نے چوہدری اختر جیسے جوان مرد کے اعصاب شکن کر دیئے تھے۔

وہ بری طرح گھبراہٹ کا شکار تھا۔

لیکن......

اسے یہ کام بہرحال اپنے انجام تک پہنچانا تھا۔ بصورت دیگر وہ خود مارا جاتا۔ اسے خود زندہ رہنے کے لئے جان بلب مریضوں اور زندہ درگور لواحقین کی جان لینی تھی۔

اس کی حالت اس ڈریکولا جیسی تھی جسے اپنی زندگی بچانے کے لئے کسی نہ کسی بے بس اور بے کس کا خون پینا تھا۔ وہ انسان نہیں ڈریکولا تھا۔

انسانی خون پی کر زندہ رہنے والا ڈریکولا۔

اس وقت اس کی حالت بالکل ایسی زندہ لاش کی سی تھی جیسی اس نے انگریزی فلموں میں دیکھی تھیں۔

انور نے کمال کا بم بنایا تھا۔

اتنا چھوٹا اور ایسا طاقتور بم اس نے نہیں دیکھا تھا۔ بہرحال یہ وقت انور کو داد دینے کا نہیں اپنی جان بچانے کا تھا۔

اس نے اس اطمینان کے بعد کہ اب کام مکمل ہو گیا ہے۔ بم کو دوبارہ اسی ریکسین کے چھوٹے سے ہینڈ بیگ میں رکھا پھر اسے کموڈ کے سر پر نصب پلاسٹک ٹب میں رکھ کر جیسے تیسے کانپتے ہاتھوں سے اس پر ڈھکن رکھ کر باہر نکل آیا۔

باہر نکلنے سے پہلے اس نے انور کی آخری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے دروازے کے لاک کا سرخ بٹن اندر سے دبا کر باہر نکلنے کے بعد دروازہ بند کیا تھا۔

اب دروازہ لاک ہو چکا تھا۔

انور ہی کی ہدایت کے مطابق اس نے واپسی کے لئے آؤٹ ڈور کے برآمدے کو عبور کرنے کے بجائے باتھ رومز کی قطار کے دوسرے کونے سے نکل کر آؤٹ ڈور ڈسپنسری کے اوپر سے چکر کاٹ کر انور والا راستہ اختیار کیا تھا اور آؤٹ ڈور کے بغلی دروازے سے باہر آیا تھا۔

بم پر اس نے تین منٹ کا وقت دیا تھا۔

اسے یہاں سے باہر آنے تک بمشکل دو منٹ لگے ہوں گے جس تیز رفتاری سے وہ آیا تھا اور جس طرح اس کے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اگر کوئی غور سے اس کی شکل دیکھتا تو ضرور اس پر شک کرتا۔

لیکن......

کسی نے اگر اس کی طرف سرسری نظر سے دیکھا بھی تو نظرانداز کر دیا ہوگا کیونکہ یہاں سب خوفزدہ تھے اپنے پیاروں کی ممکنہ موت سے سب کے چہرے زرد ہی تھے...... انہوں نے تب یہی سمجھا ہوگا کہ یہ بھی ان کی طرح کوئی گھبرایا ہوا اور پریشان حال کسی جان بلب مریض کا کوئی قریبی عزیز ہے جو شاید اپنے مریض کے لئے اچانک آ پڑنے والی کوئی ضرورت پوری کرنے کے لئے بوکھلایا ہوا ہے۔ اب چوہدری اختر نے یہاں سے غائب ہو جانا تھا۔

اس نے جیسے ہی ہسپتال کے مین گیٹ کے نزدیک قدم رکھا اچانک اس کے عقب سے زوردار دھماکہ ہوا۔ گیٹ کے نزدیک موجود تمام لوگ گھبرا گئے۔

دھماکے کے ساتھ ہی چیخوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھی۔ خوفزدہ لوگ جس طرف جس کا منہ تھا ادھر ہی بھاگ رہے تھے۔

چوہدری اختر جس کا دل دھماکے کی آواز کے ساتھ اسی رفتار سے دھڑکا تھا دوسرے خوفزدہ لواحقین کی طرح باہر کی طرف بھاگا جہاں اب بھیڑ جمع ہونے لگی تھی اُس نے رک کر اپنے سانس اور دھڑکنوں کو سمیٹا اور پھر پیدل ہی ایک طرف چلنے لگا اس کا رخ ویگن شاپ کی طرف تھا۔

ویگن روانگی کے لیے تیار تھی۔ دھماکے کی آواز یہاں بھی سنائی دی تھی لیکن ویگن کے ڈرائیور نے اس کا کوئی خاص نوٹس نہ لیا۔

اختر نے ویگن میں بیٹھ کر اپنے ہاتھ میں پکڑے دو روپے کنڈیکٹر کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھے اور سیٹ پر ٹیک لگا کر خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرنے لگا وہ ابھی تک گھبراہٹ کا شکار تھا۔

قریباً ڈھائی تین کلومیٹر دور ایک پررونق علاقے میں وہ ویگن سے اتر گیا۔ اب اسے کسی نائی کی دکان کی تلاش تھی۔ یہاں شاید ابھی بم دھماکہ کی اطلاع نہیں پہنچی تھی کیونکہ انسانوں کی دونوں طرف دوڑتی بھیڑ معمول کے مطابق تھی۔

سڑک کے کنارے ایک نائی کی دکان میں گھس کر وہ ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اپنی بڑھی ہوئی ڈاڑھی اور مونچھوں پر اس نے مشین پھیروا کر اپنی اصلی صورت شیشے میں دیکھی اور نہانے کے لئے حمام میں گھس گیا۔

حمام میں اس نے بمشکل پانچ منٹ لگائے تھے باہر آ کر اس نے ایک رکشہ لیا اور شہر کے شمال کی سمیت ایک مشہور بازار کا رخ کیا۔ یہاں رکشہ سے اتر کر وہ دوسرے رکشہ سے ایک اور جگہ پہنچا اور پھر مزید دو رکشہ بدلنے کے بعد شہر کے بازار حسن میں پہنچ گیا جہاں اس کا آنا جانا اکثر لگا رہتا تھا۔

رات اس نے شراب اور شباب کے سہارے گزاری اور صبح اپنے ڈیرے پر پہنچ گیا۔

✿......✿......✿

انور نے بھی دوسرے گاہکوں کی طرح دھماکے کی زوردار آواز سنی تھی۔

زخمی ہونے والوں اور خوفزدہ لوگوں کی چیخ و پکار یہاں بھی سنائی دے رہی تھی۔

دھماکے کی زوردار آواز نے یہاں موجود تمام لوگوں پر گھبراہٹ طاری کر دی تھی۔

''کیا ہوا؟...... کیا ہوا؟''

ہر کوئی ایک دوسرے سے دریافت کر رہا تھا۔

ایک شخص کچھ کہتا ہوا اس طرف آ رہا تھا۔ ہوٹل کے نزدیک وہ رک گیا۔ اس کے منہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور شاید وہ بولنے کی ہمت بھی نہیں کر پا رہا تھا۔

''اسے پانی پلاؤ...... پانی۔''

انور نے آواز لگائی۔

ہوٹل کے ایک ملازم نے اسے کرسی پر بٹھا کر پانی پلایا اور اپنی دانست میں اس کے کندھے دبا کر نارمل کرنے کی کوشش کی۔ نووارد کے گرد بھیڑ جمع ہو گئی تھی۔

''کیا ہوا...... کیا ہوا؟''

سب ایک ہی سوال کر رہے تھے۔

''بم پھٹ گیا...... بہت سارے لوگ مر گئے۔ بلڈنگ تباہ ہو گئی۔''

اس نے گھبراہٹ میں تین فقرے ہی کہے تھے جب تین چار اور لوگ بھی بھاگتے ہوئے وہاں پہنچ گئے ان کی حالت بھی کچھ مختلف نہیں تھی۔ ایک کے تو سر سے خون بھی بہہ رہا تھا۔

لیکن......

وہ شاید کوئی فوجی تھا۔ کیونکہ ان سب میں حوصلہ مند دکھائی دے رہا تھا۔

''بم بلاسٹ ہوا ہے...... آؤٹ ڈور میں بم بلاسٹ ہوا ہے...... اور میرے خدایا! بہت نقصان ہوا...... تم لوگ میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ ادھر زخمیوں کی مدد کرو۔ بہت لوگ زخمی ہوئے ہیں۔''

یہ کہہ کر اس نے ایک میز پر دھرے سلور کے پانی والے جگ سے منہ لگایا اور غٹا غٹ پانی پی گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ دوبارہ ہسپتال کی طرف بھاگا۔

''تم زخمی ہو۔ ہم جاتے ہیں۔''

ایک نوجوان نے کہا۔

''کوئی بات نہیں...... پرواہ نہیں۔ میں فوجی ہوں مجھے ٹریننگ ہے۔ میں ان کی مدد کروں گا۔'' وہ بڑبڑانے کے انداز میں بولا اور لوگوں کے منع کرنے کے باوجود ہسپتال کی طرف بھاگ اٹھا۔

اس کے تعاقب میں دوسرے لوگ بھی زخمیوں کی مدد کو بھاگے۔

انور اپنی جگہ بیٹھا رہا پھر وہ اس خالی رکشہ کی طرف گیا جو کوئی سواری لے کر آیا تھا۔

''کیا ہوا باؤ جی۔''

رکشہ والے نے اس سے پوچھا۔

''شاید کوئی گیس سلنڈر پھٹ گیا ہے دھماکہ کی آواز آئی تھی۔ یار تمہاری مہربانی ذرا جلدی چلو مجھے اپنے مریض کے لئے خون کا بندوبست کرنا ہے...... میری ماں کا آپریشن ہے تمہاری مہربانی جلدی کرو......''

اس نے رکشہ ڈرائیور کے ہاتھ پاؤں پھلا دیئے۔

''چلو باؤ جی چلو...... یا اللہ خیر کریں۔''

رکشہ ڈرائیور دھماکہ بھول کر انور کی پریشانی پر متوجہ ہوا۔

رکشہ ڈرائیور اس سے سوال کر رہا تھا لیکن انور نے اسے ہر سوال کا ایک ہی جواب دیا تھا کہ وہ تو باہر خاصی دیر سے رکشہ کے انتظار میں کھڑا ہے کیونکہ اسے اپنی ماں کے لئے خون کا بندوبست کرنا تھا۔

یہاں سے چار پانچ کلومیٹر دور ایک بلڈ بینک کے نزدیک وہ اتر گیا اسے پریشان

حال جان کر رکشہ ڈرائیور نے کرایہ بھی معمول سے کچھ کم ہی لیا تھا۔

رکشہ ڈرائیور کو دکھانے کے لئے وہ بلڈ بینک کی عمارت میں گھسا اور جیسے ہی رکشہ دوبارہ سٹارٹ ہونے کی آواز آئی وہ باہر آ گیا۔

یہاں سے وہ اگلے آدھ گھنٹہ میں مزید تین رکشہ تبدیل کرنے کے بعد بڑے بازار تک پہنچ گیا۔ بڑا بازار اس شہر کا مشہور تجارتی مرکز تھا جہاں اس نے دو روز پہلے ایک پرائیویٹ پی سی او تاڑا تھا جہاں سے غیر ممالک کو کالیں کروائی جاتی تھیں۔

اسے اندازہ تھا کہ ایسے پبلک فون بوتھ عموماً ناجائز ہوتے ہیں اور یہ لوگ ایکسچینج والوں سے مل کر کام کرتے ہیں اس لئے یہاں سے ہونے والی ٹیلی فون کالوں کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھا جاتا۔

یہاں سے اس نے اپنے مخصوص نمبر پر کال بک کروائی اور پھر لائن ملنے پر باتیں کرنے لگا۔

”مبارک ہو سر!“

اس نے مختصر سا کوڈ دہرایا۔

”ویل ڈن شاباش۔“

دوسری طرف سے کہا گیا۔

ابھی ابھی ڈلیوری ہوئی ہے۔ آپ کو خبر مل جائے گی۔“

اس نے کہا۔

”ٹشو پیپر کیسا رہا۔“

دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ یہ وہ کوڈ تھا جو ”را“ اپنے زر خرید ایجنٹوں کے لئے دہراتی تھی۔

”گدھا۔“

انور نے متعلقہ کوڈ دہرایا۔

”آل رائیٹ...... اسے USE کرنے کے بعد ٹریش Trash کر دینا...... اگلا مال بھی جتنی جلدی ممکن ہو بھیج دو......“

دوسری طرف سے کہا گیا۔

”ٹھیک ہے سر۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

اور...... کال ختم ہو گئی۔

ایک زہر خندہ مسکراہٹ کے ساتھ اس نے فون واپس رکھ دیا۔ اپنا بل ادا کیا اور اسی طرح مسکراتا ہوا باہر آ گیا۔

اب وہ گھر جا رہا تھا۔

دوپہر کا کھانا اس نے گھر والوں کے ساتھ کھایا جب اس کی والدہ نے اسے اعتماد میں لے کر بتایا کہ اس نے سلمیٰ کے لئے اقبال کا رشتہ قبول کر لیا ہے۔

”ارے اماں بی...... اس سے زیادہ خوش قسمتی کی بات اور کیا ہو گی...... اس طرح ہمارا ٹوٹا ہوا بندھن پھر سے بندھ جائے گا۔“

اس نے خوشی کا اظہار کیا۔

✿......✿......✿

شام کو اقبال گھر لوٹا تو اس نے ہاتھ میں اخبار کا ایک ضمیمہ پکڑا ہوا تھا اور بہت اداس دکھائی دے رہا تھا۔

”بیٹا خیریت تو ہے۔“

اس کی خالہ نے پریشانی سے دریافت کیا۔

”خالہ بڑا افسوسناک واقعہ ہو گیا۔ شرکت ہسپتال میں بم دھماکہ ہوا ہے اور۔“

وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ پایا۔

”ہائے اللہ برباد کرے ان حرام خوروں کو جنہوں نے ہسپتال بھی نہ چھوڑا۔“

اس کی والدہ نے کف افسوس ملا۔

”ارے...... کیا کہہ رہے ہو بھائی ہسپتال میں دھماکہ؟ ذرا اخبار دکھانا۔“

انور نے حیرت سے کہا اور اخبار دیکھنے لگا۔

اخبار نے ہسپتال کی تباہی کی تصویریں شائع کی تھیں اور خبر کے مطابق ایک باتھ روم میں رکھے بم کے پھٹنے سے چار لوگ موقعہ پر مارے گئے تھے درجنوں زخمی ہوئے اور آؤٹ ڈور کی عمارت تباہ ہو گئی تھی...... اتنا نقصان ہوا تھا کہ ہسپتال انتظامیہ کے مطابق اگلے اعلان تک ہسپتال میں نئے مریضوں کی چیکنگ ممکن نہیں رہی تھی۔

”افسوسناک...... کیا ہو گیا ہے اس ملک کو۔“

اس نے اخبار ایک طرف رکھ کر کہا۔

دونوں قیاس آرائی کرنے لگے۔ اقبال نے اس کا الزام بھارت پر لگا دیا تھا جبکہ انور نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی اور بھارت کو مسلمانوں کا دشمن نمبر ون گردانا تھا...... رات دیر گئے تک وہ اس موضوع پر باتیں کرتے رہے۔

ٹی وی اور ریڈیو کی خبروں سے فضا بڑی سوگوار ہوگئی۔ اس روز گھر میں سب سے زیادہ سکون کی نیند انور سویا تھا۔

اسے اطمینان تھا کہ اس کے مالکان اس کی کارکردگی سے ضرور مطمئن ہو گئے ہیں اور واپسی پر انعام کی ایک خطیر رقم اس کی منتظر ہوگی۔ عیاشی اسے ''بونس'' میں ملنے والی تھی۔

✡......✡......✡

ارسلان کو اس حادثہ جانکاہ کی اطلاع اس وقت ملی جب وہ اپنے خاص لوگوں کے ساتھ ایک میٹنگ کر رہا تھا جس میں اس کے چاہنے والے اسے اگلے انتخابات میں حصہ لینے کے لیے کہہ رہے تھے اور آج اس نے یہ فیصلہ کرلیا تھا ابھی تک پریس کو اطلاع البتہ خاص مصلحت کے تحت نہیں دی تھی البتہ اس کے اس خفیہ عزائم کی خبر ملکی ایجنسیوں کو پہلے ہی سے تھی کیونکہ اس کے دوستوں میں سرکار کے آدمی بھی موجود تھے۔

ارسلان پر ہسپتال کے حوالے سے کچھ دباؤ پہلے ہی سے تھا اب جو اس حادثے کی خبر ملی تو اس کے تمام ہمدردوں کا ایک ہی جواب تھا کہ یہ دھماکہ حکومت نے اس کے ہسپتال کو فیل کرنے کے لیے کروایا ہے۔

اس مفروضے نے اسے آگ بگولا کر دیا۔

ارسلان اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچا جہاں فسٹ ایڈ کارروائیاں شروع ہو چکی تھیں۔ ہسپتال کے آوٹ ڈور کی تباہی نے غصے سے اس کا ذہن ماؤف کر دیا اور اس جیسے سنجیدہ آدمی نے مہذب زبان میں حکومت کو ہر گالی دے ڈالی۔ حکومت کو اس واقعہ کا ذمہ دار قرار دیا اور فوری طور پر ہنگامی پریس کانفرنس منعقد کر ڈالی۔

اس پریس کانفرنس میں جو حادثے کے روز شام کے بعد شہر کے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں کی جا رہی تھی ملک کے قریباً ہر اخبار کے نمائندوں کے علاوہ غیر ملکی اخباری نمائندے بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔

ارسلان کے سیکرٹری نے سب سے پہلے ان لوگوں میں بم ڈسپوزل سکواڈ کی طرف سے جاری رپورٹ کی کاپیاں تقسیم کیں جس میں بتایا گیا تھا کہ یہ بم جس کو تباہ کاری کے لئے استعمال کیا گیا مقامی طور پر تیار کیا گیا تھا جسے ٹائم دے کر باتھ روم میں نصب کیا گیا اور وہ

وقت آنے پر پھٹ گیا۔

اس رپورٹ کی تقسیم کا مطلب یہ تھا کہ اگر حکومت کی طرف سے اس دھماکہ میں غیر ملکی ہاتھ کی بات کی جائے تو اس کی یوں تردید ہو جائے کہ بم تو ملکی ساخت کا تھا جس کا مطلب یہی ہے کہ اسے تیار کرنے اور چلانے والے بھی پاکستانی ہی تھے۔

اور......

یہی ''را'' کا منشا تھا۔

حالات کی سنگینی سے باخبر حکومت سے ناراض ارسلان نے اخباری نمائندوں کے سامنے کھل کر تو حکومت کا نام نہ لیا۔

لیکن......

بین السطور میں اس نے ساری کارروائی کا ذمہ دار حکومتی ایجنسیوں کو گردانتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا کہ اس کا ہسپتال روز اول ہی سے سرکار کی آنکھوں میں کانٹا بن کر چبھ رہا تھا اور ماضی قریب میں حکومت نے ہسپتال کو ملنے والی تمام امداد روکنے کی ہر ممکن کوشش بھی کی ہے۔ اس پر متعدد قدغنیں لگائی گئیں ہسپتال کے لئے آنے والی غیر ملکی مشینری کو روکنے اور اسے پریشان کرنے کے لئے ہر ممکن حربہ استعمال کیا گیا۔

ارسلان نے وہ کچھ کہہ دیا جو اسے نہیں کہنا چاہئے تھا۔

اگلے روز اس کی طرف سے جاری کردہ بیان کی جب مختلف ملکی اور غیر ملکی اخباروں نے اپنے اپنے انداز میں توجیہہ کی تو ملکی ایجنسیوں کے ذمہ داروں نے سر پیٹ لیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ کارروائی کس نے کی؟

کن گھناؤنے مقاصد کے لئے کی؟

اور......

سب سے بڑھ کر یہ کہ بہت عرصے کے بعد ''را'' کی طرف سے ایسا بھرپور حملہ ہوا تھا جس نے ملکی سطح پر انہیں ہلا کر رکھ دیا تھا گو کہ اس روز حکومت کی طرف سے اعلامیہ جاری ہوا جس میں حقیقت حال کی وضاحت کی گئی اور عوام کو بتانے کی کوشش کی گئی کہ یہ دشمن کی کارروائی ہے اور اس میں ''را'' ملوث ہے۔

لیکن......

اب کوئی یہاں حکومت کی بات پر کان دھرنے کو تیار ہی نہیں تھا......!! ''را'' کے دفاتر میں البتہ جشن فتح مناتے ہوئے شراب کے جام لنڈھائے جا رہے تھے۔

✡......✡......✡

دام میں صیاد آ گیا

چوہدری اختر کو نارمل ہونے میں تین چار دن لگ گئے تھے۔

اس دوران اس نے جی بھر کے شراب اور شباب کا سہارا لیا تھا اور اپنے ڈیرے پر قریباً بند ہو کر رہ گیا تھا۔ اب اسے "را" کی طرف سے انعام کا انتظار تھا۔ وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ ایک ہی کارنامہ جو اس نے انجام دیا ہے درجنوں تخریبی کارناموں پر بھاری پڑتا تھا۔

اس کی شیطانی جبلت کو تسکین پہنچانے کے لئے یہ خیال کافی تھا کہ گائتری اس کے کارنامے سے بہت خوش ہوئی ہوگی۔

اور یہ تھی بھی حقیقت......

شکلا کی طرف سے بھی ایک کارنامہ ہیڈ آفس میں اس کے نمبر بڑھانے کا باعث بن گیا تھا۔ اس نے ورما ملک سے کہہ دیا تھا کہ لڑکوں کو ابھی یہیں روک دے کیونکہ دوسری طرف سے اب انہیں "این کاؤنٹر" کا بھی خطرہ تھا۔

یوں بھی وہ دشمن کے جسم پر ایک کٹ لگا کر کافی عرصہ تک اپنی حس درندگی کو تسکین دینا چاہتے تھے۔

نئے احکامات انور تک پہنچ چکے تھے اور اسے اب ان کے مطابق عمل کرنا تھا۔ وہ خود بھی کوئی نئی کارروائی بہت جلد کرنے کے حق میں نہیں تھا کیونکہ ایک سمجھدار ایجنٹ ہونے کے ناطے وہ بھی یہ بات جان سکتا تھا کہ پاکستانی ایجنسیوں نے سکیورٹی انتظامات بہت سخت کر دیئے ہوں گے اور عین ممکن ہے کہ چوہدری اختر ان کی نظروں میں آ جائے کیونکہ اس کا ماضی نسبتاً اچھا نہیں تھا۔

اسے احتیاطاً واپس لوٹ آنے کا حکم ملا تھا۔

لیکن......

روانگی سے پہلے اسے چوہدری اختر کا پتہ بھی صاف کرنا تھا۔

"را" کی طرف سے پاکستانی ایجنسیوں کو میسج ملنا بھی ضروری تھا اس طرح وارننگ ہو جاتی۔ دراصل "را" کے شیر جوان پاکستان میں تخریبی کارروائیاں کر کے اپنی دانست میں پاکستانیوں کو بھارت میں چلنے والی آزادی کی تحریکوں کی سزا دینا چاہتے تھے۔ بھارت کے کسی بھی حصے میں "براہمن وار" کے خلاف اٹھنے والی کسی بھی تحریک کو "را" والے پاکستان سپانسر تحریک سمجھا کرتے تھے۔ اس ضمن میں انہوں نے کبھی کوئی ثبوت تلاش کرنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔

گزشتہ چند مہینوں میں انہوں اپنے ایجنٹوں کے ذریعے پندرہ بیس دھماکے کروا کر درجنوں بے گناہوں کی جان اس لئے لے لی تھی اور کروڑوں روپے کا مالی نقصان اس لئے پہنچایا تھا کہ مقبوضہ کشمیر میں مجاہدین بھارتی فوج کی جان کو آ گئے تھے۔

"را" کو اپنے اس مقصد میں کامیابی بھی ملی تھی۔

اب پاکستان کے نام نہاد دانشور طبقے میں یہ سوچ جنم لینے لگی تھی کہ جس طرح ماضی میں پاکستان نے افغانستان کی حمایت کر کے اپنے شہریوں کی زندگیاں عذاب میں مبتلا کر دی تھیں اپنے شہروں اور گزرگاہوں کو غیر محفوظ بنا لیا تھا اور جس کی قیمت اس ملک نے آئندہ نسلوں تک ادا کرنی تھی اس طرف سے کچھ امن ہوا تھا کہ اب پاکستان نے مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں کی حمایت کا اعلان کر کے دوبارہ وہی تخریب کاری کا سلسلہ شروع کروا لیا ہے۔

یہ دانشور اپنے افکار کے ذریعے عوام کو ترغیب دے رہے تھے کہ وہ اس صورتحال سے بچنے کے لئے حکومت پر اپنا دباؤ بڑھائیں۔ وہ حکومت کو مشورہ دے رہے تھے کہ اپنے سے آٹھ گنا بڑی طاقت سے ٹکرانے کے بجائے، اپنی معیشت کا بیڑہ غرق کروانے کے بجائے جدید دور کے تقاضوں کو سمجھے اور بھارت سے دوستی کا ہاتھ بڑھائے کہ اس میں ہماری بقا ہے۔

یہی "را" چاہتی تھی۔

اس نے ان دانشوروں میں سے ایک دو کو خریدا ہوا تھا۔ سب اس کے "پے رول" پر نہیں تھے۔

لیکن......

جو دو تین تھے وہ درجنوں پر بھاری پڑتے تھے۔

اپنے حلقہ احباب میں وہ ان گھناؤنے نظریات کا زہر گھولتے رہتے تھے اور ان کے عقل کے اندھے لیکن گانٹھ کے پورے مقلدان نظریات کو پھر آگے سے آگے پہنچانے میں مصروف تھے۔

اسے وہ روشن خیالی کا نام دیتے تھے اور جب دوسری صف کا کوئی دانشور انہیں یہ بتانے کی کوشش کرتا کہ مادر وطن کی غیرت کا سودا نہیں کیا جاتا اور پاکستان اگر کشمیریوں کی زبانی کلامی حمایت بند بھی کر دے تو بھی بھارت کی طرف سے یہ گارنٹی نہیں مل سکتی کہ وہ ہمیں چھوڑ دے گا کیونکہ ہندو کبھی پاکستان بنانے کا جرم ہی معاف نہیں کر سکتا۔ وہ کشمیر ہی نہیں سارے پاکستان کو بھارت کا اٹوٹ انگ سمجھتا ہے اور اسے ہڑپ کرنے کے لئے ہر ممکن حربہ آزماتا رہے گا......تو، اسے رجعت پسندی کہا جاتا تھا۔

یہ نام نہاد ترقی پسند ایسے لوگوں کو رجعت پسند گردانتے تھے اور انہیں ملکی ترقی کی راہ میں رکاوٹ کہا کرتے تھے۔

اخبارات میں ان لوگوں کے مضامین بظاہر ملک دوستی لیکن اصل میں ملک دشمنی کی آڑ میں لکھے ہوئے شائع ہوتے جس میں بین السطور میں اس اعتراف کے بعد کہ بھارت میں ہونے والی انارکی کے ہم ذمہ دار ہیں حکومت کو اپنے ہمسایوں سے اچھے تعلقات قائم کر کے ملک کی اقتصادی حالت سدھارنے اور عالمی طاقتوں کے ہاتھوں میں کھلونا نہ بننے کی ترغیب دی جاتی۔

''را'' نے پاکستان پر مختلف محاذوں سے حملہ کیا تھا۔

وہ تخریب کاری کروا کر مظلوم بن رہے تھے۔

اور......

ہمارا بے وقوف دانشوران کی زبان بول کر ملک وقوم کی رسوائی کا سامان کر رہا تھا۔

✡......✡......✡

اس روز چوہدری اختر کو اچانک اسلم کا فون آیا اور ملاقات کے لئے اسی جگہ بلایا گیا جہاں وہ آخری ملاقات میں ملے تھے۔

چوہدری اختر کی گھبراہٹ اب ختم ہو چکی تھی کیونکہ جو سانپ یہاں نکلنا تھا وہ نکل گیا تھا اور اب زندگی پھر معمول پر آ گئی تھی۔

اسے امید تھی کہ اب پہلی فرصت میں اسے گائیتری کے پاس پہنچایا جائے گا۔

چوہدری اختر اب پاسپورٹ کے ذریعے بھارت آنے جانے لگا تھا۔ اس نے تین مختلف

ناموں سے تین مختلف پاسپورٹ بنا رکھے تھے اور ان پر ہی بھارت کا سفر کیا کرتا تھا۔

اگلے روز طے شدہ پروگرام پر وہ انور کے پاس پہنچ گیا۔ آج وہ اپنے اصلی روپ میں اپنی کار لے کر آیا تھا۔

''ویل ڈن چوہدری......ویل ڈن یار تم نے بڑا معرکہ مارا ہے۔ تمہارے کام سے ایجنسی والے اتنے خوش ہوئے ہیں کہ انہوں نے فوراً تمہیں اپنے پاس بلایا ہے......میرے خیال سے اس کی وجہ تمہاری گائیتری ہی ہو سکتی ہے۔ وہ تو تمہارا فون نمبر لینے کی ضد کر رہی تھی لیکن تمہاری سیکورٹی کے مدنظر اسے نمبر نہیں دیا گیا۔''

اس نے چوہدری اختر کو پھر چاروں شانے چت کر دیا۔

''بس جی مہربانی ہے ان کی۔''

چوہدری اختر نے بڑی کمینگی سے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

''معلوم ہے تمہارے اس کارنامے کے لئے انعام کی کتنی رقم منظور ہوئی ہے۔''

اس نے چوہدری اختر کی طرف استفہامیہ انداز سے دیکھا۔

''کتنی؟''

بے اختیار چوہدری کی رال ٹپکی۔

''ایک لاکھ......اور وہ بھی تمہاری مرضی کی کرنسی میں۔''

انور نے کہا۔

اور......

چوہدری اختر کی آنکھوں میں بے غیرتی لالچ کی سرخی اور گہری ہونے لگی۔ رقم اس کی توقعات سے زیادہ تھی۔

تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ مطلب کی بات پر آ گیا۔

''چوہدری صاحب آپ نے ایک چھوٹا سا کام کرنا ہے۔''

''حکم کر بادشاہو۔''

چوہدری نے مرغے کی طرح گردن پھلا دی۔

''تمہیں فی الوقت ایجنسی نے گائیتری کے ساتھ لمبی رخصت پر بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے لیکن تمہیں ہمارے لئے دو ''پٹاخے'' تیار کرنے ہیں۔ یہ دونوں ''پٹاخے'' فارمولا نمبر آٹھ والے ہیں......امید ہے تمہیں یاد ہوں گے کیونکہ تمہیں اس کی مکمل تربیت حاصل ہے۔''

اس نے چوہدری اختر کو شاہ پور کے مرکز تخریب کاری میں حاصل کردہ تربیت کے کوڈ دہراتے ہوئے پوچھا۔

چوہدری کو یہاں دھماکے کے ساتھ پھٹنے اور تباہی پھیلانے والے مقامی وسائل سے تیار کردہ ٹائم بم بنانے کی تربیت دی گئی تھی جس کا متعدد مرتبہ اس سے عملی مظاہرہ بھی کروایا گیا تھا۔

"بالکل یاد ہے۔"

اس نے اعتماد سے کہا۔

"ٹھیک ہے تم یہ دونوں پٹاخے کتنے دن میں تیار کر سکتے ہو۔"

انور نے اگلا سوال کیا۔

"دو دن میں......"

چوہدری نے سوچ کر جواب دیا۔

"ویل ڈن......شاباش۔ ٹھیک ہے آج تیرہ تاریخ ہے۔ سولہ تاریخ کو یعنی منگل کے روز ٹھیک تین بجے تم اسی جگہ آؤ گے یہی کپڑے پہن کر......اسی حلیے میں اور اس گاڑی پر جس سے تم آئے ہو......گاڑی بھی تم نے اسی جگہ پارکنگ میں لگانی ہے...... یہاں میرے بجائے ایک اور نوجوان تم سے ملاقات کرے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے ملاقات کرنے والے کے "کوڈ ورڈ" اور جواب میں شناخت مکمل کرنے کے لئے چوہدری اختر کی طرف دہرائے جانیوالے کوڈ ورڈ اسے سمجھا دیئے تھے......!

بیوقوف اور عقل کا اندھا چوہدری اختر اس کے دام تزویر میں پھنس چکا تھا۔ انور نے "را" کی طرف سے تیار کردہ اسے پھنسانے کا سارا پلان قربانی کے اس گدھے تک پہنچا دیا تھا۔

اسے بسا اوقات حیرانی ہوتی تھی کہ اس کے افسران ایسا کیوں کرتے ہیں؟ کیا پاکستانی انٹیلی جنس ایجنسیوں کو یہ بتانا ضروری ہے کہ پاکستان میں دھماکے وہی کروا رہے ہیں؟ کیا اس طرح آ بیل مجھے مار والی بات نہیں ہو رہی؟

لیکن......

جلد ہی اسے سمجھ آ گئی کہ گرم جنگ کی طرح "سرد جنگ" کے بھی اپنے اصول ہیں۔ شاید دشمن پر نفسیاتی برتری حاصل کرنے کے لئے اپنی اہمیت جتانے کیلئے اور اسے احساس بے بسی دلانے کے لئے تباہی کے بعد اس تک یہ پیغام بھی پہنچایا جانا ضروری ہوتا تھا

کہ اس کو زخم لگانے والے کون ہیں؟

اس طرح شاید دشمن کو اپنی زبان میں پسپائی اختیار کرنے کی ترغیب دی جاتی ہوگی؟

اسے سمجھایا جاتا ہوگا کہ اگر اس نے ہتھیار نہ ڈالے تو اس کے بے گناہ شہریوں کو اسی طرح اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

ایک دوسرے پر نفسیاتی برتری حاصل کرنے کے لئے یہ انٹیلی جنس ایجنسیاں کیسے کیسے کھیل رچاتی تھیں......کیسے کیسے داؤ پیچ استعمال کرتی تھیں اس کا مکمل ادراک تو کسی ایجنٹ کو عمر بھر نہیں ہو پاتا۔

لیکن......

جتنا کچھ انور نے جان لیا تھا وہی اسے خوفزدہ کرنے اور سر جھکا کر صرف اپنے آقاؤں کے احکامات کی تعمیل کرتے چلے جانے کی تلقین کرنے کے لیے کافی تھا۔

وہ جانتا تھا اگر "را" والے چاہتے تو چوہدری اختر کو بہت آسانی سے موت کی نیند سلا سکتے تھے۔ ان کے پاس دنیا کے بہترین اور نایاب زہر موجود تھے۔ انور جیسے کسی بھی گدھے کے ذریعے وہ چوہدری اختر کو ایسی موت سے دوچار کر سکتے تھے جس کا کوئی میڈیکل ثبوت بھی ساری زندگی نہ مل پاتا۔

عین ممکن تھا وہ بعض ایجنٹوں کو اس طرح اپنے راستے سے ہٹاتے ہوں۔ بھارتی اخبارات میں پر اسرار اموات کی خبریں وہ پڑھتا رہتا تھا...... انسانی ہلاکت کے یہ طریقے انہیں دوران تربیت بتائے جاتے تھے۔ اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ ایسی بیشتر اموات میں بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیوں کا ہاتھ ہوتا ہوگا۔

لیکن......

اس کے پاس دوسرے لوگوں کی طرح اس کا کوئی ثبوت نہیں تھا......!!

چوہدری اختر کو اس نے گرم جوشی سے رخصت کرنے کے بعد بتایا تھا کہ ممکن ہے کبھی پھر زندگی کے کسی موڑ پر ان کی ملاقات ہو جائے۔

اور......

چوہدری اختر اپنی آنکھوں سے گائیتری کے ساتھ راتیں بسر کرنے بھارت انٹیلی جنس ایجنسی "را" سے ایک لاکھ روپیہ انعام حاصل کرنے کے سپنے سجائے قربانی کا بکرا بننے کے لیے اپنے ٹھکانے کی طرف واپس جا رہا تھا۔

اگلا سارا دن اس نے گھر پر گزارا۔

دھماکے کے بعد سے اس نے گھر سے نکلنا قریباً بند کر دیا تھا صرف اقبال کے ساتھ وہ باہر جایا کرتا تھا۔ اس دوران اس نے اقبال سے اس کی نوکری کی ساری تفصیلات طلب کر لی تھیں اور یہ جان کر خوش ہوا تھا کہ اقبال جس فرم میں کام کرتا ہے وہ آرمی کو ادویات اور کیمیکلز سپلائی کرتی تھی۔

اقبال کی اس کمزوری کو وہ ''را'' میں اگلا درجہ حاصل کرنے کے لیے اپنے حق میں کیش Cash کروا سکتا تھا۔

اپنے خون سے غداری اور بے غیرتی میں وہ کسی حد تک بھی جانے کے لیے تیار تھا۔

یہ اس کے آقاؤں کی بڑی خوبی تھی۔

اپنے جس ایجنٹ کو وہ ضروری سمجھتے اسے آکٹوپس کی طرح ذہنی اور جسمانی طور پر جکڑ کر بے بس کر دیا کرتے تھے۔

انور کا تعلق چونکہ ایک مسلم گھرانے سے تھا اس لئے انہوں نے بڑی محنت سے ایک سال اس پر کام کرنے کے بعد اسے پرلے درجے کا بے غیرت بنا دیا تھا۔

انہیں ان کے آباؤ اجداد نے ''ارتھ شاستر'' اور ''منوجی سمراتی'' کی شکل میں جو ضابطہ حیات دیا تھا اس میں بہت کام کی باتیں کہی تھیں۔

ان باتوں کو ان لوگوں نے صدیوں سے حرز جان بنا رکھا تھا۔

زمانہ آسمان پر کمندیں پھینک رہا تھا۔

اور......

من حیث القوم وہ اس دوڑ میں شامل بھی تھے۔

جدید نظریات ان کی یونیورسٹیوں میں اس جدید انداز سے پڑھائے جاتے تھے جیسے ترقی یافتہ دنیا میں پڑھائے جاتے ہیں۔

لیکن......

وہ صدیوں سے اپنے اس ''صدری نسخے'' کو اپنی نوجوان نسل کو بھی منتقل کرتے چلے آرہے تھے یہی وجہ تھی کہ دنیا کا ماڈرن ترین اور سیکولر نظریات رکھنے والا ہندو جواہر لال نہرو کی طرح کٹر کمیونسٹ ہونے کے باوجود بھی ہندو ہی رہتا تھا۔

ارتھ شاستر اور منوجی سمراتی نے انہیں یہی بتایا تھا کہ کسی قوم کو ذہنی اور اخلاقی طور پر

اپاہج بنانے کے لئے اس کے قتل عام کے بجائے اس کی غیرت کا جنازہ نکال دو۔

اور......

وہ بڑی کامیابی سے اس نسخے کو آزماتے آرہے تھے۔

بھارت کی سپریم انٹیلی جنس ایجنسی ''را'' نے کسی مسلمان کو اپنے کسی آفس میں کبھی چپراسی کی نوکری بھی نہیں دی تھی۔

لیکن......

پاکستان میں تخریب کاری کیلئے وہ نوے فیصد مسلم گھرانوں کے نوجوانوں کو استعمال کرتے تھے یہ الگ بات کہ ایک مرتبہ ان کے چنگل میں پھنسنے والا کوئی بھی نوجوان صرف نام نہاد مسلمان رہ جاتا ہے۔

وہ اسے مادیت پرستی کا ایسا چسکا لگاتے۔

شراب و شباب کا ایسا رسیا کر دیتے تھے کہ پھر اس کے لئے دنیا کے تمام رشتے ثانوی اور اپنی ایجنسی سے وفاداری کا رشتہ اولین حیثیت حاصل کر جاتا تھا۔

ایسی ہی گھناؤنی سوچ نے انور کے ذہن میں بھی جنم لیا تھا۔

اس کا خالہ زاد اس کا بہنوئی بننے جا رہا تھا۔ جسے بہرحال دہلی آنا تھا اگر وہ کسی طرح ایجنسی کے چنگل میں پھنس جاتا تو اسے مزید عیش و آرام اور دھن دولت کے ساتھ ایک مستقل سیف ہاؤس Safe House بھی میسر آ جاتا۔

یہ اس کی بے غیرتی کی انتہا ضرور تھی......لیکن، اس کی ایجنسی میں اس کی تربیت پر مقرر انسٹرکٹر ورما ملک کا اعزاز تھا۔

❂......❂......❂

اس روز جب اقبال گھر لوٹا تو انور کی طرف سے واپسی کی خبر نے اسے پریشان ہی کر دیا۔

''ارے میاں کیوں گھبرا گئے۔ میں اکیلا جا رہا ہوں......کل گھر فون کیا تھا۔ ابا جان بتا رہے تھے کہ اور چھٹی منظور نہیں ہو رہی......بھئی ملازمت کا مسئلہ ہے......اب تمہارے ملک کی طرح تو ہے نہیں......وہاں تو سالے ہندو لڑکوں کو سرکاری نوکری قسمت سے ملتی ہے......مسلمانوں کی تو بات ہی نہ کرو......اب نوکری ملی بھی ہے تو اسے گنوانے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔ اماں اور سلمیٰ پندرہ بیس روز بعد ہی جائیں گی......اور ہاں میاں جتنی جلدی ممکن ہو

تم اپنی امانت لے جانا......تاکہ ہمارا بھی آنا جانا اسی بہانے سے مستقل ہو جائے۔''

اس نے اقبال سے کہا۔

اور......

اقبال نے ایک طرح سے تو دل ہی دل میں خدا کا شکریہ ادا کیا کیونکہ جب سے انور گھر پر رہنے لگا تھا اس کے سر پر سوار رہتا تھا۔ اسے انور کی کرید کرید کر باتیں پوچھنے کی عادت نے بڑا پریشان کیا تھا۔ اب اس کی نوکری ہی لے لو۔

اس نے انور کو کیا بتا دیا کہ اس کی فرم پاکستانی فوج کو کیمیکلز اور ادویات سپلائی کرتی ہے۔

کیا سپلائی کرتی ہے؟

کس شہر میں کرتی ہے؟

یہاں کیمیکلز کے کیا ریٹس ہیں؟

کون سی دوا کا کیا ریٹ ہے؟

کس کمپنی کی کون سی دوائی جاتی ہے؟

اسے ان عجیب وغریب سوالات سے الجھن ہونے لگتی تھی۔

شکر تھا اللہ کا کہ اب وہ پندرہ بیس روز اپنی منگیتر کے ساتھ اپنی مرضی سے گزار سکے گا۔ اکیلے گھوم پھر سکے گا اور اس کی روانگی کے ایک دو ماہ بعد آسانی سے دہلی جا کر سلمیٰ کو ہمیشہ کے لئے اپنے گھر ہی لے آئے گا پھر اسے کس کی پرواہ تھی؟

انور کی والدہ کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا بھی یہیں رہے۔

لیکن......

اس بات کا انہیں علم تھا کہ بھارت میں سرکاری نوکری اول تو قسمت سے ملتی تھی اور مل جائے تو اسے چھوڑنا معاشی خودکشی کے مترادف ہی سمجھا جاتا تھا۔ سو وہ بھی خاموش رہیں۔ البتہ انہوں نے انور کو خالی ہاتھ نہیں جانے دیا تھا اور اب تک دونوں بہنیں مل کر جو سامان جمع کرتی رہی تھیں وہ اسے سونپ دیا تھا کیونکہ ان کے خیال میں وہ دونوں طرف سے سامان آسانی سے لے جا سکتا تھا۔

ان بے چاریوں کو تو ڈھنگ سے رشوت بھی نہیں دینی آتی تھی۔

اسی روز گھر میں سامان کی پیکنگ شروع ہو گئی کیونکہ اگلے روز بعد از دوپہر ٹرین چلتی تھی۔ اقبال کے ساتھ جا کر وہ بازار سے کچھ اور سودا سلف لے آیا تھا اپنی واقفیت کے

سہارے اقبال نے اسے اگلے روز ٹرین میں ایک سیٹ لے دی تھی دونوں شام دیر گئے گھر لوٹے تھے اس درمیان اس کا سامان پیک ہو چکا تھا اور انور کھانا کھا کر لمبی تان کر سو یا۔

وہ مطمئن تھا کہ خطرے کی حدود سے نکل رہا تھا۔

عین ممکن تھا کسی مرحلے پر وہ اپنے قانونی کور کے باوجود مشتبہ جان کر گرفتار کر لیا جاتا۔

اسے خوشی تھی کہ اس کے مالکان اس کے ایک ہی کارنامے سے اتنے زیادہ مطمئن ہو گئے تھے۔

دوسرے روز وہ صبح صبح ہی تیار ہو گیا۔

وہ تو بضد تھا کہ اکیلا ہی سٹیشن تک جائے گا اور وہاں سے خود ہی چلا بھی جائے گا لیکن اقبال کے اصرار کے آگے اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اقبال نے آج دفتر سے چھٹی کی تھی اور اپنے سالا صاحب کو خصوصی پروٹوکول دلوانے کے لیے دوبارہ اپنے پرانے رابطے کو استعمال کر کے انور کے لیے کسٹمز پر سہولت بھی حاصل کر لی تھی۔ اس سے بڑی عیاشی یہاں اور کوئی نہیں تھی ورنہ تو بے چارے عام مسافروں کو بھی دونوں طرف کسٹم والے درگت بنائے رکھتے تھے اور ان کے سامان سے زیادہ ان سے زبردستی رشوت ہتھیا لیتے تھے۔

ریلوے سٹیشن کے مخصوص پلیٹ فارم پر وہ ایک دوسرے کو خدا حافظ کر کے الگ ہو گئے تھے۔ اقبال نے پلیٹ فارم کے باہر ہی اس کی ملاقات شاہ صاحب سے کروا دی تھی جنہوں نے اسے گاڑی میں اچھی سیٹ دلانے سے لے کر امیگریشن اور کسٹم کے تمام مراحل طے کروانے تھے۔

انور کی خواہش تو نہیں تھی کیونکہ وہ کسی جھنجٹ میں پڑے بغیر اپنا کام نکالنا چاہتا تھا۔

لیکن......

بادل نخواستہ اسے اس مدد کا شکریہ ادا کرنا پڑا۔

شاہ صاحب کا تعلق یہاں نگرانی کرنے والے درجنوں محکموں کے اہلکاروں میں سے کسی ایک محکمے سے تھا۔ انہوں نے امیگریشن کروانے کے بعد اسے بتایا تھا کہ گاڑی تین گھنٹے لیٹ ہے اور وہ اطمینان سے بیٹھا رہے۔

شاہ صاحب نے اپنا دفتر دکھا دیا تھا کہ وہ جب چاہے ان سے وہاں مل لے...... یہ دفتر بھی پلیٹ فارم پر بنے ایک کمرے میں تھا۔ اس نے اپنا سامان شاہ صاحب کے دفتر میں رکھا اور خود گھومتا ہوا پلیٹ فارم کے دوسرے کونے تک چلا گیا جہاں ٹیلی فون بوتھ موجود تھے۔

اب اسے آخری کام کرنا تھا۔ جس کے بعد اسے فراغت ہی فراغت تھی۔

میجر صاحب کو فون کی اطلاع ملی تو دوسری طرف سے کسی نے میجر خان کہہ دیا۔

خان نام کے تین چار میجران کے ساتھی رہے تھے۔

یہ کون سا خان آ گیا؟

انہوں نے سوچا پھر فون اٹھا لیا۔

دوسری طرف سے بڑے احترام سے سلام کرنے کے بعد فون کرنے والے نے اپنا تعارف رحیم خان کے نام سے کرواتے ہوئے اپنی غلط شناخت بتانے پر معذرت کی اور کہا کہ وہ اسے ایک اہم ترین اطلاع دینے جا رہا ہے جس سے اس کی کایا پلٹ سکتی ہے اور توقع سے زیادہ کامیابی مل سکتی ہے۔

''تمہیں یہ نمبر کہاں سے ملا؟''

میجر خان نے قدرے درشتگی سے پوچھا۔

''دیکھئے میجر صاحب میں آئی بی والوں کے نمبر بھی ملا سکتا تھا...... ایف آئی اے والوں کے بھی اور دوسرے دوستوں کے بھی۔ آپ کو فون اس لئے کیا ہے کہ مجھے امید ہے آپ ایماندار لوگ ہیں۔ آم کھائیے گٹھلیاں نہ گنئے...... جتنی دیر فون ٹریس Trace کرنے میں لگتی ہے میں اتنی لمبی بات نہیں کروں گا اور دو منٹ کے بعد فون بھی بند کر دوں گا۔''

دوسری طرف بات کرنے والا بڑا ہوشیار دکھائی دے رہا تھا۔

دوسرے ہی لمحے میجر خان نے اس کی بات سنجیدگی سے سننے کا فیصلہ کر لیا تھا وہ فی الوقت یہ سنہری موقع گنوانے کے چکر میں نہیں تھا۔

''اچھا...... بتاؤ کیا بات ہے۔''

میجر خان نے کاپی پنسل لی۔

دوسری طرف سے فون کرنے والے انور نے اسے بتایا کہ آج 3:00 بجے سہ پہر کس جگہ کس نمبر کی کار میں کس طرح کے کپڑے پہن کر ایک تخریب کار جس نے شرکت ہسپتال میں بھی دھماکہ کیا تھا آ رہا ہے جس کے پاس تباہ کن بم ہوں گے جو اس نے شام کو ایک اور جگہ استعمال کرنے ہیں۔''

میجر خان کا ہاتھ اور دماغ ایک ہی رفتار سے چل رہے تھے۔

جیسے ہی پیغام مکمل ہوا دوسری طرف سے اسے پوچھا گیا۔

''آپ نے نوٹ کر لیا۔''

''لیکن......''

میجر خان نے چاہا اس کو مزید کریدے لیکن دوسری طرف سے اس کی بات کاٹ دی گئی۔

''میجر صاحب میں نے ایک پاکستانی ہونے کے ناطے اپنا فرض ادا کر دیا۔ لیکن کے چکر میں نہ پڑیں۔ خدا کے لئے اس سنہری موقع کو ضائع نہ کریں...... جب آپ کو کامیابی مل جائے تو ہمیں بھی یاد رکھیں...... انشاء اللہ جلدی آپ سے ملاقات کروں گا۔ اسے ہماری دوستی کا تحفہ سمجھ کر قبول کر لیجئے۔'' اتنا کہہ کر انور نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میجر خان نے فون کی طرف بے یقینی سے دیکھا پھر اسے کریڈل پر رکھ دیا۔

میجر افراسیاب خان کا تعلق آئی ایس آئی سے تھا اور وہ چند روز پہلے ہی ڈیپوٹیشن پر یہاں آیا تھا گو کہ اس کا نمبر پرائیویٹ ہونے کے سبب کوئی ایسی راز کی بات نہیں تھی عین ممکن تھا کہ اس سے پہلے والے کسی میجر صاحب کے ''سورس'' نے فون کیا ہو۔

''لیکن؟......''

وہ اس اطلاع پر چکرا کر رہ گیا تھا۔

اتنی مکمل اور اہم اطلاع جرم میں کوئی شریک ملزم ہی دے سکتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے متعلقہ تخریب کار کو تیار کر کے پھر میجر خان کو فون کیا ہو۔

کیا اسے اعلیٰ کمان کو اعتماد میں لینا چاہئے؟

اس سوال نے میجر خان کو مزید پریشان کر دیا۔

عین ممکن ہے یہ مذاق ہی نہ ہو اور سبکی اٹھانا پڑے لیکن یہ بھی تو ممکن تھا یہ سچ ہو؟ دونوں میں سے وہ کسی امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

اسے اگلے چند منٹ میں ہی فیصلہ کرنا تھا کیونکہ وہ دو بجنے والے تھے اور تین بجنے میں ایک گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔ میجر خان کو اپنے زور بازو پر اعتماد تھا۔

اس نے زندگی میں بڑے بڑے چیلنج قبول کئے اور سرخروئی حاصل کی تھی۔ آج بھی اس نے یہ چیلنج خود ہی قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اور......

اپنے دو سویلین ماتحت طلب کر لئے تھے۔

اس نے دونوں کو خاص بریفنگ نہیں دی تھی صرف انسپکٹر ملک کی ڈیوٹی کار

پارکنگ میں لگا کر اس سے متعلقہ کار کا نمبر اور رنگ بتا کر کار کی آمد پر اطلاع کرنے کا کہا تھا۔

تینوں واکی ٹاکی استعمال کر رہے تھے۔

اپنے دوسرے ماتحت انسپکٹر رشید کو اس نے کور Cover دینے کے لیے کہا تھا اور خود میدان عمل میں آنے کا فیصلہ کیا تھا۔

کسی کو کچھ بتائے بغیر وہ اپنے دونوں ماتحتوں کے ساتھ جیپ میں اس تفریح گاہ کی طرف چل دیا۔ گاڑی اس نے جان بوجھ کر یہاں سے کچھ دور ہی پارک کردی تھی اور اب وہ اپنے دونوں ماتحتوں کے ساتھ پیدل اس طرف آرہا تھا۔ تینوں نے پہلے ایک ایک کر کے آنے جانے والے راستوں کا جائزہ لے لیا تھا۔ یہاں پہنچنے کے بعد ہی اس نے دونوں کو بریف کیا تھا کہ انہیں یہاں کیوں لے کر آیا ہے۔

اس نے اب تک راز داری سے کام لیا تھا۔

انسپکٹر رشید کو اس نے کار پارکنگ پر چھوڑ دیا اور دونوں اس مخصوص مقام کی طرف بڑھ گئے جہاں اس تخریب کار نے آنا تھا۔

دونوں ایک دوسرے سے چند قدم کے فاصلے پر اور خاصے کیموفلاج ہو کر بیٹھے تھے۔ تین بجنے میں پانچ منٹ رہ گئے تھے۔

اور......

میجر خان کو یقین ہو چلا تھا کہ واقعی کسی نے اس کے ساتھ مذاق کیا ہے اور اگر وہ اعلیٰ کمانڈ کو بھی اعتماد میں لے لیتا تو اچھا خاصا مذاق بن کر رہ جاتا۔

مایوس ہو کر وہ واپسی کے ارادے کے لیے کمر باندھ ہی رہا تھا جب ’’واکی ٹاکی‘‘ میں زندگی پیدا ہوگئی۔

’’سر......اس نمبر اور رنگ کی گاڑی پارک ہو رہی ہے۔‘‘

انسپکٹر رشید کے پیغام نے اس کے رگ و پے میں بجلیاں دوڑا دیں۔

’’او کے آؤٹ۔‘‘

اس نے صرف تین الفاظ کہہ کر انسپکٹر ملک کی طرف دیکھا اور اسے انگوٹھے کے مخصوص اشارے سے خبردار کیا۔ ہدایت کے مطابق انسپکٹر ملک اس طرح گیٹ کی طرف جا رہا تھا کہ وہاں سے اندر آنے والے کو دکھائی نہ دے۔

گرمیوں کی وجہ سے یہاں آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی کالجوں سے بھاگ کر

آئی کچھ لڑکیاں اور لڑکے بھی کونے کھدروں میں براجمان تھے۔

’’گاڑی پر نظر رکھو......اینڈ بی سمارٹ "And Be Smart"

اس نے انسپکٹر رشید کو ہدایت جاری کی اور خود لمبے لمبے ڈگ بھرتا اطلاع دینے والے کی بتائی ہوئی جگہ سے چند گز کے فاصلے پر موجود ایک بڑے درخت کے تنے کے پیچھے اس طرح چھپ کر کھڑا ہو گیا کہ سامنے سے آنے والے کی نگاہ اس پر نہ پڑے۔

میجر خان کی نظر مین گیٹ سے اس طرف آنے والوں پر جمی تھی...... جلد ہی اسے اپنا ٹارگٹ دکھائی دے گیا۔

اس نے بالکل اسی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے جو فون کرنے والے نے بتائے تھے۔ انسپکٹر ملک بڑی ہوشیاری سے دس بارہ قدموں کا فاصلہ رکھ کر اس طرح اس کا تعاقب کر رہا تھا کہ وقت آنے پر اس کے خلاف کوئی ایکشن لے سکے۔

آنے والے کے دونوں ہاتھ خالی تھے اور اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ اگر اب تک کی ساری اطلاعات صحیح تھیں تو اس کا مطلب یہی تھا کہ اس نے بم اپنی گاڑی ہی میں رکھے ہوئے تھے۔ وہ شاید جلدی میں تھا۔

تین بجنے میں دو تین منٹ ہی باقی تھے اور وہ اب تک دو تین مرتبہ اپنی گاڑی کی طرف دیکھ چکا تھا۔

ٹھیک تین بجے ان کا ٹارگٹ اپنی جگہ موجود تھا۔

میجر خان کو اس کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

دو تین منٹ کے بعد شاید اس پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی تھی۔ خان اور ملک بڑی مستعدی سے اس پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔

ملک نے اب کوئی بھی قدم سگنل موصول ہونے پر ہی اٹھانا تھا۔ خان اس کے کسی ساتھی کی آمد کا منتظر تھا۔

لیکن......

کوئی اس سے ملنے نہ آیا۔

آنے والے تخریب کار نے پہلے تو پانچ منٹ بے چینی سے ادھر ادھر تانک جھانک کر کے گزارے اب وہ واقعی گھبرا گیا تھا۔

یوں بھی اسے اپنی تربیت کے مطابق اس سے زیادہ اپنے ساتھی کا انتظار نہیں کرنا

تھا۔ طے شدہ وقت سے پانچ منٹ گزر جانے کا مطلب تھا کہ اس کا دوسرا ساتھی گرفتار ہو چکا ہے اور اب اسے فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے۔

یہی سوچ کر چوہدری اختر پر گھبراہٹ طاری ہوگئی تھی۔ اس نے یہی رائے قائم کی تھی کہ شاید اس کا ہینڈلر "Handler" اسلم گرفتار ہوگیا ہے کیونکہ وہ ایک لمحے کے لیے بھی چوکنے والا نہیں تھا۔ اب تک ان دونوں کے درمیان جتنی بھی میٹنگز ہوئی تھیں ان سب میں اسلم نے حیرت انگیز طور پر وقت کی پابندی کا مظاہرہ کیا تھا۔

"ٹریپ" Trape

اس کے ذہن نے راہنمائی کی۔

اور......

چوہدری اختر بے چینی سے واپس مڑا تا کہ جلد از جلد یہاں سے نکل جائے۔ اس نے چاروں طرف نظریں گھما کر اندازہ کرلیا تھا کہ اگر اسلم گرفتار بھی ہو گیا ہے تو اس نے ابھی شاید چوہدری اختر کا نام نہیں لیا کیونکہ یہاں کوئی خاص ہلچل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

وہ جرائم کی دنیا کا آدمی تھا اور جانتا تھا کہ اس جیسے تخریب کار کے استقبال کے لئے کیا کیا بندوبست نہیں ہوا ہوگا۔

کار پارکنگ کرنے کے بعد سے اب تک وہ بڑی ہوشیاری سے گردو پیش کا جائزہ لیتا ہوا آیا تھا بظاہر اسے کچھ غیر معمولی نظر نہیں آیا تھا جہاں تک اسلم کا تعلق تھا وہ پہلے بھی اچانک ہی اس کے سر پر نازل ہوا کرتا تھا اور اب بھی وہ اس سے اسی طرح ملاقات کی امید کر رہا تھا۔

لیکن......

یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہوگیا تھا۔

چوہدری اختر گھبرایا ضرور تھا لیکن بوکھلایا نہیں تھا اس نے بظاہر نارمل آدمیوں کی طرح وہ جگہ چھوڑی جیسے ہی وہ واپسی کے لئے گھوما میجر خان نے واکی ٹاکی پر بٹن دبا کر انسپکٹر ملک کو ہوشیار کیا۔

واکی ٹاکی کا سرخ بٹن جلتے ہی انسپکٹر ملک نے پستول فائر پوزیشن میں کرلیا تھا۔

میجر خان تیار تھا۔

چوہدری اختر نے اس کے سامنے سے گزر کر گیٹ کی طرف جانا تھا جیسے ہی اس کی پشت خان کی طرف ہوئی بجلی کی سی پھرتی سے وہ اپنی جگہ سے اچھلا اور ایک ہی جست میں اس

نے اختر کو دبوچ لیا۔

"خبردار...... خبردار...... اپنی جگہ سے نہ ہلنا ورنہ گولی مار دوں گا۔"

اس نے زمین پر گرے اختر کی چھاتی پر بیٹھ کر اس کی طرف پستول تان لیا اسی اثناء میں ملک بھی اس کے سر پر پہنچ گیا تھا۔

حواس باختہ چوہدری اختر کو میجر خان نے جھٹکا دے کر اس کا منہ زمین کی طرف کیا اور اپنی پتلون کی جیب سے احتیاطاً روانگی کے وقت رکھی کمانڈوز والی مخصوص باریک اور مضبوط رسی نکال لی...... انسپکٹر ملک اس کے سر پر پستول تانے کھڑا تھا۔ میجر خان نے اس کے دونوں بازو مروڑ کر پشت کی طرف کیئے اور انہیں چند سیکنڈ کے اندر باندھ کر اسے بے بس کر دیا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے چوہدری اختر کی ٹانگ سے بندھا پستول اس کے بدن سے الگ کر کے دوسرے ہاتھ میں پکڑ لیا اور اس کے اشارے پر انسپکٹر ملک نے چوہدری اختر کو بالوں سے پکڑ کر جھٹکا دیا اور اٹھا کر کھڑا کر دیا۔

چوہدری اختر جس کی زبان اس اچانک آنے والی بپتا سے قریباً گنگ ہوگئی تھی، نے سنبھل کر کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا جب اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا زوردار تھپڑ انسپکٹر ملک نے رسید کر دیا۔

"خبردار...... اگر زبان سے ایک لفظ بھی نکالا چپ چاپ چلتے جاؤ...... چپ چاپ۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے اختر کو زوردار جھٹکا دیا اور زمین بوس ہونے سے پہلے پھر پکڑ کر سیدھا کر دیا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے بندھے تھے۔ انسپکٹر ملک اسے کالر سے کھینچتا ہوا پارکنگ کی طرف لے جا رہا تھا۔

خوف اور صدمے سے بے حال چوہدری اختر ڈگمگاتا ان کے ساتھ چل رہا تھا۔

عین ان لمحات میں جب چوہدری اختر جو گائیتری اور لاکھ روپے کے خواب آنکھوں میں سجائے یہاں آیا تھا خوفزدہ اور بوکھلائے ہوئے بھیڑیئے کی طرح زمین پر گھسٹ رہا تھا۔

انور کی ٹرین نے وسل دے کر رینگنا شروع کیا۔

اور......

چوہدری اختر کے پارکنگ پہنچنے تک ٹرین اپنی رفتار پکڑ چکی تھی۔

اب وہ محفوظ تھا...... بالکل محفوظ...... اگلے آدھ گھنٹہ بعد وہ بھارتی سرحد میں داخل ہوگیا۔

۞......۞......۞

"واکی ٹاکی" پر ہی اپنی کامیابی کے نشے سے سرشار میجر خان نے انسپکٹر رشید کو جیپ وہاں لانے کا حکم دیا تھا اور جیپ کے وائرلیس سے متعلقہ "مدد" مانگ لینے کو کہہ دیا تھا۔

ان کے پارکنگ میں پہنچنے تک انسپکٹر رشید جیپ سمیت وہاں موجود تھا۔ اس نے اپنے ایمرجنسی نمبر پر "لوکیشن" بتا کر متعلقہ مدد طلب کر لی تھی۔

باغ میں موجود لوگوں کو ابھی تک علم ہی نہیں ہو پایا تھا کہ یہاں کیا حادثہ ہو گیا ہے...... جب وہ اختر کو گھسیٹتے ہوئے کار تک لائے تو ایک کونے میں چھاؤں میں بیٹھے پارکنگ کے ٹھیکیدار نے حیرانگی سے ان کی طرف دیکھا اور آگے بڑھا۔

وہ چوہدری اختر سے زیادہ خوفزدہ دکھائی دے رہا تھا۔

"کیا ہوا...... کیا ہوا؟"

اس نے گھبراہٹ میں دریافت کیا۔

"چپ...... جا آرام سے بیٹھا رہ...... خبردار اگر کچھ بولا تو۔"

ملک نے اسے ڈانٹ کر واپس بھیج دیا۔

یوں بھی دونوں کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر وہ سہم گیا تھا۔

اختر کی جیب سے چابی نکال کر میجر خان نے خود گاڑی کا دروازہ کھولا اور چند منٹ ہی میں اس کی تلاشی کر لی۔

ڈگی میں ایک بیگ موجود تھا جس میں دو تیار شدہ "پٹاخے" رکھے تھے۔ میجر خان نے اندازہ کر لیا کہ وہ ابھی ایکٹو Active نہیں تھے کیونکہ دونوں پر نصب گھڑیاں بند تھیں۔

"گاڑی لے آنا"

اس نے انسپکٹر رشید سے کہا اور چابی اس کی طرف بڑھا دی۔

جس کے ساتھ ہی اس کے اشارے سے انسپکٹر رشید نے اپنے سر پر رکھا بڑا سا رومال پکڑا اور چوہدری اختر کی آنکھیں باندھ دیں۔

میجر خان نے دھکا دے کر اسے جیپ میں پھینکا اور اس کے ساتھ والی سیٹ پر اس کے سر سے پستول کی نالی لگا کر بیٹھ گیا۔

رشید نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی جیپ میں موجود وائرلیس پر اپنے آفس کو پیغام دیا اور میجر صاحب کے بتائے ہوئے "سیف ہاؤس" کی طرف جیپ اڑا دی۔

جب تک وہ "سیف ہاؤس" میں چوہدری اختر کو لے کر پہنچے۔ انسپکٹر ملک کے

لئے "مدد" پہنچ گئی تھی۔

دونوں بم آنے والوں نے چیک کئے تھے اور انہیں محفوظ قرار دیا تھا۔ آنے والے سفید پوشوں نے اس کی کار کو ایک خاص ڈیٹیکٹر سے چیک کیا اور اب وہ ٹھیکیدار کی طرف جا رہے تھے۔ اسی اثناء میں ٹھیکیدار کی زمانہ ساز نظروں نے انہیں پہچان لیا تھا اور اب وہ مطمئن ہوا بیٹھا تھا۔

یوں لگتا تھا شاید اس "اغوا" کا وہ واحد عینی شاہد ہے۔

"ہم پولیس والے ہیں ٹھیکیدار صاحب...... کسی سے اس واقعہ کا ذکر نہیں کرنا۔ یہ ملکی مفاد کا مسئلہ ہے۔ اپنی زبان بند رکھنا...... ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔"

ایک سفید پوش صوبیدار نے جس کی مونچھیں اس کے گالوں پر پھیلی ہوئی تھیں ٹھیکیدار سے کہا۔

"سر! آپ مطمئن رہیں۔ ذکر نہیں ہوگا جناب بیٹھیں کوئی چائے، پانی" ٹھیکیدار نے جو قدرے سنبھل چکا تھا، کہا۔

"نہیں شکریہ۔"

یہ کہہ کر وہ جس طرح آندھی اور طوفان کی رفتار سے آئے تھے اسی طرح واپس لوٹ گئے......!

کار میں انسپکٹر ملک کے ساتھ اس کا ایک اور ساتھی بیٹھ گیا تھا اور وہ لوگ گاڑی چلا کر اسی سیف ہاؤس پر لے آئے جہاں اختر کو رکھا ہوا تھا۔

✡......✡......✡

انقلاب

گرفتاری، پولیس، تفتیش، عدالتیں، جیل، چوہدری اختر کے لئے ان میں سے کوئی بھی نئی چیز نہیں تھی۔ اس کی آدھی زندگی ان ہی چکروں میں گزر گئی تھی

لیکن......

آج پہلی مرتبہ وہ بری طرح ڈگمگا گیا تھا۔

اس نے یہ اندازہ تو کر ہی لیا تھا کہ ضرور اسلم گرفتار ہو چکا ہوگا تب ہی وہ پکڑا گیا ہے ورنہ اس پر تو شک کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ گزشتہ پانچ سال سے وہ بڑی خفیہ اور بظاہر شریفانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس نے اپنے گاؤں سے تقریباً ناطہ توڑ لیا تھا اور سوائے اس کے چند عزیزوں کے اور کسی کو اس کے ٹھکانے کا بھی علم نہیں تھا۔

وہ اب سرحد بھی اپنے پیدائشی گاؤں سے نہیں کسی اور جگہ سے عبور کرتا تھا۔ پانچ سال سے جب اس کا تعارف بھارتی انٹیلی جنس سے ہوا تھا وہ موجیں کر رہا تھا......اندرون ملک اس نے ہیروئن کا کام شروع کر رکھا تھا اور ہیروئن کا ایک آدھ چکر مہینے میں وہ سرحد کے پار بھی لگا لیا کرتا تھا۔ بھارتی انٹیلی جنس کے تحفظ نے اسے دنوں میں کروڑ پتی بنا دیا تھا اب اس کی ذاتی بسیں چل رہی تھیں جو اس نے ایک ٹرانسپورٹ کمپنی کو دی ہوئی تھیں۔

ان دنوں وہ ملک کے دارالخلافہ میں اپنا گھر خرید کر وہاں رہنے کا پروگرام بنا رہا تھا......!

بہت عرصے بعد اس کی دلی ہوس پوری ہوئی تھی اسے گائیتری جیسی خوبصورت لڑکی انعام میں ملی تھی اور لاکھوں روپے الگ ملنے والے تھے کہ اچانک یہ بپتا آن پڑی۔

آخر اسلم کیسے پکڑا گیا؟

وہ تو بڑا چالاک اور ہوشیار تھا۔

ملاقات پر وہ آخری لمحات میں سامنے آتا تھا۔

ایسا محتاط بندہ کیسے ان کے قابو آ گیا۔

اور......

اتنا کمزور نکلا کہ اس نے چوہدری اختر کو بھی پھنسا دیا۔

وہ بڑی الجھن محسوس کر رہا تھا۔

دونوں ہاتھ پشت پر بندھے تھے اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی اور چشم تصور میں وہ دیکھ رہا تھا کہ جس شخص نے اسے قابو کیا تھا اور اب پستول لیے اس کے سر پر بیٹھا تھا اگر وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی کرتا تو ممکن ہے پستول والا گولی اس کے سر سے پار کر دیتا۔

جیپ نے کتنا سفر کیا؟

کس راستے سے گئی؟

اور......

یہاں تک کیسے پہنچی؟

اسے کچھ علم نہ ہو سکا۔

ایک جگہ جب جیپ رکی تو دو مضبوط ہاتھوں نے اسے جھٹکے سے نیچے اتارا پھر کوئی اس کے بازو سے اسے پکڑ کر تیز تیز چلاتا سیڑھیوں تک لایا جس کے بعد اسے دو تین سیڑھیاں چڑھنی اترنی پڑیں اور بالآخر اس کی آنکھوں سے پٹی اور دونوں ہاتھ کھول دیئے گئے۔

چوہدری اختر کی آنکھیں جب کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اسے فوراً اندازہ ہو گیا کہ وہ کسی زمین دوز قید خانے میں بند ہے اس کے سامنے تین چار لمبے تڑنگے اور کسرتی بدن کے جوان کھڑے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ ڈھنگ سے ان کی شکلیں ہی دیکھ پاتا اچانک ایک کمبل اس کے سر پر آ گرا۔

اور......

اس سے پہلے کہ وہ صورتحال کا کچھ اندازہ کر پائے اچانک اس پر قیامت ٹوٹ پڑی اس کے جسم پر لاٹھیاں ایسے برس رہی تھیں جیسے گاؤں میں لوگ گیہوں کی فصل کو پودے سے الگ کرنے کے لیے زمین پر پٹخا کرتے ہیں۔

مارنے والے شاید تربیت یافتہ تھے کیونکہ وہ اسے وحشیوں کی طرح پیٹ رہے تھے لیکن کیا مجال جو اس کی کوئی ہڈی ٹوٹی ہو یا اس کے سر پر چوٹ آئی ہو۔

چوہدری اختر کو یوں لگا جیسے اس کا دم گھٹ جائے گا اور وہ مرجائے گا کیونکہ اس کے

جسم پر لاٹھیاں برس رہی تھیں اور وہ خود کمبل میں قید تھا۔ اسے اپنا سانس رکنے کا احساس ہوا۔

لیکن......

اس کا سانس رکا نہیں......

تین چار منٹ کی مار نے اس کے جسم کے سارے جوڑ جوڑ ہلا دیئے تھے اور مسلسل چیخنے چلانے سے اس کے پھیپھڑوں نے جیسے اب اس کی بات ہی ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

اس نے زندگی میں پولیس کی بڑی بڑی مار کھائی تھی۔

لیکن......

یہاں پہلے ہی حملے نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔

بے ہوش چوہدری اختر کو ان لوگوں نے ڈنڈہ ڈولی کر کے اٹھایا اور ایک کوٹھڑی میں لا کر پھینک دیا اسے سب سے پہلے اس کوٹھڑی میں ہوش آیا تھا جس میں ہوا آنے کا رستہ صرف لوہے کی وہ چار سلاخیں تھیں جو اس میں نصب دروازے میں لگی تھیں۔

چوہدری اختر ہوش میں آنے کے بعد بھی جان بوجھ کر لیٹا رہا۔ وہ اس طرح خود کو نارمل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے جسم کا بند بند درد کر رہا تھا اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم کی ساری ہڈیاں تڑخ گئی ہوں ٹوٹنے کا اندازہ وہ اس سے نہیں لگا رہا تھا کہ وہ ہل جل سکتا تھا۔

بس انہوں نے شاید اس کے جسم میں اتنی ہی سکت باقی چھوڑی تھی۔

''اٹھ اوئے۔''

اچانک ہی اس کے سر پر قیامت ٹوٹی۔

چوہدری اختر نے لوہے کی سلاخوں والے دروازے کی طرف دیکھا جہاں موت کے فرشتے کی شکل میں ایک لمبا تڑنگا نوجوان کھڑا اسے گھور رہا تھا۔

چوہدری اختر سہم کر اٹھ بیٹھا اس نے دیوار سے ٹیک لگائی ہوئی تھی۔

''کھڑا ہو جا......''

اگلا حکم ملا۔

''چوہدری اختر نے سہم کر اٹھنے کی کوشش کی تو سارے بدن کی ہڈیاں احتجاج کرنے لگیں۔ وہ جان بوجھ کر دوبارہ بیٹھ گیا۔

''مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جاتا۔''

اس نے حکم دینے والے سے کہا۔

''اچھا...... تجھ سے کھڑا نہیں ہوا جاتا...... ابھی لے بیٹا...... کھڑا ہونا تو کیا تو بھاگے گا ایسے بھاگے گا جیسے اتھلیٹ بھاگا کرتے ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔

اور......

چوہدری اختر سمجھ گیا کہ اس پر نئی مصیبت آنے والی ہے۔

وہ خوفزدہ ہو کر چلایا۔

''ٹھہرو...... ٹھہرو...... رک جاؤ کھڑا ہوتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ واقعی اٹھ کھڑا ہو گیا۔ اس کے جسم کا رواں رواں درد کر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے...... اب ہوا ناں کھڑا۔ میں نے سوچا تھا تیرے لیے سٹریچر لے آؤں۔''

اس نے اختر کو موٹی سی گالی دے کر کہا۔

''خبردار اگر بیٹھنے کی کوشش کی۔ کھڑے رہنا۔''

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے ہٹ کر دوسری طرف چلا گیا۔

سامنے کا منظر ایک حد تک ہی اسے دکھائی دے سکتا تھا۔ چوہدری اختر نے اسے دائیں طرف گھومتے دیکھا اور بیٹھنے کا ارادہ کیا۔

لیکن......

اس کی ہمت نہ پڑی۔

اس نے سوچا اگر وہ بیٹھ گیا تو کہیں دوبارہ وہی ''کمبل پریڈ'' نہ شروع ہو جائے اور عین ممکن ہے اس کی نگرانی بھی ہو رہی ہو البتہ اس نے دیوار سے ٹیک ضرور لگائی تھی پھر ایک قدم اٹھا کر یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ وہ چل بھی سکتا ہے یا نہیں۔

چوہدری اختر کو ایک طرح سے خوشی تو ہوئی کہ اس کے قدموں نے دماغ کے احکامات مانے ہیں لیکن دو تین قدم ہی اٹھانے سے اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ جیسے جیسے وہ حرکت کرتا تھا اس کے بدن سے درد کی ٹیسیں اٹھ اٹھ کر اس حرکت کے خلاف احتجاج کرتی تھیں۔ اچانک اسے راہداری سے کچھ قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔

ایک مرتبہ پھر اسے اپنے بدن سے جان نکلنے کا احساس ہوا۔ ظاہر ہے ان کی آمد کوئی اچھا شگون نہیں تھا۔

آنے والوں کی تعداد تین تھی اور وہ شکل سے ہی موت کے فرشتے نظر آرہے تھے۔

وہ اختر کو یوں گھور رہے تھے جیسے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کھا جانے والے ہوں...... ان میں سے ایک نے اس کی کوٹھڑی کا باہر سے دروازہ کھولا اور دوسرے نے اندر آکر اس کو دونوں بازوؤں سے قابو کرلیا جبکہ تیسرے نے اس کے سر پر ایک بڑی سی سیاہ رنگ کی ٹوپی ڈال دی۔

اس سیاہ رنگ کی لمبی سی ٹوپی نے اس کا سارا منہ ڈھانپ دیا تھا اور اسے اپنے اندھے ہونے کا احساس ہونے لگا تھا۔

اسے یاد آگیا ایسی ٹوپی عموماً سزائے موت پانے والوں کے سر پر ڈالی جاتی ہے جس کے بعد ان کے گلے میں رسہ ڈال کر پھندہ لگایا جاتا ہے۔

کیا اس کے گلے میں بھی اب پھندہ لگا کر اسے پھانسی پر لٹکایا جائے گا؟

اس تصور نے اس کے سارے بدن میں سنسنی اور خوف کی لہر دوڑا دی تھی اور موت کا خوف اب اس پر حاوی ہونے لگا تھا۔

''چلو''

اس کا ہاتھ پکڑ کر کسی نے جھٹکا دیا۔

اختر سحر زدہ معمول کی طرح چلنے لگا۔

اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ وہی اختر بدمعاش ہے جو پولیس کی بڑی سے بڑی تفتیش کی پرواہ نہیں کیا کرتا تھا جس نے ایسے درجنوں ریمانڈ کاٹے تھے۔

لیکن......

نجانے کیوں یہاں آنے کے بعد سے اس کے دل و دماغ پر ایک خوف سا مسلط ہوگیا تھا۔ وہ لوگ اسے قریباً گھسیٹتے ہوئے دو تین منٹ تک چکر دلانے کے بعد ایک جگہ رک گئے۔ اسے کھڑا کر کے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا گیا۔ کسی نے اس کے سر پر پڑی موت کے قیدیوں والی ٹوپی اتاری۔ اس سے پہلے کہ اس کی آنکھیں کچھ دیکھنے کے لائق ہوتیں ایک زوردار لات اس کی کمر پر لگی اور وہ سامنے دیوار سے جاٹکرایا جس کیساتھ ہی ایک مضبوط ہاتھ نے اسے بالوں سے پکڑ کر سیدھا کھڑا کر دیا۔ اختر کی آنکھیں جب کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو سامنے ایک کونے میں دھری کرسی پر وہی نوجوان بیٹھا تھا جس نے اسے گرفتار کیا تھا۔

✿......✿......✿

''کیا نام ہے تمہارا؟''

اسے ایک آواز کسی دیوار میں سے آتی سنائی دی۔

گزشتہ تفتیشوں میں وہ اس سوال کا جواب بڑی سی گالی سے دیا کرتا تھا۔ لیکن اس مرتبہ شاید احساس جرم اس پر غالب تھا یا اس کے لاشعور میں کوئی خوف بیٹھ گیا تھا اس نے مخاطب کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''اختر حسین۔''

''شرکت ہسپتال کے بم دھماکے میں تمہارے ساتھ اور کون ملوث ہے۔''

اچانک ہی اگلا سوال کسی کوڑے کی طرح اس کے اعصاب پر لگا۔ اسے ہرگز امید نہیں تھی کہ اچانک اس طرح براہ راست یہ سوال ہوگا۔ معمول کی تفتیش میں بھی پہلے اس کی شناخت مکمل کی جاتی ہے۔

لیکن......

ان لوگوں کا نجانے کیا طریقہ کار تھا۔

شاید وہ اسے نفسیاتی طور پر بے بس کر کے اس سے سب کچھ اگلوا لینا چاہتے تھے۔

شاید اس طرح وہ اسے یہ بتانے جارہے تھے کہ انہیں اس کے متعلق تمام باتوں کا پہلے ہی سے علم ہے۔

شاید اسلم نے انہیں پہلے ہی سب کچھ بتا دیا ہو؟

بیک وقت کئی خیال بجلی کے کوندے کی طرح اس کے ذہن پر لپکے۔

''کون سا ہسپتال......کون سا دھماکہ؟''

اس نے گھبرا کر جواب دیا۔

''اچھا......تم نے اتنے دھماکے کئے ہیں کہ اب ایسے سوال کر رہے ہو......شرکت ہسپتال کے علاوہ اور کون کون سے دھماکے میں تمہارے ہاتھ ہیں۔''

زہریلی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے میجر خان نے اگلا سوال کیا۔

''دیکھئے آپ زیادتی کر رہے ہیں میں نے کسی......''

اختر نے کچھ کہنا چاہا۔

لیکن......اچانک اس کے پہلو میں لگنے والی زوردار ضرب نے اس کی زبان گنگ کر دی۔ وہ بڑا سخت جان تھا۔

لیکن...... اس کے منہ سے بے ساختہ ''ہائے'' نکل گیا۔

اس کی پشت پر کھڑے موت کے فرشتوں میں سے ایک نے اس کی داہنی پسلی پر ہاتھ کی ضرب لگائی تھی۔

اختر کو یوں لگا جیسے اس کی پسلی ٹوٹ گئی ہو...... وہ لڑکھڑاتا ہوا دیوار سے جاٹکرایا۔

لیکن ضرب لگانے والے نے اسے سر کے بالوں سے پکڑ کر پھر سیدھا کھڑا کر دیا۔

''اگر تم نے میرے اگلے سوال کا براہ راست اور صحیح جواب نہ دیا تو ایک ایک کر کے تمہارے جسم کی ساری ہڈیاں توڑ دی جائیں گی...... جس کے بعد اپاہج کر کے ہم تمہارے مالکان کو پارسل کر دیں گے...... بے فکر رہنا تم پر گولی ضائع نہیں کی جائے گی۔ گولی تمہیں وہی ماریں گے۔ ہم تمہیں سرحد کے پار پھینک دیں گے...... تم کیا سمجھتے ہو...... تمہاری اصلیت کا ہمیں علم نہیں......''

یہ کہہ کر اس نے چوہدری اختر کو اس کے گاؤں کے نام سے لے کر اس کے سارے جرائم ایک ایک کر کے بتا دیئے۔ اب اسے سمجھ آئی کہ انہوں نے اختر کی اصلیت کیوں دریافت نہیں کی تھی۔

یہ تو اس کے متعلق پہلے ہی سے سب کچھ جانتے تھے۔ اسے علم نہ ہو سکا کہ جب اسے اس ''سیف ہاؤس'' پر لایا گیا تو یہاں موجود ایک صوبیدار صاحب نے جو اس کے علاقے میں ڈیڑھ دو سال ڈیوٹی کر چکے تھے اسے فوراً پہچان لیا جس کے بعد اس سے متعلق تمام معلومات ان لوگوں کے پاس فوراً پہنچ گئی تھیں۔

''دیکھیے جناب میں مانتا ہوں ہم لوگ سمگلنگ کرتے ہیں لیکن جو بات آپ کہہ رہے ہیں وہ سچ نہیں۔''

اختر نے سنبھل کر کہا۔

''ٹھیک ہے...... میرے خیال سے تم ابھی تک خود کو پولیس کی حراست میں سمجھ رہے ہو۔ پہلے تمہاری غلط فہمی دور کر دی جائے۔ اس کے بعد تم سے ملاقات ہو گی۔''

یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

✿......✿......✿

ابھی اس نے کمرے سے باہر قدم دھرا ہی تھا جب اچانک اختر پر قیامت ٹوٹ پڑی اس کے دونوں ہاتھ ایک مضبوط نائلن کی ڈوری سے پیچھے باندھ دیئے گئے جس کے بعد

وہاں موجود تینوں جوانوں نے اسے تختہ مشق بنایا۔

وہ اسے بڑی نفرت اور حقارت سے پیٹ رہے تھے۔

شاید ان لوگوں کو اختر کی اصلیت کا علم تھا اور شرکت ہسپتال کے دھماکے نے ان سب کے دل میں اس کے لیے بے پناہ نفرت پیدا کر دی تھی۔

میجر خان نے صحیح کہا تھا۔

یہ واقعی پولیس نہیں تھی۔

ابھی دس پندرہ منٹ ہی گزرے تھے جب اختر نے ان سے پانی مانگنا شروع کر دیا......!!

لیکن......

وہاں اس کے لیے سوائے اذیت، مار اور نفرت کے اور کچھ نہیں تھا۔

وہ لوگ باری باری اپنی طاقت اختر پر آزما رہے تھے۔

مزید دس منٹ کی مار نے اسے ادھ موا کر دیا۔

اس نے گڑگڑاتے ہوئے ''بتاتا ہوں...... بتاتا ہوں'' چلانا شروع کر دیا۔

لیکن......

یہ لوگ تو شاید بہرے تھے۔

کیا مجال جو کسی نے اس کی بات پر کان دھرے ہوں۔ وہ مسلسل اپنے کام میں مصروف رہے۔ اختر بالآخر بے ہوش ہو گیا۔

اس نے تو یہی سوچا تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی جان چھوٹ گئی لیکن انہوں نے اسے ایک لمحے کی مہلت دینے سے بھی انکار کر دیا۔ بمشکل تین منٹ بعد ہی وہ لوگ اسے ہوش میں لے آئے اور اس کی منت سماجت کو نظر انداز کر کے پھر اس پر ٹوٹ پڑے۔ اختر کو یوں لگا جیسے واقعی اس کے جسم کی تمام ہڈیاں ایک ایک کر کے توڑی جا رہی ہوں۔

اور...... جیسے واقعی وہ لوگ اسے محتاج اور اپاہج بنا کر سرحد پار پھینکوانے پر تل گئے ہوں۔''

اس نے زمین پر لوٹنیاں لیتے ہوئے گڑگڑا کر ان سے معافیاں مانگنی شروع کر دیں۔ بے بسوں کی طرح گڑگڑاتے ہوئے وہ اپنا جرم قبول کر رہا تھا۔

لیکن......

وہ لوگ اپنے ہاتھ روکنے پر تیار نہیں تھے۔

ایک آدمی مسلسل اسے ہاتھوں، پاؤں اور وہاں دھرے ایک بید سے مارتا رہتا جس کے بعد دوسرا اپنی باری سنبھال لیتا اس کے بعد تیسرا۔ اس طرح باری باری آرام کرنے کے بعد وہ پھر اپنی باری کے لئے تیار ہو جاتے۔

اس درمیان دو مرتبہ وہ بے ہوش ہوا۔

آدھے گھنٹہ کی مارنے اسے انسان سے گدھا بنا دیا تھا۔ وہ طوطے کی طرح اپنے جرائم کی تفصیلات بیان کر رہا تھا۔

شاید اب انہیں رحم آ گیا تھا...... کیونکہ انہوں نے اس کے سامنے ٹیپ ریکارڈ رکھ دیا تھا اور اختر ساری واردات یوں سنا رہا تھا جیسے کوئی طالب علم انگریزی کا مضمون زبانی یاد کرنے کے بعد سنا رہا ہو۔

بیان کے خاتمے پر اس نے پانی مانگا۔

اور......

ان میں سے ایک نے سامنے پڑا مٹی کا گھڑا اٹھایا۔ جانوروں کی طرح کھلے اس کے منہ میں پانی انڈھیلا اور وہ گھڑا باقی پانی سمیت اس کے سر پر دے مارا۔

وہ لوگ اسے اس طرح نفرت سے گھور رہے تھے جیسے ان کا بس چلتا تو اسے اس طرح مارتے مارتے جان سے مار ڈالتے۔

اس کے سر پر گھڑا مارنا بھی ان کی نفرت کی دلیل ہی تھی۔ شرکت ہسپتال میں بم دھماکے کا اقرار اس کے منہ سے سننے کے بعد تو وہ اس کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ اختر کو یوں لگا جیسے اسے جان بوجھ کر ایسے لوگوں کے سپرد کر دیا گیا ہے جن کے پیارے اس دھماکے میں مارے گئے تھے اور جو اس ساری تباہی کا انتقام اب اس سے لینے پر تل گئے ہوں۔

اسے یوں لگا جیسے اب وہ کبھی زندہ بچ کر یہاں سے نہیں جا سکتا۔ یہ لوگ اسے اسی طرح مارتے مارتے بالآخر جان سے مار ڈالیں گے۔

لیکن......

قدرت کو شاید اس پر رحم آ گیا کیونکہ ان میں سے ایک باہر نکل گیا اور تھوڑی دیر بعد وہ میجر خان کے ساتھ اندر آ گیا۔

✡......✡......✡

اختر کے بیان والا ٹیپ ریکارڈ انہوں نے میجر کے نزدیک رکھ دیا تھا۔

"کیوں جوان کچھ یاد آیا یا نہیں۔"

میجر خان نے اس کی حالت پر ایک نظر ڈال کر طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"بتاتا ہوں...... بتاتا ہوں۔ خدا کے لئے مجھے مت ماریں......"

اس نے چاہا کہ گڑگڑاتے ہوئے میجر کے پاؤں پکڑ لے۔

لیکن......

ابھی وہ اپنی جگہ سے ہلا ہی تھی جب ایک زوردار ٹھوکر اس کے سر پر لگی اور اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

"وہیں سے بات کرو ان لوگوں پر میرا بھی کنٹرول نہیں جب تک تم سب کچھ نہیں بتا دو گے تمہیں یہیں رکھیں گے اور تمہارا یہی حشر کرتے رہیں گے......"

میجر نے بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔

"اچھا...... اچھا۔"

اختر نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

اور......

ایک مرتبہ پھر اس کے سامنے ٹیپ ریکارڈ رکھ دیا تھا۔ اب میجر صاحب اس سے سوال کرتے اور وہ ان کی تفصیلی جواب دیتا رہا۔

انہوں نے پہلے اس سے شرکت ہسپتال کے دھماکے سے متعلق تمام باتیں بالتفصیل پوچھیں پھر "را" کے جال میں پھنسنے سے آج تک کی ساری کہانی سنی۔ اس درمیان اسے تین چار مرتبہ پینے کے لئے پانی دیا گیا۔

اختر کی تفتیش چھ گھنٹے مسلسل ہوتی رہی۔

اسے علم تو نہیں تھا۔

لیکن......

وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ ساری رات گزر گئی ہے اور اب صبح ہونے والی ہے۔ کیونکہ وہ لوگ اسے اندھا کر کے پارک سے یہاں تک اور اس کی کوٹھڑی سے اس کمرے تک لائے تھے۔

اختر کو یقین نہیں تھا کہ وہ اپنے قدموں پر چل کر اب واپس یہاں سے کہیں اور جا سکے گا......!!

اس کا بیان ختم ہوا تو میجر خان نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

''مجھے اجازت تو نہیں کہ تمہیں ایک لمحے کے لئے بھی چھوڑا جائے لیکن میں تمہیں ایک چانس دے رہا ہوں...... اب تمہاری جان تو قانون سے نہیں چھوٹے گی البتہ اگر تم چاہو تو ہم سے اپنی جان ضرور چھڑا سکتے ہو۔''

اختر نے اس کی طرف بڑی ترحم انگیز نظروں سے بھیک مانگنے کے انداز میں دیکھا تھا۔

''ہم تمہیں پولیس کے حوالے کر دیں گے جہاں تم پیسے دے کر مزید مار کٹائی سے ضرور بچ جاؤ گے لیکن ایک شرط پر کہ تم یہاں موجود کسی بھی شخص کو جو کسی بھی طرح بھارتیوں کے لئے کام کر رہا ہے گرفتار کرواؤ...... ان کے تمام ممکنہ ٹھکانے بتاؤ۔ اور وہ سب کچھ بتاؤ جو تم جانتے ہو...... میں تمہیں چھ گھنٹے کی مہلت دے رہا ہوں۔ اس دوران اپنے آپ کو تیار رکھو...... اپنے ذہن پر زور ڈال کر یاد کرو...... مجھے ایک ایک تفصیل چاہئے...... شاہ پور کے ٹریننگ سنٹر میں جن لوگوں کو تم نے دیکھا تھا ان سے متعلق ایک ایک تفصیل...... ان کی شکل یاد کرو...... اچھی طرح یاد کرو...... اسی میں تمہاری نجات ہے...... اور ہاں ایک بات کان کھول کر سن لو کہ تمہیں کسی اور نے نہیں تمہارے آقاؤں نے ہی گرفتار کروایا ہے...... جن کے لئے تم نے اپنی مادر وطن سے غداری کی۔ اپنے بے گناہ لوگوں کا خون بہایا انہوں نے تمہیں استعمال کرنے کے بعد ٹشو پیپر کی طرح پھینک دیا۔ کیونکہ اب تم ان کے کام کے نہیں رہے تھے۔ اس لئے انہوں نے تمہارے متعلق ہمیں اطلاع دے دی...... لعنت ہے تم پر...... لعنت ہے تم پر......''

میجر خان نے نفرت سے اس کی طرف دیکھا۔

اور......

وہ باہر آ گیا۔

اسے امید تھی کہ آخری نفسیاتی کوڑا جو اس نے چوہدری اختر کے ضمیر پر لگایا تھا اسے ضرور جگا دے گا۔

✡......✡......✡

میجر خان کے جاتے ہی انہوں نے اختر کو کھڑا کر دیا۔

اس کے لئے اپنے قدموں پر کھڑے ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ پھر بھی وہ ہمت کر کے کھڑا ہو ہی گیا۔ ایک مرتبہ پھر اس کے سر پر وہی ٹوپی چڑھا دی گئی اور وہ ٹھیک اسی طرح اختر کو گھسیٹ کر اسی کوٹھڑی میں لے آئے۔

لیکن......

اس مرتبہ انہوں نے حیرت انگیز طور پر اسے مارا نہیں۔

شاید وہ سمجھ گئے تھے کہ اب مزید مار کہیں اس کی جان ہی نہ لے لے انہوں نے دوبارہ اسے کوٹھڑی میں داخل کرنے کے بعد اس کی آنکھوں سے پردہ ہٹایا اور چپ چاپ باہر آ گئے۔

ان کی روانگی کے بعد اختر کو اپنے جسم سے زیادہ روح کی تکلیف نے گھائل کر دیا۔

اسے ''را'' نے ہی پکڑوا دیا اس کا ناجائز استعمال کرنے کے بعد اسے گرفتار کروا دیا۔

اسے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے آپ سے گھن محسوس ہونے لگی تھی۔

غصے سے اس کا خون کھل رہا تھا۔

وہ گندے کاغذ کی طرح استعمال ہوتا آیا ہے؟

اس کی یہ اوقات تھی؟

اتنے بڑے بدمعاشوں کی اولاد کو ہندوؤں نے کتے کے پلے کی طرح اپنا غلام بنانے کے بعد اس کے ساتھ یہ سلوک کیا۔

غصے، بے بسی اور اذیت نے اسے لاچار کر ڈالا۔

اسے اپنا سر گھومنے کا احساس ہو رہا تھا۔

ساری زندگی کی بھینٹ چڑھانے والے اختر کو اس بات کا تو علم ہی نہیں تھا کہ اس کا ضمیر اسطرح کبھی انگڑائی لے کر بیدار ہو جائے گا اور اسے مار ڈالے گا...... میجر خان کا ایک ایک لفظ اس کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اترا تھا اور تازیانہ بن کر اس کے ضمیر پر برس رہا تھا۔

اسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی تھی۔

وہ کیا کرے؟

کدھر جائے؟

کیا اپنے جذبات سے کسی کو آگاہ کر دے؟

کوئی اس کی بات پر یقین کر لے گا کہ اس کا ضمیر جاگ پڑا ہے؟

وہ چاہتا تھا کہ ''را'' کو تباہ کر دے۔

ان تمام لوگوں کو ایک ایک کر کے مار ڈالے جنہوں نے اس کو جیتے جی مار ڈالا تھا

جنہوں نے اس پر جادو کر کے اس سے اتنا گھناؤنا اور گھٹیا کام کروایا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اس زمین پر سب سے زیادہ قابل نفرت اور مکروہ انسان ہے۔

شاید اس کا جرم جاننے کے بعد اس کا کوئی رشتہ دار بھی اس پر تھوکنا پسند نہ کرے۔ شاید اب وہ تختہ دار پر جھولنے تک اسی طرح نفرت کا شکار رہے گا...... کہیں وہ پاگل ہی نہ ہو جائے؟

لیکن......

ایک راستہ تھا۔ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کا ایک راستہ اس کے پاس تھا۔ کسی طرح وہ یہاں سے نکلے اور ان تمام لوگوں کو ایک ایک کر کے مار ڈالے جنہوں نے اسے اس حال تک پہنچایا تھا کہ خود وہ اپنے آپ سے نفرت کرنے لگا تھا...... ایک مرتبہ وہ اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کر لے اسی کے بعد کوئی پرواہ نہیں۔ اس کے بعد چاہے اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔

اسے پرواہ نہیں تھی

کیا یہ لوگ اسے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کا موقعہ دے دیں گے؟ خدا جانے اس گائیتری نے اب تک اس جیسے کتنے پاکستانیوں کی رگوں میں وطن دشمنی کا زہر گھولا ہوگا۔

اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے گناہوں کا احساس کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کو یاد کیا تھا اور سچے دل سے دعا مانگی تھی کہ اسے زندگی میں اتنی مہلت مل جائے کہ وہ ایک مرتبہ اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کر لے۔

وہ چاہتا تھا کہ کسی بھی طرح اسے اللہ تعالیٰ ایک موقعہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کا دے دیں۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ اسے اپنی آنکھوں میں اپنے گناہوں کے سبب نمی کا احساس ہوا تھا۔ اسے اپنے گاؤں کی مسجد کے مولوی صاحب یاد آ گئے جنہوں نے ایک روز اس کے باپ سے کہا تھا کہ اگر تم نے واقعی کسی مسلمان کے گھر جنم لیا ہے تو ایک دن ضرور تمہارا ضمیر جاگے گا اور تم پچھتاؤ گے۔

مولوی صاحب نے کتنی سچی بات کہی تھی۔

اسے نجانے کہاں سے مولوی صاحب یاد آ گئے۔

✿......✿......✿

برآمدے کے کونے سے آنے والی قدموں کی آہٹ نے پھر اسے چوکنا کر دیا اور وہ ادھر متوجہ ہو گیا۔ اس مرتبہ آنے والا اکیلا تھا اور اس نے کھانے کی ایک ٹرے بھی اٹھا رکھی تھی۔ قریب آنے پر اس کی شکل اختر کو کچھ جانی پہچانی دکھائی دی اور اسے فوراً یاد آ گیا یہ تو وہی صوبیدار تھا جو پانچ چھ سال پہلے اس کے علاقے میں ڈیوٹی کرتا رہا اور جس نے ان کے گھر کے قریباً ہر فرد کو تھانے کا منہ دکھایا تھا۔

''تم نے مجھے پہچان تو لیا ہوگا۔''

صوبیدار نے کھانے کی ٹرے سلاخوں کے نیچے موجود خلا سے اندر داخل کرتے ہوئے کہا۔ اپنے اچانک جاگ اٹھنے والے ضمیر کے ہاتھوں بے چین چوہدری اختر نے صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔

''جس طرح کا جرم تم نے کیا ہے اگر میرے بس میں ہو تو تمہیں میدان میں گاڑ کر تم پر کتے چھوڑ دوں...... لیکن افسران کے حکم نے ہمارے ہاتھ باندھ رکھے ہیں...... بے غیرت انسان لعنت ہے تیرے مسلمان ہونے یا کسی مسلمان کے گھر جنم لینے پر۔ تو نے ہمارے دشمنوں، بلکہ مسلمانوں اور پاکستان کے دشمنوں کے ساتھ مل کر اتنا گھناؤنا کام کیا...... اختر اگر تیرے باپ کو بھی تیرے اس جرم کا پتہ لگے تو وہ تجھے اپنا تخم تسلیم کرنے سے انکار کر دے گا۔ جب تجھے پھانسی لگے گی تو تیری لاش وصول کرنے والا کوئی نہیں ہوگا...... تیرے بزرگ بدمعاش ضرور ہیں لیکن ایسی گھٹیا حرکت کا تو انہوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ اب تم خود سوچ لو تمہارا انجام کیا ہوگا۔''

صوبیدار صاحب جب اس کی طرف دیکھ کر بات کر رہے تھے تو ان کی آنکھوں میں نفرت کے الاؤ سلگ رہا تھا انکے چہرے کا رنگ تبدیل ہو رہا تھا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں صوبیدار صاحب میری عقل پر پتھر پڑ گئے میں اندھا ہو گیا تھا لیکن مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے گناہ کا احساس بھی ہوا ہے...... آپ ہمیں جانتے ہیں ہم لوگ تفتیش یا مار سے گھبرانے یا ماننے والے نہیں...... کاش مجھے ایک موقعہ مل جائے میں اپنی تباہی کے ذمہ داروں کو برباد کر کے رکھ دوں گا۔ جنہوں نے میرا یہ حال کیا میں ان کا نشٹ مار دوں گا۔ کاش مجھے ایک موقعہ مل جائے......''

اس نے تاسف سے کہا۔

صوبیدار نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور دل ہی دل میں حیران رہ گیا۔

واقعی وہ سچ کہہ رہا تھا۔

زندگی کے تیس سال فوج میں گزارنے کے بعد اسے انسانی چہرے کے تاثرات پڑھنے پر خاصا ملکہ حاصل ہو چکا تھا۔

صوبیدار اس کے سارے خاندان اور گاؤں کو جانتا تھا۔

اسے علم تھا کہ یہ لوگ پولیس کی مار یا کسی بھی تفتیش سے ڈر کر کچھ کہنے والے نہیں ہیں۔خوف تو ان کم بختوں کو چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔

کیا واقعی اس کا ضمیر جاگ اٹھا ہے؟

اگر ایسا ہے تو اس آدمی سے کام لیا جا سکتا ہے۔

اسے اچھے مقصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

بالکل ایسے ہی جیسے دنیا کی بہترین فوجیں "کنڈم پریزنرز" سے کام لیا کرتی ہیں۔

مرنا تو اسے تھا ہی۔

عین ممکن ہے کہ وہ مرتا مرتا کچھ نقصان دشمن کا کر جائے۔

کچھ ایسی ہی سوچوں نے اس کے دل و دماغ پر قبضہ کر رکھا تھا جب اسے چوہدری اختر کی آواز سنائی دی۔

"صوبیدار صاحب مرنا تو مجھے ہے ہی...... لیکن میں مرنے سے پہلے اگر اپنے ساتھ اور بے گناہ لوگوں کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا تھوڑا بہت ازالہ بھی کر گیا تو اس سے زیادہ اعزاز میرے لئے اور کیا ہوگا۔"

اس کے لہجے کی تڑپ اس کے اندر اٹھتے تبدیلی کے انقلاب کی شاہد تھی۔

صوبیدار خاموش رہا۔

وہ اپنی حیثیت میں اس سے کچھ وعدہ نہیں کر سکتا تھا۔

"کھانا کھالو۔"

یہ کہہ کر وہ واپس لوٹ گیا۔

✿......✿......✿

صوبیدار کھانا رکھ کر چلا گیا۔

لیکن......

چوہدری اختر کی بھوک تو کب کی مر چکی تھی۔

شرکت ہسپتال میں مرنے والے بے گناہوں کی اخبارات میں چھپی تصویریں اس کو اچانک دکھائی دینے لگی تھی۔

وہ انٹیلی جنس کی مار سے تو شاید نہ گھبراتا۔لیکن اسے اندر سے جو مار ضمیر کے انگڑائی لے کر جاگنے کے بعد پڑنے لگی تھی اس نے چوہدری اختر کو بے چین کر کے رکھ دیا تھا۔اسے اب ایک پل قرار نہیں تھا۔

روٹی کی طرف اس نے نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا۔

اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ جس طرح کی بے چینی اور بے بسی نے اسے جکڑ لیا ہے اس کا علاج سوائے موت کے اور کچھ نہیں اور اب وہ شاید مر کر بھی اس اذیت سے نجات نہ پائے۔پھر وہ کیا کرے؟

"چوہدری اختر......انتقام لے۔ورما ملک کو گائیتری کو، اسلم کو اور اس تخریبی مرکز کو تباہ کر دے جس نے تجھے اس حال تک پہنچایا۔"

اس کے اندر سے ایک آواز بار بار اٹھ رہی تھی۔

"میں تمہیں مار ڈالوں گا......تم بچ نہیں سکو گے......اف میرے خدایا تم نے مجھے اتنا بے غیرت بنا دیا تھا......تم نے چوہدری اختر کو اتنا بے غیرت بنا دیا تھا اب تم بچ نہیں سکتے۔مجھے تو مرنا ہی ہے لیکن میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔"

اس نے دیوانوں کی طرح بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

چوہدری اختر نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ بھاگنے کی کوشش کرے گا بھلے اسے چھلانگ ہی کیوں نہ لگانی پڑے۔اس طرح اگر وہ فرار کی کوشش میں مارا گیا تو بھی اس کی جلد ہی خلاصی ہو جائے گی کیونکہ دوسری صورت میں بھی اسے اپنی موت کا طویل انتظار کرنا پڑے گا۔

عدالتوں کی تاریخیں پڑیں گی۔

جیل جانا پڑے گا۔

اس کی تصویریں اور کارنامے اخبارات میں چھپیں گے۔

اسے تو جیل کے قیدی بھی شاید قبول نہ کریں۔

اس کے لئے چند روز زندہ رہنا موت سے بھی بدتر تھا۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر فرار کی کوشش میں مارا گیا تب بھی ٹھیک ہے۔بچ نکلا تو کسی بھی صورت سرحد عبور کر کے انڈیا جائے گا اور اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کرے گا۔

اس فیصلے نے اسے قدرے مطمئن کر دیا۔

✿......✿......✿

صوبیدار علی بخش اس وقت میجر خان کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھا تھا اور میجر خان

اس کے چہرے کی سنجیدگی سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ علی بخش دھوکہ نہیں کھا رہا۔

"سر! میں اس کی ساری نسل کو جانتا ہوں...... یہ سمگلر اور بدمعاش لوگ ہیں لیکن ہمارے لیے کام کرتے آئے ہیں اختر شروع ہی سے کچھ زیادہ ہی ہوشیار تھا لیکن میرے خیال سے اسے چانس دے ہی دیں مرنا تو اس نے ہے ہی...... ادھر جا کر اگر اس نے سرنڈر کیا تو بھی وہ اسے مار ڈالیں گے۔ اب دوبارہ اس سے کام تو وہ لیں گے نہیں......"

صوبیدار علی بخش نے کہا۔

"صوبیدار صاحب...... دیکھ لیں...... رسک ہے...... بڑا خطرناک تخریب کار ہے۔ اس حیوان کو ایک لمحے کے لئے بھی زندہ چھوڑنے کو جی تو نہیں چاہتا...... پھر بھی میں ہائی کمان سے بات کرتا ہوں۔"

میجر خان کو صوبیدار علی بخش پر بہت بھروسہ تھا۔

گزشتہ دو سال سے وہ انٹیلی جنس ڈیوٹی کر رہا تھا۔ دونوں نے دو جنگیں اکٹھی لڑی تھیں۔ کئی فوجی مہموں میں ایک ساتھ رہے تھے۔ علی بخش کی بہادری اور حب الوطنی بھی شک و شبہ سے بالاتر تھی۔

"سر! اگر یہ کچھ کرتا ادھر مارا بھی جائے تو بھی ان لوگوں کو وارننگ تو ہو گی...... وہ یہ تو سوچیں گے کہ گنگا الٹی بھی بہہ سکتی ہے...... عین ممکن ہے اس کے بعد وہ کچھ محتاط ہی ہو جائیں۔ کرنے سے پہلے کچھ سوچ لیا کریں...... ممکن ہے......"

اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

میجر خان سگریٹ سلگا کر کچھ سوچنے لگا تھا۔

چند منٹ کی ذہنی کشمکش کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا کہ کرنل صاحب سے بات کر کے دیکھ لے۔ حتمی فیصلہ تو اوپر ہی ہوتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس میں کوئی بہتری کا پہلو نکل آئے۔

"دیکھتا ہوں صوبیدار صاحب......"

اس نے مختصر سا جواب دیا۔

اور......

صوبیدار علی بخش سیلوٹ کر کے چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ مکمل فائل اور ٹیپ ریکارڈ بیانات کے ساتھ کرنل صاحب کے سامنے کھڑا تھا۔ کرنل صاحب نے بڑے اطمینان سے اس کی ساری بات سنی تھی اور اس سے کچھ مہلت طلب کی تھی۔ شاید وہ ان بیانات کو خود سننا چاہتے تھے۔

دوسرے روز دوپہر کے بعد انہوں نے میجر خان کو او۔ کے سگنل دے دیا......!

میجر خان نے اس روز دوپہر کے بعد اسے پھر تفتیش کیلئے طلب کر لیا...... اس مرتبہ چوہدری اختر ان کے سامنے پیش ہوا تو وہ بدلا ہوا اختر تھا۔

شاید زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے نماز کے وقت نماز پڑھنے کے لئے اجازت طلب کی تھی۔ اس مرتبہ اس پر تھرڈ ڈگری طریقہ نہیں اپنایا گیا تھا البتہ اس سے سوالات کرنے والوں کی تعداد ایک کے بجائے تین تھی۔

یہ جوائنٹ انوسٹی گیشن ٹیم تھی جس نے اگلے تین روز تک مختلف وقفوں سے اس کی تفتیش کی۔ اس دوران اس کی حرکات و سکنات کا مکمل ریکارڈ رکھا جا رہا تھا۔ مزید سات روز گزرنے پر میجر خان کو یقین ہو گیا کہ وہ جو کچھ کہتا ہے۔ صحیح ہے۔

واقعی وہ ایک بدلا ہوا انسان تھا۔

اس مرتبہ میجر خان نے اسے اپنے ہمراہ لے کر جس کمرے میں آئے تھے وہاں ایک نوجوان جس کے چہرے پر عینک لگی تھی کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا کسی کام میں مصروف تھا۔ میجر خان کی آمد پر اس نے بڑے اطمینان سے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا اور بڑے ادب سے سلام کر کے ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ادھر بیٹھو"

میجر خان نے اختر سے سکرین کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔

اب وہ نوجوان اس کی طرف متوجہ تھا۔

"تمہیں اپنے ذہن پر زور دے کر اسلم کا چہرہ ڈرائنگ کروانا ہے۔ اپنے ذہن کو حاضر کرو اور اس کے چہرے کے سارے نقش و نگار بتانے کی کوشش کرو۔" اس نوجوان نے کہا اور اختر کی طرف سگریٹ کی ڈبیا اور لائٹر بڑھا دیئے۔

اختر نے اطمینان سے سگریٹ سلگایا پھر ادھر متوجہ ہو گیا۔

"سب سے پہلے یہ بتاؤ اس کا چہرہ کیسا تھا، گول، کتابی یا کسی اور طرح کا؟"

اس نے انسانی چہرے کو چار حصوں میں تقسیم کیا اور اپنے کمپیوٹر کی سکرین پر اسے بتایا کہ وہ گول، لمبا، کتابی یا کسی اور طرح کا چہرہ کسے کہتے ہیں اس نے چار مختلف شکلیں دکھا کر اسے ڈرائنگ ماسٹروں کی طرح سمجھایا۔

"گول"

اختر نے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب یہ دیکھ کر بتاؤ کہ ان میں سے کون سے نمبر کا چہرہ اس کے چہرے کے نزدیک ترین تھا۔"

یہ کہہ کر اس نے گول کیٹگری کے پندرہ بیس چہرے یکے بعد دیگرے اختر کو دکھائے۔ اختر نے بڑی سوچ بچار کے بعد ایک چہرے پر اطمینان ظاہر کیا۔

نوجوان نے اس چہرے کو سکرین پر نمایاں کرتے ہوئے پھر اس کا اطمینان حاصل کیا۔ جس کے بعد اس نے اس نمبر سے ملتے جلتے چھ سات چہرے دکھائے۔

لیکن......

اختر بڑے اعتماد سے اپنے بتائے حلیئے پر قائم رہا۔

نوجوان نے کچھ بٹن تیزی سے دبائے اور اس چہرے کو محفوظ کرلیا۔

اس کے بعد گالوں، پھر آنکھوں، بھنوؤں، ہونٹوں، ناک، دانت غرض چہرے پر موجود ہر شے سے متعلق وہ اختر سے سوالات کرتا چلا گیا، اسے سکرین پر متعلقہ چیزیں دکھا دکھا کر اس کا اطمینان حاصل کرتا رہا۔

اس دوران اختر نے چائے کے تین کپ پیے۔ درجنوں سگریٹ پھونک ڈالے تھے۔

تین گھنٹے کی صبر آزما ذہنی مشقت کے بعد اس نے بالآخر اختر کو یادداشت کے سہارے جو چہرہ فائنل کیا اسے دیکھ کر اختر قریباً اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑا ہوگیا۔

اس چہرے کی حیرت انگیز مماثلت اسلم کے ساتھ تھی۔

"صرف انیس بیس کا فرق ہوگا جناب...... بالکل یہی تھا، بالکل یہی۔"

اختر کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

وہ تحسین بھری نظروں سے اس نوجوان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تھینک یو جنٹل مین......شکریہ......ویل ڈن۔"

میجر خان نے اس کی طرف گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے مبارکباد دی اور اختر کے ساتھ باہر آگیا۔

اس کے کمرے میں پہنچنے تک اس چہرے کے دس بار پرنٹ اس کی میز پر موجود تھے۔ اب انہیں اگلی مہم سر کرنی تھی۔

✡......✡......✡

اختر کو اس سیف ہاؤس پر چھوڑ کر وہ اپنے دو ماتحتوں کے ساتھ ہیڈ کوارٹر کی طرف جا رہا تھا۔ وہ لوگ صبح کی فلائٹ سے گئے اور دوپہر کو اپنی منزل پر پہنچ گئے۔

آفس کے اس سیکشن میں جہاں اختر اور اسلم کی ملاقات سے دس دن پہلے اور بعد بھارت سے آنے والے مسافروں کی ان تصویروں کا ریکارڈ موجود تھا جو وہ ویزہ کے درخواست کے ساتھ ہائی کمیشن میں دیا کرتے تھے اور ان کے دونوں ماتحت بیٹھ گئے۔

انہوں نے یہاں اس دورانیے میں آنے والوں کی ہزاروں تصاویر کی چھان پھٹک کی اور دس گھنٹے کی جان توڑ محنت کے بعد گوہر مقصود حاصل کرلیا۔ اپنے پاس موجود پرنٹ سے ملتی جلتی تین تصویروں کے پرنٹ انہوں نے حاصل کیے۔ ان کے مکمل کوائف اور پاکستان میں ان کے قیام والی جگہوں کی تفصیلات درج کرنے کے بعد وہ فتح کے نشے سے سرشار اپنے ٹھکانے کی طرف جا رہے تھے۔

اس مسلسل بھاگ دوڑ اور ذہنی کسرت نے گو کہ انہیں تھکا دیا تھا۔

لیکن......

وہ اس طرح تھک کر بیٹھنے والے نہیں تھے۔

میجر خان نے اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا کہ جس شخص کا نام اختر نے اسلم بتایا ہے اور جو ایک طرح سے اس کا ہینڈلر Handler تھا عین ممکن ہے کہ پاکستانی باشندہ نہ ہو۔

عین ممکن ہے اس کا تعلق بھارت سے رہا ہو؟

اسے علم تھا کہ "را" زیادہ تر کام بھارتی مسلمانوں ہی سے لیتی ہے اور انہیں پاکستان میں موجود اپنے سورسز (Sources) سے ملاقات کے وقت اپنی مقامی شناخت قائم رکھنے کی تربیت دی جاتی ہے تاکہ سورس کو یہ علم نہ ہو سکے کہ اس کا Handler ہینڈلر مقامی ہے یا غیر مقامی۔

✡......✡......✡

اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر اس نے علی الصبح اختر کو طلب کیا جو ابھی نماز سے فارغ ہوا تھا اور اب قرآن پاک پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے یکے بعد دیگرے تین تصویریں اس کے سامنے رکھ دیں اور اختر نے ایک لمحے کا توقف کیے بغیر انور کی تصویر اٹھالی۔

"تمہیں یقین ہے یہ وہی اسلم ہے۔"

میجر خان نے خوشی سے پھولے نہ سماتے ہوئے دریافت کیا۔

"سو فیصد......"

چوہدری اختر نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔"

میجر خان نے کہا اور اسے اپنے کمرے کی طرف روانہ کر دیا۔

اب تصویر کے مکمل کوائف اس کے سامنے تھے۔ اس نوجوان کا نام انور اور پاکستان میں داخلے کی تاریخ ان کے اندازوں کے عین مطابق تھی۔ انہیں بات کا تو یقین تھا کہ انور اپنا کام مکمل کر کے جا چکا ہوگا۔

لیکن......

کوئی ایسا کلو ضرور ہاتھ لگ سکتا تھا جس سے وہ اس تک پہنچ جاتے۔

میجر خان نے یہ مہم انسپکٹر ملک کو سونپی تھی جس پر اسے بے پناہ اعتماد تھا۔ ان کے پاس وقت کم تھا اور معاملات کی سنگینی کا احساس بھی ملک کو بخوبی تھا۔ اس نے میجر خان سے تین دن طلب کیے تھے۔

اور......

اگلے تین روز میں اس کیس کی مکمل فائل میجر خان کے سامنے پڑی تھی۔

انسپکٹر ملک کی اطلاعات کے مطابق انور اپنی ماں اور بہن کے ساتھ یہاں آیا تھا اور وہ ان سے قریباً پندرہ بیس روز پہلے واپس چلا گیا۔ وہ لوگ اقبال نامی ایک بیوہ کے بیٹے کے مہمان تھے جو ان کا کزن تھا۔

اقبال سے متعلق تمام معلومات یہاں موجود تھیں جن سے اس بات کا شائبہ تک نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی بھی طرح اپنے کزن کے اس روپ سے باخبر تھا یا اس کے ساتھ منسلک رہا تھا۔

اقبال کے تمام قریبی رشتہ داروں کے کوائف اس کی ماں سے متعلق مکمل معلومات اس کی آمدورفت، ملاقاتیں، دوستیاں غرض کوئی ایسا پہلو نہیں تھا جو انسپکٹر ملک نے تشنہ رہنے دیا ہو۔

انسپکٹر ملک نے اس کی تنخواہ اور گھریلو اخراجات تک کی مکمل فہرست تیار کی تھی اس کے رہن سہن کا انداز، محلے میں اس کا برتاؤ، پسند ناپسند غرض اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔

اتنی بھرپور اور جامع رپورٹ آج تک کبھی میجر خان کے سامنے کسی سے متعلق نہیں آئی تھی۔

اس نے تحسین بھری نظروں سے انسپکٹر ملک کی طرف دیکھا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے شاباش دی۔

”ویل ڈن ملک......ویل ڈن......“

اب انہوں نے اگلی حکمت عملی طے کرنی تھی۔

اور......

اسی روز اگلی حکمت عملی بھی طے پا گئی۔

سلمٰی اور خالہ ثریا کو گئے آج دسواں روز تھا۔

لیکن......

اقبال کو یوں لگتا تھا جیسے یہ کل کی بات ہو۔

جب سے سلمٰی گئی تھی اسے ایک پل قرار نہیں تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اسے پر لگیں اور وہ اڑ کر اپنی محبوبہ تک پہنچ جائے۔

دم رخصت دونوں نے ایک ساتھ جینے مرنے کے وعدے کیے تھے اور پھر روتی آنکھوں سے ایک دوسرے کو رخصت کیا تھا۔ دونوں کی ماؤں نے ایک دوسرے کے ساتھ اس رشتے پر آمادگی ظاہر کر دی تھی۔ دونوں کو یقین تھا کہ اب وہ جلد یا بدیر ایک ہو کر رہیں گے۔

لیکن......

اقبال کے دل کو کسی پل قرار نہیں تھا۔ اسے ایک ہی دھن لگی تھی کہ کب وہ گھڑی آئے جب سلمٰی اس کی ہو کر ہمیشہ کے لئے ان کے ہاں آ جائے۔

اس کے ماموں نے تو دونوں بہنوں سے کہا تھا کہ زندگی میں پھر نجانے کب ملنا ہو۔ یوں بھی دونوں ملکوں کے حالات اچھے نہیں رہتے کبھی بھی کچھ بھی ممکن ہے۔ خدا جانے اب آنے جانے کی جو سہولت ہے وہ کب تک برقرار رہتی ہے اس لئے ان غنیمت لمحوں کا فائدہ اٹھا کر یہیں چار رشتہ دار اکٹھے ہوں اور سلمٰی کے ہاتھ پیلے کر دیں۔

انہوں نے تو سلمٰی کے والد خان صاحب کی بھی گارنٹی دے دی تھی کہ وہ ناراض نہیں ہوں گے اور وہ خود فون پر ان سے اجازت مانگ لیں گے۔

لیکن......خالہ ثریا کو اپنے خاوند کی طبیعت کا علم تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ اس طرح ممکن ہے وہ اجازت تو دے دیں لیکن دل میں ایک گانٹھ سی ہمیشہ کے لیے بندھ جائے گی پھر سلمٰی کو انہوں نے بڑے ہی لاڈ پیار سے بالکل بیٹوں کی طرح پالا تھا۔ ضرور ان کا دل چاہتا ہوگا کہ اپنے دل کے ارمان پورے کر کے ہی بیٹی رخصت کریں۔

سب سے بڑھ کر خالہ ثریا کا میکہ تھا۔

وہ بڑے خاندانی پٹھان تھے۔ کسی بھی بات پر ناراض ہونے کے حقوق انہوں نے ہمیشہ اپنے پاس رکھے ہوئے تھے اور خالہ ثریا طبعاً ایسی تھیں کہ کبھی ایک پل کے لیے بھی اگر خان صاحب کے ماتھے پر تیوری آ جاتی تو ان کا دل بیٹھنے لگتا۔

خان صاحب نے اپنی خاندانی روایات کو ٹھوکر مار کر خالہ ثریا سے شادی کی تھی۔
انہوں نے اس شادی کی بھاری قیمت ادا کی تھی۔ جائیداد سے انہیں مکمل حصہ نہیں ملا تھا۔
کیونکہ انہوں نے اپنے خاندان سے باہر شادی کرنے کا جرم کیا تھا۔
لیکن ...کیا مجال جو کبھی انہوں نے ماتھے پر بل ڈالا ہو، خاندانی زمیندارہ تھا مگر شادی کے بعد سے مسلسل نوکری کر رہے تھے۔
خالہ ثریا کی خواہش تھی کہ ان کی بہن خود آکر خان صاحب سے رشتہ مانگیں۔ اس بہانے انہیں دہلی آنے کا موقعہ بھی مل جاتا اور جنت بی بی اپنے والدین کی قبروں پر فاتحہ بھی پڑھ جاتیں۔

اقبال نے ان کی روانگی کے پانچ چھ روز بعد ہی فون کر کے ان کی خیریت دریافت کر لی تھی اور سلمیٰ سے کہہ دیا تھا کہ وہ بس مہینہ دو مہینے کے بعد دہلی آکر اسے ہمیشہ کے لئے اپنے گھر لے جائیں گے۔
سلمیٰ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔
اسے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ اب اسے اگلی زندگی بسر کرنے کے لئے آئیڈیل ماحول مل جائے گا کیونکہ وہ اب باقی زندگی منافقت سے نہیں اپنی مرضی سے جینا چاہتی تھی۔
گزشتہ ایک سال سے جس تیزی سے اس کے بھائی میں تبدیلی آئی تھی اور جس طرح اس نے اپنی کایا بھی بدل لی تھی اس کے بعد سے تو وہ کچھ زیادہ ہی بدل نظر آنے لگی تھی۔

۞......۞......۞

اس روز بھی وہ کچھ انہی خیالات میں گھری کالج سے گھر واپس لوٹی تھی جب اسے گھر کے دروازے پر ہی اپنی والدہ سے علم ہوا کہ آج انور اور اس کے کچھ دوست کھانے پر آرہے ہیں۔ دیوالی نزدیک آرہی تھی اور اس موقعہ پر عموماً مسلمان اپنے ہندو دوستوں کو اپنے گھروں پر دعوت دیا کرتے تھے۔
ابھی پرسوں ہی اس کے ابا میاں نے اپنے دفتر کے ساتھیوں کو بلا رکھا تھا اور آج انور کے دوست آرہے تھے۔ شام ڈھل رہی تھی جب انور کی شکل انہیں دکھائی دی جس نے اپنے ہاتھ میں ایک ٹوکری پکڑی ہوئی تھی۔
''یہ کیا لائے ہو بیٹا۔''
والدہ نے پوچھا۔
''کچھ نہیں اماں......تمہارے مطلب کی چیز نہیں۔''

یہ کہہ کر اس نے اندر کمرے میں جانا چاہا۔
لیکن......
سلمیٰ آڑے آگئی۔
''ایسی کیا چھپانے والی بات ہے۔''
سلمیٰ کو کچھ شک گزرا۔
وہ پہلے ہی انور سے متعلق مشکوک تھی کیونکہ اس نے پاکستان سے آنے کے بعد اسے اکثر رات دیر گئے گھر آتے دیکھا تھا اور دو تین مرتبہ واضح طور پر محسوس کیا تھا جیسے اس نے شراب پی رکھی ہو۔
آج بھی اسے کچھ ایسا ہی شک گزرا تھا۔
سلمیٰ کے اس طرح درمیان میں آنے پر انور کچھ چڑ سا گیا۔
''تم نے ضرور پوچھنا ہے......شراب ہے یہ۔''
یہ کہہ کر وہ غصے سے اندر چلا گیا۔
دونوں ماں بیٹی سہم کر رہ گئیں۔
دونوں کو ایک بات کا تو علم تھا کہ انور کا کریکٹر تباہ ہو رہا ہے اور وہ شراب پینے کے علاوہ زیادہ وقت ہندو دوستوں کے ساتھ ہی گزارتا ہے۔
لیکن......
اس طرح گھر پر بھی وہ شراب کی محفل سجالے گا۔ اس کا انہیں کبھی گمان نہیں گزرا تھا۔
ماں بیٹی سہم کر رہ گئیں۔
اگر وہ خان صاحب کو شکایت کرتیں تو بھی ان ہی کا نقصان تھا۔ دونوں بددلی سے کھانا تیار کرنے لگیں۔ انور کے دوست آگئے تھے۔
آج پہلی مرتبہ تجسس کے ہاتھوں مجبور سلمیٰ نے ان کی شکلیں غور سے دیکھی تھیں اور اس کے ذہن میں خواہ مخواہ ایک شک جڑ پکڑنے لگا تھا۔ یہ لوگ شاید پولیس کے ملازم لگتے تھے جبکہ اس کا بھائی تو ریلوے میں کام کرتا تھا۔

۞......۞......۞

چپ چاپ وہ باورچی خانہ میں آکر ماں کا ہاتھ بٹانے لگی۔
کھانا تیار تھا۔
لیکن......

آج خلاف معمول سلمٰی اوراس کی ماں دونوں ہی ان لوگوں کے سامنے خود کھانا لے جانا نہیں چاہتی تھیں جن کے زور زور سے بولنے اور قہقہے لگانے کی آوازوں نے گھر کے درو بام ہلا کر رکھ دیئے تھے۔

سلمٰی نے دروازے کا پٹ بجا کر اپنے بھائی کو اس ارادے سے باہر بلایا کہ وہ خود کھانے پینے کی چیزیں اندر لے جائے۔

لیکن...... یہ کیا؟

انور نے باورچی خانے میں پہنچتے ہی انہیں گالیاں دینا شروع کردیں۔اس نے اس طرح بلانے پر غصہ کیا تھا۔سلمٰی کا جی چاہا کہ اس کا منہ نوچ لے۔آج زندگی میں پہلی مرتبہ وہ اپنے بھائی کے لئے نفرت کے جذبات محسوس کر رہی تھی۔

لیکن اپنی ماں کی حالت دیکھ کر وہ خاموش رہی۔

''بیٹا اس حالت میں میرا یا تمہاری بہن کا اندر جانا ٹھیک نہیں۔تمہارے ابا اگر گھر ہوتے تو اور بات تھی۔'' ماں نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

لیکن......

انور اور زیادہ بپھر گیا۔

بڑی مشکل سے انہوں نے انور کو کھانا اندر لے جانے پر راضی کیا۔

انور کے اس سلوک نے دونوں ماں بیٹی کو رلا دیا تھا۔سلمٰی نے تو باقاعدہ رونا شروع کردیا۔خالہ ثریا نے اس خوف سے کہ کہیں خان صاحب اپنی بیٹی کو روتے دیکھ کر انور پر برسنا نہ شروع کردیں اور یہاں نیا تماشا کھڑا ہو جائے اسے اپنے کمرے میں جا کر آرام کرنے کے لئے کہہ دیا۔

سلمٰی بھی یہی چاہتی تھی۔

وہ اپنا چہرہ پونچھتی کمرے میں چلی گئی۔

اس کے کمرے اور گھر کی بیٹھک کے درمیان والی کھڑکی کھلی تھی جس پر پردہ لٹکنے کی وجہ سے دوسری طرف سے کچھ دکھائی تو نہیں دے رہا تھا۔

لیکن......

شراب کے نشے میں بدمست اس کے بھائی اور اس کے دوستوں کی آوازیں مکمل سنائی دے رہی تھیں۔جو زور زور سے قہقہے لگاتے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

سلمٰی نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ان کی طرف کان لگا دیئے۔اس نے جان بوجھ کر

اپنے کمرے کی لائٹ آن نہیں کی تھی۔

سلمٰی کھڑکی کے کچھ نزدیک بیٹھی تھی جب اس نے اپنے بھائی کی آواز سنی جو کہہ رہا تھا۔

''ارے شکلا صاحب ابھی تو سالوں کا ایک ہسپتال اڑایا ہے......آپ حکم دیں تو اس مرتبہ ائیر پورٹ ہی نہ اڑا کر رکھ دوں..... ارے ہمارے لئے کچھ مشکل نہیں۔بڑا محفوظ ٹھکانہ ہے اپنا ادھر......''

سلمٰی چونکی۔

دوسری آواز آئی۔

''شکلا صاحب اس مرتبہ ہمارا شیر کہوٹہ پر حملہ کرنے جا رہا ہے آپ ذرا بڑا انعام تیار رکھیے۔

کسی نے نشے میں کہا۔

''وہ تو اپنے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے شکلا صاحب...... ادھر اپنا سالا کزن ہے ناں......جس کے پاس اپنا ڈیرہ لگتا ہے۔وہ اس فرم میں ہے جو کچھ ایسیی چیزیں فوج کو سپلائی کرتے ہیں۔ارے میں نے تو کہہ دیا تھا ورما صاحب سے کہ سالے نے دہلی آنا ہے ہمارا بہنوئی بننے والا ہے ناں......یہیں سالے کو قابو کرلیں گے......پھر کہاں جائے گا بچ کر......اس سے سارا کام کروا لیا کروں گا۔''

اس کے بھائی کی آواز سنائی دی۔

اور......

سلمٰی کو یوں لگا جیسے کسی نے پگھلتا ہوا سیسہ اس کے کانوں میں انڈیل دیا ہو۔

اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔

اس کے کانوں میں سنسناہٹ گونج پیدا کر رہی تھی......اور اسے یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی بس چند لمحوں بعد ہی اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر جائے گی......سوائے سماعت کے اس کی تمام حسیات کو موت آگئی......!!

اس کے کان سن رہے تھے۔

دماغ سمجھ رہا تھا۔

لیکن......

وہ خود ساکت تھی۔

سارا بدن ٹھنڈا پڑنے لگا تھا۔

دو تین منٹ کی گفتگو سننے کے بعد اسے علم ہوا کہ اس کا بھائی تو بہت دور جا چکا ہے۔ اسے پاکستان میں دوران قیام کے سارے واقعات یاد آ گئے۔

کیا شرکت ہسپتال کا دھماکہ اس نے کیا تھا؟

اور اب......

اب وہ اس کے ہونے والے خاوند، اس کے باپ کے ہونے والے داماد اور اپنے خالہ زاد کو ان موزیوں کے شکنجے میں دینے جا رہا تھا۔

محض چند روپوں اور عیاشی کے لیے اس نے اپنا ایمان ہی بیچ ڈالا تھا۔

سلمٰی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے۔

کدھر جائے؟

کس کو یہ سب کچھ بتائے جو اس نے سنا تھا۔

اپنی ماں کو، باپ کو؟

ماں تو سنتے ہی صدمے سے مر جائے گی۔

اور باپ......

وہ اپنے باپ کی طبیعت کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔

اگر اس کے باپ کو اپنے بیٹے کے کرتوت کا علم ہوا تو وہ اسے گولی مار کر خودکشی کر لیں گے۔ اس کا باپ باغیرت انسان تھا۔

خدا جانے اس کا بھائی کیسے اتنا بے غیرت بن گیا تھا۔

کیا کرے؟ کیا کرے؟

اس کا سر پھٹنے کو آ رہا تھا۔

اب اس کے لئے یہاں مزید ایک لمحہ بیٹھنا ممکن نہیں تھا۔

اپنے بھائی کے اس روپ کا علم ہو جانے کے بعد اسے انور سے کراہت ہونے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پاکستان کے ٹی وی خبرنامہ پر دیکھی وہ فلم چلنے لگی تھی جس میں شرکت ہسپتال میں مرنے والے بے گناہ مریضوں کی لاشیں دکھائی گئی تھیں۔

اسے اپنی خالہ، اقبال اور پاکستان کے لوگوں کا سلوک یاد آ رہا تھا...... انہوں نے ان سب کو کتنی عزت دی تھی۔

کتنا مان دیا تھا۔

ان کی خدمت دن رات نوکروں کی طرح کرتے تھے۔

خالہ جنت کس طرح ان پر بچھ بچھ جاتی تھیں۔

اپنے ہاتھوں انور کے لیے کھانا تیار کرتی تھیں...... اپنے ہاتھوں سے...... ان کے آرام کا کتنا خیال رکھا تھا انہوں نے۔

خود پنکھے کے نیچے سوتیں اور ان کو کولر والے کمرے میں سلایا کرتی تھیں۔

کیا مجال جو ایک لمحے کے لئے بھی انہوں نے کسی کی خدمت میں کسر اٹھا رکھی ہو۔

اور......

اس کے بھائی نے ان خدمات کا یہ صلہ دیا۔

اف میرے خدایا! کاش اسے موت آ جاتی۔ کاش وہ یہ سب کچھ کبھی نہ سن پاتی۔

اور اب......

اب یہ موذی...... جو اس کا بھائی تھا۔ اس کے خاوند کو بھی اس جہنم کی بھٹی میں جھونکنے جا رہا تھا۔ اس کے ہونے والے خاوند کے ذریعے اس ملک کو تباہ کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا جس کو بالآخر ان کی آخری پناہ بننا تھا۔

جسے وہ بھارتی مسلمان ہونے کے باوجود اپنا ملک کہہ سکتے تھے۔

بھارت ان کا دیش نہیں تھا...... حادثاتی طور پر اس نے یہاں جنم لیا اور یہیں کی ہو رہی۔ اس کی جڑیں اب یہاں نہیں وہاں تھیں پاکستان میں۔

خیالات کا ایک ریلا آتا اور اسے بہا کر دور لے جاتا۔

نجانے اس میں کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی کہ وہ خود ہمت کر کے اپنے قدموں پر اٹھی اور چلتی ہوئی اپنے پلنگ تک پہنچ گئی۔

وہ جان بوجھ کر اسی طرح اپنے بستر پر لیٹی تھی جیسے سو رہی ہو۔

اسے سب علم تھا کہ اماں کب اندر آئی۔

اس نے سلمٰی کو آواز دے کر بلایا اور یہ احساس ہونے پر کہ وہ سو رہی ہے واپس پلٹ گئی۔ شاید بے چاری نے اس حالت میں اپنی بیٹی کو بے آرام کرنے سے احتراز برتا تھا۔

شاید اس کے نزدیک تب یہی مناسب تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو سوتے ہی رہنے دے۔

جس طرح اس روز اس کے بیٹے نے حرام خوری کا مظاہرہ کیا تھا۔

اور......

جیسے اب وہ اپنے دوستوں کے ساتھ شراب کے نشے میں دھت کھانا کھاتے ہوئے

بے ہودہ انداز میں زور زور سے ہنس رہا تھا اگر اس کی بیٹی جاگ رہی ہوتی تو شاید یہ کچھ برداشت نہ کر پاتی۔

آج اس کے خاوند نے شاید اپنے آفس میں اوور ٹائم لگانے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ ان دنوں دفتر کا زیادہ سٹاف چھٹی پر تھا۔

وہ اللہ سے یہی دعا کر رہی تھی کہ خان صاحب ابھی نہ ہی آئیں۔

اگر وہ یہاں آ جاتے۔

اور......

یہ کچھ دیکھتے تو شاید ایک لمحے کے لئے بھی برداشت نہ کر پاتے۔

دوسری طرف یہی کچھ سوچتے سوچتے ان کی بیٹی کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ سلمٰی نے کروٹ بھی اس ڈر سے نہ بدلی کہ کہیں ان لوگوں کو اس کمرے میں اس کی موجودگی کا علم نہ ہو جائے۔

اس کے دوست کب گئے......

والد صاحب کب گھر آئے......

صبح کب ہوئی......

سلمٰی کو کچھ احساس نہیں رہا تھا......

اس کی تمام حسیات کو جیسے موت آ گئی تھی۔

صبح ہونے تک اس نے صرف ایک فیصلہ کیا تھا کہ وہ ان سارے واقعات سے اپنے منگیتر اقبال کو باخبر کرے گی۔

اقبال کے دفتر کا فون نمبر اس کے پاس تھا۔

وقت تیزی کے ساتھ ہاتھوں سے نکل رہا تھا۔ خدا نہ کرے کہیں وہ دہلی ہی نہ آ جائے اور ان درندوں کے شکنجے میں پھنس جائے۔

اس نے اقبال کو فون کے ذریعے سب کچھ بتا دینے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کی ہدایت اور رہنمائی پر ہی اگلا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہتی تھی۔

ایک فیصلے پر پہنچنے کے بعد وہ قدرے مطمئن ہو گئی۔ اب اسے اونگھ سی آنے لگی تھی پھر وہ گہری نیند سو گئی۔

پھندہ

اقبال اس روز معمول کے مطابق ہی دفتر پہنچا تھا جب اسے فون کی اطلاع ملی۔

فون کرنے والے نے بتایا تھا کہ اس کے پاس کوئی ضروری پیغام ہے اور ایک فون نمبر چھوڑ دیا تھا۔ اقبال نے حیرانگی سے فون کیا اور مطلوبہ شخص کا نام لیا دوسری طرف وہ لائن پر موجود تھا۔

''آپ اقبال صاحب بول رہے ہیں کیا؟''

دوسری طرف سے دریافت کیا گیا۔

''جی ہاں''

اقبال ابھی تک شناخت نہیں کر پایا تھا۔

''میرا نام کمال الدین ہے جناب۔ میں کل ہی دہلی سے آیا ہوں۔ انور صاحب نے آپ کے لیے کچھ سامان بھیجا ہے اور سلمٰی بہن کا ایک خط ہے...... میں ان کے ہمسائے ہی میں رہتا ہوں...... معاف کیجئے خود حاضر ہوتا لیکن مجھے دوسرے شہر جانا ہے اور آج ہی روانگی ہے اس لئے آ نہیں سکتا...... آپ کو تو معلوم ہے یہاں میں زیادہ دیر رک بھی نہیں سکتا...... پولیس کو رپورٹ بھی کرنی ہوگی...... آپ کو زحمت تو ہوگی اگر آپ......''

''ارے کمال الدین صاحب زحمت کیسی...... آپ کا بہت شکریہ۔ آپ کو تکلیف ہوگی۔ میں خود آ جاتا ہوں...... آپ ذرا ایڈریس سمجھا دیجئے۔''

اقبال نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

سلمٰی کے خط نے اس کا اشتیاق حد درجہ بڑھا دیا تھا وہ تو اڑ کر کمال الدین تک پہنچنا چاہتا تھا۔ کمال الدین نے اسے ماڈرن آبادی کی ایک کوٹھی کا ایڈریس سمجھایا اور فون بند کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی اقبال دفتر سے چھٹی لے کر اپنی محبوبہ کا خط اور تحائف وصول کرنے جا رہا تھا۔

اپنی موٹر سائیکل وہ چلا کر نہیں اڑا کر یہاں تک لایا تھا۔ یہ شہر کی نئی اور ماڈرن آبادی تھی جس کے ایک بلاک کے کونے میں وہ خوبصورت بنگلہ موجود تھا۔ بنگلے کا نمبر پڑھ کر اس نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک نوجوان کی شکل دکھائی دی۔

"میرا نام اقبال ہے۔"

اس نے کہا۔

"تشریف لائیے آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔"

آنے والے نے کہا۔

اقبال موٹر سائیکل سمیت اندر چلا آیا۔

موٹر سائیکل اس نے ایک طرف کھڑی کر دی اور اسی نوجوان کے تعاقب میں پورچ سے گزر کر برآمدے کی طرف جانے لگا۔

برآمدے تک پہنچنے کے بعد اسے یوں لگا جیسے وہ کسی گھر کے بجائے فوج کے دفتر میں آ گیا ہو۔ اب تک اسے دو تین چہرے جو یہاں دکھائی دیئے وہ کچھ ایسے ہی تھے...... چونکہ اس کا واسطہ فوجیوں سے اپنے کام کے سلسلے میں رہتا تھا اس لئے اس نے پہچاننے میں غلطی نہیں کی تھی۔

اقبال کو ایک آرام دہ کمرے میں بٹھا کر وہ نوجوان باہر چلا گیا۔

اور......

اقبال کو ایک بے کلی سی لگ گئی۔

وہ کچھ پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ کسی غلط ایڈریس پر آ گیا ہو۔

ابھی وہ اس شش و پنج میں گرفتار تھا کہ سامنے کا دروازہ کھلا اور تین نوجوان اندر داخل ہوئے۔

ان میں ایک جوان کا انچارج دکھائی دے رہا تھا اس نے اقبال کی طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"میرا نام میجر کمال الدین ہے۔"

میجر خان نے اپنا غلط تعارف کروایا۔

اقبال نے کسی معمول کی طرح اس سے ہاتھ ملایا۔ گھبراہٹ بڑھنے لگی تھی۔ باقی دونوں جوان کمرے کے دوسرے کونے پر موجود کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"اقبال صاحب میں آپ کو اس طرح بلانے پر معذرت خواہ ہوں لیکن دوسرا کوئی

بھی طریقہ ٹھیک نہیں تھا۔ آپ عزت دار آدمی ہیں ہم نہیں چاہتے کہ اس واقعہ کی کسی کو کانوں کان خبر ہو کہ آپ کو انٹیلی جنس والوں نے طلب کیا تھا۔"

اس نے اقبال کی تشویش مزید بڑھا دی۔

"جی مم میں سمجھا نہیں۔"

اقبال گڑبڑا گیا تھا۔

یہ تو فوجی انٹیلی جنس کے لوگ تھے۔

انہوں نے اسے کیوں طلب کر لیا؟ اور اس طرح دھوکے سے؟

وہ بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

"آپ اطمینان سے بیٹھ جائیں۔ خدانخواستہ ہم نے آپ کو اغوا نہیں کیا نہ ہی گرفتار کیا ہے۔ آپ سے ایک معاملے پر مدد درکار ہے اور ہمارے اگلے تعلقات کی بنیاد اس کے بعد ہی پڑے گی۔"

میجر خان نے چاہا وہ نارمل ہو جائے۔

"دیکھئے آپ کو شاید کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔"

اقبال نے سنبھل کر کہا۔

"نہیں میرے عزیز...... ہم بالکل کلیئر Clear ہیں۔ کوئی غلط فہمی نہیں نہ ہی ہم نے تمہارے متعلق کوئی غلط رائے قائم کی ہے۔ البتہ جب تم تمام معاملات سمجھ جاؤ گے تو شاید تمہاری خوش فہمی بھی دور ہو جائے۔"

میجر خان نے کہا۔

اس کا انداز گفتگو بڑا شریفانہ تھا جس نے اقبال کو نارمل تو کر دیا۔

لیکن...... اسے ابھی تک کسی بات کی سمجھ نہیں آئی تھی۔

"چائے لے آؤ۔"

میجر خان نے اپنے ساتھ آنے والے جوان سے کہا اور وہ دونوں باہر چلے گئے۔

ان کے جاتے ہی میجر خان نے اس کمرے کی ایک الماری سے ایک لفافہ نکالا اور اس میں سے انور کی تصویر نکال کر سامنے رکھ دی۔

"اسے پہچانتے ہو؟"

اس نے پوچھا۔

"جی ہاں یہ میرا کزن انور ہے۔"

اس نے جواب دیا۔

"ہاں تمہارے لئے یہ صرف تمہارا کزن ہی تھا لیکن اس کی اصلیت کچھ اور ہے......"

یہ کہہ کر میجر خان نے اسے ایک لمبی کہانی سنا دی۔

اس دوران چائے آ گئی تھی۔

جیسے جیسے میجر خان بات کر رہا تھا اقبال کا دل بیٹھنے لگا تھا۔

یہ انکشاف کہ انور بھارتی انٹیلی جنس کا تربیت یافتہ تخریب کار ہے۔ جس نے شرکت ہسپتال میں بم دھماکہ کیا تھا۔

اس کے اعصاب پر بم بن کر پھٹا......!!

اس کا دل ڈوبنے لگا تھا۔

"میں جانتا ہوں مسٹر اقبال کہ تم اس معاملے میں بالکل بے قصور ہو...... اگر تم اس میں ذرا سے بھی ملوث ہوتے تو ہم تمہیں اس طرح یہاں نہ بلاتے...... میری درخواست ہے کہ تم بالکل نارمل ہو جاؤ...... اپنے ذہن کو حاضر کرو اور میرے سوالات کے بالکل صحیح صحیح جوابات دینا...... تم بھی ہماری طرح پاکستانی ہو...... امید ہے اس معاملے میں ہم سے تعاون کرو گے۔"

میجر خان نے کہا۔

"سر! آپ مطمئن رہئے۔ میرا پہلا رشتہ اپنے دین اور ملک سے ہے اور میں اس پر کچھ بھی قربان کر سکتا ہوں...... کاش کاش مجھے اس حقیقت کا علم ہوتا۔ میں اس کا خون پی جاتا...... اس ظالم نے......"

اقبال کو واقعی طیش آنے لگا تھا۔

اسے اب سمجھ آئی کہ انور کی پر اسرار نقل و حرکت اور اکیلے گھر سے غائب رہنے میں کیا حکمت تھی؟

"شاباش مجھے تم سے یہی توقع تھی...... اب مجھے اس کے متعلق جو کچھ تم جانتے ہو بلا کم و کاست بغیر کسی ڈر خوف اور جھجک کے اپنا بھائی سمجھ کر بتاؤ...... ممکن ہے تمہاری بتائی ہوئی کسی بات سے ہم مجرم کو پکڑ سکیں۔"

اس نے اقبال سے کہا۔

اقبال نے چائے کا گھونٹ حلق میں انڈیلا اور انور کے لئے اپنے دل میں پیدا ہونے والے نفرت اور حقارت کے جذبات کے ساتھ میجر خان سے مخاطب ہوا۔

"پوچھئے میں...... میں اپنے علم کی حد تک ہر بات بتاؤں گا۔"

میجر خان نے اس سے پہلا سوال ہی انور کی آمد سے متعلق کیا تھا اور اس نے بغیر کوئی لگی لپٹی رکھی اسے بتا دیا تھا کہ کس طرح اس نے اپنے ایک جاننے والے کی مدد سے ان لوگوں کو کسٹم کے بغیر نکال لیا تھا۔

اس کے بعد اس نے انور کے گھر سے اکثر غائب رہنے سے روانگی تک سارے واقعات ایک ایک کر کے بیان کر دیئے۔ جس میں انور کی وہ گفتگو بھی شامل تھی جو اس نے اقبال سے اس کی نوکری سے متعلق کی تھی۔

تین گھنٹے تک وہ خندہ پیشانی سے میجر خان کے سوالات کے تفصیلی جواب دیتا رہا۔

اس دوران میجر خان نے انور کے مختصر قیام کی ایک ایک تفصیل جان لی تھی...... اور اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ اس وحشی نے اپنے قریبی رشتہ داروں کے گھر کو بطور "سیف ہاؤس" استعمال کیا ہے۔

دونوں نے کھانا اکٹھے کھایا تھا۔

اقبال کے دل پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔

اور......

میجر خان کو اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ نوجوان ضرورت سے زیادہ ہی محب وطن ہے اگر اس کا بس چلتا تو وہ انور کو دہلی جا کر قتل کر آتا۔

"دیکھو برادر...... اس بات میں کوئی شک نہیں تم اس کی اصلیت سے بالکل لاعلم تھے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کا قیام یہاں رہا...... مجھے تم سے کچھ گلہ نہیں۔ اگر میں بھی تمہاری جگہ ہوتا تو یہی کرتا اب ہم نے اس درندے کو قابو کرنا ہے جس میں تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی۔"

میجر خان نے کہا۔

"میں دل و جان سے حاضر ہوں۔ آپ کہیں تو......"

''نہیں اس کی ضرورت نہیں...... تم بہرحال ایک مسلمان پاکستانی ہو اور تمہاری ہونے والی بیوی بھی اس کی ذمہ دار نہیں...... ہم یہ بھی نہیں چاہیں گے کہ تم خواہ مخواہ کسی مصیبت میں پڑ جاؤ۔ ایک پلان ہے میرے پاس اگر اس پر عمل ہو جائے تو مجھے امید ہے وہ ضرور قابو آجائے گا۔''

میجر خان نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

اور......

اس نے اقبال کو سمجھانا شروع کیا۔

''میں حاضر ہوں سر......! جیسے آپ کہیں......''

ساری بات سمجھنے کے بعد اقبال نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور اب وہ منصوبے کے پہلے مرحلے پر عمل کرنے جا رہا تھا۔

میجر خان نے اس کے مکمل حالات جان لئے تھے۔

اس کے جذبات کا اندازہ لگا لیا تھا۔

اور...... سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اقبال کی حب الوطنی کا قائل ہو چکا تھا۔ اب وہ اقبال کی مدد سے انور پر ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا۔ اس نے اندھیرے میں تیر چلانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اگر نشانے پر لگ جاتا تو کامیابی حاصل ہو جاتی۔ بصورت دیگر ان کا کوئی نقصان نہیں ہو رہا تھا۔ حالات جوں کے توں ہی چل رہے تھے۔

اس نے انور سے وہ فون نمبر لے کر جہاں وہ اپنی خالہ سے بات کر سکتا تھا۔ اپنے پاس موجود انٹرنیشنل لائن کے ذریعے نمبر ملا کر اسے ایک خاص ہدایت کے ساتھ فون پکڑا دیا تھا۔

یہ خالہ ثریا کے گھر سے منسلک ایک پی پی نمبر تھا۔ یہ بھی مسلمان گھرانا تھا۔ انور نے فون ملانے پر خالہ ثریا کو بلانے کے لئے کہا اور دو منٹ بعد ہی دوسری طرف لائن پر سلمٰی موجود تھی...... جس نے اقبال سے کہا کہ گھر پر اس وقت کوئی اور نہیں ہے۔ اقبال نے میجر خان کی ہدایت کے مطابق نارمل لہجے میں پہلے اس کی خیریت معلوم کرنی چاہی۔

ابھی اس نے سلمٰی کا احوال ہی پوچھا تھا کہ اس نے رونا شروع کر دیا۔

''کیا بات ہے سلمٰی خیریت تو ہے ناں......''

اقبال پریشان ہو رہا تھا۔

''اقبال...... ہمیں انور نے برباد کر دیا۔ میں تم سے خود بات کرتی ہوں۔ یہ نمبر ٹھیک نہیں۔'' اس نے یہ بات بہت آہستگی سے کی تھی۔

دوسری طرف اس سے منسلک ایکسٹنشن فون کانوں سے لگائے میجر خان بھی اس فقرے سے چونک پڑا۔ اس کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔

اسے دال میں کالا دکھائی دے گیا تھا۔

دوسرے ہی لمحے اس نے ایک پرچی لکھ کر اقبال کے سامنے رکھ دی جس پر ہدایت درج تھی کہ سلمٰی سے اس نمبر پر فون کر کے ابھی تمہارے ساتھ بات کرنے کے لئے کہے۔

اور......

اس نے روتی ہوئی سلمٰی کو اس نمبر پر بات کرنے کے لئے کہا۔

سلمٰی نے اگلے آدھے گھنٹے میں فون کرنے کا وعدہ کیا کیونکہ وہ ایک پرائیویٹ ''پی سی او'' سے بات کرنا چاہتی تھی۔

ایسے غیر قانونی پی سی او پاکستان کی طرح بھارت کے بڑے بڑے شہروں میں بھی قائم تھے اور سلمٰی کو علم تھا کہ اس طرح سے غیر قانونی پی سی او سے کروائی جانے والی کالز کا ریکارڈ نہیں رکھا جاتا۔ فی الوقت اسے بھی ضمانت درکار تھی کہ وہ جو بات اقبال کو بتانے جا رہی ہے اس سے صرف اقبال ہی آگاہ ہو۔

ان کے ہمسائے میں میر صاحب کا گھر تھا اور شک تھا کہ پاکستان سے فون آنے کی اطلاع پر وہ متجسس ہو کر اس کی کوئی بات سننے کی کوشش نہ کریں۔

گھر میں وہ واقعی اکیلی تھی۔

لیکن......

اس کے گھر میں داخل ہونے کے چند منٹ بعد ہی اس کی والدہ جو نزدیکی بازار سے سودا سلف خریدنے گئی تھی واپس لوٹ آئیں۔

اس نے اقبال کی ہدایت پر والدہ کو صرف اتنا بتایا کہ اقبال نے پاکستان سے فون کیا تھا ابھی وہ بات کرنا ہی چاہتا تھا کہ لائن کٹ گئی شاید رات کو دوبارہ اس کا فون آئے اس لئے وہ گھر پر ہی موجود رہے۔ خالہ ثریا نے لائن کٹ جانے پر کف افسوس ملا اور اسے کہا کہ وہ اس کے ابا کو یہاں سے خود فون کر کے اقبال اور اس کی ماں کی خیریت جاننے کے لئے کہے گی۔

سلمٰی اپنے امتحانات کی تیاری کر رہی تھی اس نے اپنی مارچ سے ایک سہیلی سے نوٹس

لانے کے لئے کہا او باہر نکل گئی۔

اگلے دس منٹ بعد وہ اس مخصوص پی سی او پر پہنچ گئی تھی جہاں سے اکثر غیر ملکی کالیں کم ریٹس پر کروائی جاتی تھیں اور گفتگو کرنے والوں کی پرائیویسی کا بھی مکمل اہتمام تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اقبال کی طرف سے ملنے والے نمبر پر اس سے بات کر رہی تھی۔

میجر خان نے اقبال کو حوصلہ دیا تھا اور اسے ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی کروائی تھی۔ انور کے حوالے سے اس کی بہن نے جو بات کی تھی اس نے میجر خان کو چونکا دیا تھا اور وہ اندازہ کرسکتا تھا کہ یہ بات کیا ہوسکتی ہے۔

اس نے چند منٹ بعد ہی مطلوبہ لائن والا فون اقبال کے سامنے رکھ دیا تھا اور اب وہ بے چینی سے دوسری طرف سے فون کا انتظار کر رہے تھے۔ دونوں طرف سے کی جانے والی گفتگو سننے اور دورانِ گفتگو اقبال کی طرف سے اختیار کی جانے والی حکمت عملی سے متعلق ہدایات دینے کا بھی مکمل بندوبست کرلیا تھا۔

اقبال کی بے چینی اور اضطراب بڑھتا چلا جارہا تھا جب اس فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ پہلی گھنٹی نے اسے احساس دلا دیا تھا کہ یہ غیر ملکی کال ہے۔

خان کے اشارے پر فون اس نے خود ہی اٹھایا تھا۔

دوسری طرف سلمٰی لائن پر تھی۔

"سلمٰی نارمل رہو...... گھبراؤ نہیں اور مجھے سب کچھ بتا دو...... یہاں میرے علاوہ اور کوئی نہیں۔ تم بات کرو۔ وقت کم ہوتا ہے۔"

اس نے سلمٰی سے کہا جس کی آواز ابھی سے بھرا گئی تھی۔

"اقبال ہم لٹ گئے۔ انور نے ہمیں برباد کردیا۔ وہ شیطان ہے شیطان اس نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔"

یہ کہہ کر اس نے رونا شروع کردیا۔ پھر اقبال کی منت سماجت پر نارمل ہونے کے بعد اس نے پہلی بات کہہ کر اقبال کے اعصاب پر بم چلا دیا۔

"اقبال ہمیں علم نہیں وہ موذی یہاں کی انٹیلی جنس کا ملازم ہے اور اس نے تمہارے ہاں دوران قیام ہسپتال میں بم دھماکہ کیا تھا۔"

اقبال کو اپنے سر پر موجود چھت گھومتی دکھائی دی۔

میجر خان چونک پڑا

اس نے اقبال کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے نارمل کرنے اور زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لئے کہا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو سلمٰی؟"

اس نے کہا۔

اور......

جواب میں سلمٰی نے مختصراً اپنے گھر میں دیوالی پر ہونے والی دعوت کا قصہ سنا دیا اور بتایا کہ اس نے ابھی تک اس بات کا ذکر اس کے علاوہ اور کسی سے نہیں کیا اس کے ساتھ ہی اس نے اقبال کو دہلی آنے سے روک دیا اور بتایا کہ وہ اب اسے بھی پھانسنے جا رہا ہے۔

میجر خان کی ہدایت پر اقبال نے سلمٰی سے کہا تھا کہ وہ بالکل نارمل رہے اور اپنے کسی عمل سے انور کو یہ احساس نہ ہونے دے کہ وہ اس کی اصلیت جان چکی ہے اس کے ساتھ ہی اس نے سلمٰی سے کوئی ایسا فون نمبر دینے کے لئے کہا تھا جس پر وہ اس کے ساتھ اطمینان سے بات کرسکے اس نے سلمٰی سے کہا کہ جس بات کا ذکر اس نے کیا ہے یہاں کے "ذمہ داروں" کو اس کا علم ہو چکا ہے اور اب مسلمان ہونے کے ناطے یہ ان کا فرض تھا کہ مجرم کو گرفتار کروائیں۔ اس نے سلمٰی سے کہا تھا کہ وہ اس کے والدین اور سلمٰی پر انشاء اللہ آنچ نہیں آنے دے گا بس ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ حوصلہ نہ ہارے اور خود کو بالکل نارمل رکھے۔

فون پر زیادہ گفتگو کرنا ٹھیک نہیں تھا۔

اس نے سلمٰی سے فون بند کرنے اور اس کے اگلے فون کا انتظار کرنے کے لئے کہا تھا۔

سلمٰی جس پرائیویٹ کال آفس سے فون کر رہی تھی اس کا مالک ایک بوڑھا اور ہمدرد سکھ تھا یہاں اکثر مسلمان لڑکے لڑکیاں مڈل ایسٹ اور پاکستان میں اپنے منگیتروں کو فون کرنے آیا کرتے تھے اور عموماً وہ رو کر ہی جاتے تھے۔

اسے ان بے چاروں سے بڑی ہمدردی تھی۔

سلمٰی خاصے فاصلے سے بات کر رہی تھی...... سردار جی نے ان لوگوں کی پرائیویسی کے احترام میں یہاں دو کیبن بنا رکھے تھے جن میں بند ہو کر وہ بات کیا کرتے تھے...... اسے سلمٰی کی آواز تو سنائی نہیں دے رہی تھی۔

لیکن......

اس کے آنسو ضرور دکھائی دے رہے تھے۔

جب وہ بل ادا کرنے آئی تو بھی اس کی آنکھوں میں نمی موجود تھی۔ سردار جی کو بے چاروں پر بہت رحم آ رہا تھا۔

"کتنے پیسے ہوئے۔"

سلمٰی نے اپنے چھوٹے سے بٹوے میں ہاتھ ڈال کر پوچھا۔

"بیٹی تو جتنے جی چاہے دے دے...... کتنے پیسے ہیں تیرے پاس۔"

سردار صاحب کا دل بھر آیا۔

اسے سلمٰی بالکل اپنی بیٹی کی طرح مظلوم دکھائی دے رہی تھی جس کا منگیتر اسے چھوڑ کر امریکہ بھاگ گیا تھا۔

"انکل آپ کی مہربانی پھر بھی بتا دیجئے کتنے منٹ ہوئے۔"

سلمٰی نے قمیص کی آستین سے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے پوچھا۔

"اچھا بیٹی تم دو سو روپے دے دو۔"

سردار صاحب نے کہا حالانکہ بل اس سے دوگنا بن چکا تھا۔

سلمٰی نے سو سو کے دو نوٹ دیئے اور جس طرح خاموشی سے آئی تھی اسی طرح گھر واپس لوٹ گئی۔ اس نے سردار کا فون نمبر مستقبل کے لئے محفوظ کر لیا تھا۔

سلمٰی گھر پہنچی تو اس کی والدہ ہمسائے کے گھر میں اقبال کا فون سننے کے لئے گئی تھی......!!

یہ فون اقبال نے میجر خان کی ہدایت پر کیا تھا اب وہ بڑی ہوشیاری اور سمجھداری سے معاملات کو کنٹرول کر رہا تھا۔

سلمٰی کے گھر پہنچنے کے قریباً پانچ منٹ بعد اس کی والدہ وہاں آئیں اور آتے ہی انہوں نے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔

اس اثنا میں خان صاحب بھی گھر پہنچ گئے تھے دونوں باپ بیٹی کو اپنی بیوی اور ماں کی فکر دامن گیر ہوئی۔

"کیا بات ہے ثریا...... خیریت تو ہے۔"

خان صاحب گھبرا گئے۔

اور......

جواب میں روتے ہوئے ثریا نے جو کچھ کہا سلمٰی کا دل گواہی دے رہا تھا وہ صحیح نہیں اسے فی الحال اسکو صحیح تسلیم کرنا تھا۔

اس کی ماں نے روتے ہوئے بتایا تھا کہ جنت بی بی کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور اقبال نے فوراً سلمٰی اور انور کو پاکستان بھیجنے کے لئے کہا ہے۔

جنت بی نے کی خواہش ظاہر کی ہے کہ کم از کم انور ضرور اسے مل جائے جانے زندگی اب دوبارہ ملنے کی مہلت دے یا نہ دے۔

خان صاحب کف افسوس ملنے لگے۔

لیکن ثریا یہ ممکن کیسے ہوگا۔ اگر انور تیار بھی ہو جائے تو ویزے کا مسئلہ ہے۔"

خان صاحب نے دریافت کیا۔

اقبال نے بتایا کہ اس نے بندوبست کر لیا ہے۔ یہاں پاکستان ہائی کمیشن میں ایک بندہ ان کے جاننے والا ہے جس کی مدد سے وہ ویزہ دلا دے گا۔

دونوں باپ بیٹی ثریا کو نارمل کرتے رہے۔ شام کو انور بھی آ گیا۔ جس نے اس خبر کا کوئی خاص اثر نہیں لیا تھا۔

لیکن......

ان سے کہا تھا کہ وہ اپنے دفتر چھٹی کی بات کرے گا۔

✪......✪......✪

اور......

اگلے روز اس نے ورما ملک کے سامنے ساری بات رکھ دی۔

"ہوں ں ں......"

ورما ملک کسی سوچ میں پڑ گیا۔

"کہیں یہ ٹریپ تو نہیں......"

اس نے دل ہی دل میں سوچا پھر خود ہی دل ہی دل میں مسکرا بھی دیا۔

اول تو یہ ٹریپ Trape نہیں تھا۔ اگر ایسا ہو بھی تو کیا ہے۔ انور ان کا رشتہ دار نہیں تھا۔ وہ بھارتی شہری ضرور تھا لیکن مسلمان تھا...... ان کی طرف سے جہنم میں جائے۔ اگر پکڑا گیا تو کیا۔ اس جیسے درجنوں اور گدھے مل سکتے تھے۔

بصورت دیگر اس سیف ہاؤس میں بیٹھ کر وہ ایک دو اور کارنامے بھی آسانی سے کر

سکتا تھا جن کی انہیں بہت ضرورت تھی کیونکہ کشمیر میں مجاہدین نے انہیں ناکوں چنے چبا دیئے تھے اور اب وہ اپنی لڑائی مقبوضہ کشمیر سے باہر بھارت کے دوسرے بڑے بڑے شہروں تک پھیلا رہے تھے۔ راجدھانی میں ہونے والے یکے بعد دیگرے دو بم دھماکے اسی سلسلے کی کڑی تھے۔

"تمہارے پاس اس کا کوئی فون نمبر ہے۔"

ورما ملک نے ایک نتیجے پر پہنچ کر کہا۔

"ہاں ایک ہے تو سہی...... لیکن اس کے دفتر کا نمبر ہے شاید...... گھر پر لکھا ہوگا۔"

انور نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے وہ نمبر لو اس سے بات کر کے دیکھتے ہیں۔"

ورما ملک نے ہدایت کی۔

تھوڑی دیر بعد اقبال کے دفتر کا نمبر وہاں پہنچ گیا تھا اور اب انور انٹرنیشنل ڈائلنگ پر نمبر ملا کر اقبال سے بات کر رہا تھا۔

فون حسب معمول اقبال کے دفتر کے آپریٹر نے ریسیو کیا اور اسے اطلاع دی کہ دہلی سے اس کے کزن کی کال ہے۔

اقبال دفتر کے ایک کونے میں دھرے ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھا اور آپریٹر سے وہاں فون کے لئے کہا۔

اس کی اور میجر خان کی توقعات کے عین مطابق فون آیا تھا اور اس نے اب میجر خان کی ہدایت پر عمل کرنا تھا۔

فون اٹھا کر اس نے بدلی ہوئی آواز میں "ہیلو" کہا اور اپنا تعارف اقبال کے ہمکار کی حیثیت سے کرواتے ہوئے انور سے جو زندگی میں پہلی مرتبہ فون پر اس سے بات کر رہا تھا کہا کہ اقبال کی والدہ کی حالت بہت خراب ہے وہ آج کل دوسرے نمبر پر ہوتے ہیں جن کے ساتھ ہی اس نے میجر خان والا نمبر لکھا دیا اور انور سے کہا کہ اگر وہ چاہے تو آدھ گھنٹہ بعد اس نمبر پر بات کرے کیونکہ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی دفتر سے اس پرائیویٹ ہسپتال کی طرف گیا ہے جس کا نمبر اسے دیا گیا ہے جہاں پہنچنے میں اسے پندرہ بیس منٹ لگ جائیں گے بصورت دیگر وہ اس سے کل صبح بات کر لے وہ لوگ اقبال کو یہاں بلا لیں گے۔

"نہیں نہیں...... خالہ کی طبیعت خراب ہے کہیں دیر نہ ہو جائے میں اس سے اسی نمبر پر بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں آپ نمبر لکھوایئے......"

انور نے دوسری طرف سے ورما ملک کی ہدایت ملنے پر کہا۔

نمبر لکھ کر اس نے شکریہ ادا کرنے کے بعد فون کاٹ دیا۔

دوسرے ہی لمحے اقبال میجر خان سے اس کے موبائل فون پر بات کر رہا تھا جس نے اسے شاباش دے کر فوراً اس کوٹھی پر پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔

اور......

اگلے پندرہ منٹ کے بعد وہ اس ٹیلی فون نمبر کے سامنے بیٹھا تھا جو اس نے انور کو لکھایا تھا۔

"شاباش......"

میجر خان نے اس کا کندھا تھپتھپا کر اسے داد دی۔

اقبال توقعات سے بڑھ کر تعاون کر رہا تھا۔

۞......۞......۞

قریباً پون گھنٹہ بعد فون کی گھنٹی بجی یہ کال دہلی سے آئی تھی۔

دوسری طرف جیسے ہی لائن ملی انور اور ورما ملک کے کانوں میں ایک سریلی آواز گونجی۔

"خان ہسپتال"

ورما ملک نے اثبات میں سر ہلایا۔

"جی ہمیں اقبال صاحب سے بات کرنی ہے۔"

ادھر سے کہا گیا۔

"وہ جن کی والدہ کو ہارٹ کی پرابلم ہے۔"

لڑکی نے استفسار کیا۔

"جی ہاں۔"

دوسری طرف سے انور سے کہا۔

"ابھی لیجئے...... اوہ بے چاری غریب عورت بہت خراب حالت ہے، اس کی...... لیکن یہ لڑکا بہت ہمت والا ہے...... بہت ہمت والا...... ہولڈ آن پلیز...... "hold On Please"

اور دوسرے ہی لمحے "کال" اقبال کو منتقل ہو چکی تھی۔

اس نے انور کا نام سنتے ہی بڑی گھبراہٹ میں والدہ کی بیماری کی اطلاع دے کر

ان کی خواہش سے آگاہ کیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے اقبال بھائی لیکن یہاں ویزے کا مسئلہ بنے گا۔"

انور نے ورما ملک کی ہدایت کے مطابق کہا۔

"میں نے بندوبست کرلیا ہے...... ہماری کمپنی کے ایم ڈی صاحب کے بھائی وزارت خارجہ میں سیکرٹری ہیں۔ وہ فوراً وہاں ہائی کمیشن میں بندوبست کروا دیں گے...... انہوں نے وعدہ کیا ہے۔ اللہ ان کا بھلا کرے ہماری بہت مدد کر رہے ہیں۔"

اقبال نے فوراً ہی کہا۔

دوسری طرف چند ثانیے خاموشی رہی۔

"ٹھیک ہے جتنی جلدی بندوبست ہو میں آتا ہوں لیکن سلمٰی کا امتحان چل رہا ہے۔ وہ شاید نہ آسکے۔"

اس کے جواب نے اقبال کے چہرے پر ہوائیاں اڑا دی تھیں۔

لیکن......

اس نے خود کو سنبھالے رکھا۔

میجر خان نے اپنے کانوں سے ہیڈ فون لگاتے ہوئے اس کے دونوں کندھے تھپتھپا کر اسے نارمل رہنے کے لئے کہا تھا۔

"اپنا پاسپورٹ نمبر لکھوا دو...... آج ہی ہم وہاں فیکس کروا دیں گے اور انشاء اللہ اگلے دو ایک روز میں تمہیں ویزہ مل جائے گا...... انور بھائی دیر نہ کرنا۔ اماں کی حالت ٹھیک نہیں ہے اور وہ بہت تقاضا کر رہی ہیں کہ تم لوگ آجاؤ ممکن ہے تمہارے آنے سے ان کی حالت سنبھل جائے۔"

اقبال نے کہا۔

"ٹھیک ہے...... اچھا لکھو نمبر...... اتفاق سے میری ڈائری میں لکھا ہے۔"

دوسری طرف سے کہا گیا۔

قریباً ایک منٹ کی تاخیر سے انور نے اپنا پاسپورٹ نمبر لکھوا دیا۔

"اچھا بھائی خالہ سے کہنا زیادہ فکر نہ کریں...... انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا تم جلدی پہنچو۔ میں آج ہی یہ نمبر فیکس کروا دوں گا۔ تم پرسوں درخواست دینا انشاء اللہ ویزہ لگ جائے گا۔"

اقبال نے کہا۔

"اچھا خدا حافظ...... خالہ سے سلام کہنا اور اپنا خیال رکھنا۔"

انور نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

"بڑا چلتا پرزہ لگتا ہے سالا بڑی واقفیت بنا رکھی ہے۔"

ورما ملک نے کال ختم ہونے پر کہا۔

"ملک صاحب ہم نے آپ کو معمولی کام کبھی دیا ہی نہیں...... ارے بڑے کام کا بندہ ہے اگر قابو آگیا تو آپ کو خوش کر دے گا۔"

انور نے بے غیرتی سے دانت نکالے۔

"قابو تو اسے آنا ہی ہوگا انور میاں...... ان سالے مسلوں کا علاج تو ہے ہمارے پاس۔"

ورما ملک نے قہقہہ لگایا اور انور نے اس سے زیادہ بے غیرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔

میجر خان کی کامیابی اور اقبال کا تعاون تھا جس نے ان لوگوں کو یقین دلا دیا کہ صورتحال بہتر ہے۔

"را" نے اس سنہرے موقعہ سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔

ان کی طرف سے بھاڑ میں جاتا انور اور اقبال اور اس کی خالہ۔

اقبال جیسا چلتا پرزہ ان کے ایجنٹ کا کور Cover بن رہا تھا جس کو "بے خبر Innocent" رکھ کر وہ بڑے کام لے سکتے تھے۔

وہ جانتے تھے کہ پہلے کی طرح وہ اپنے کزن کو سفارش کے ساتھ لئے اسٹیشن پر آئے گا اور اس کا سامان چیکنگ کے بغیر گزرے گا۔

اس مرتبہ وہ زیادہ اعتماد سے زیادہ "خطرناک مال" سمگل کر سکتے تھے۔

ورما ملک نے ہوشیار انٹیلی جنس آفیسر کی طرح انور کی بہن کو بہرحال یرغمال بنالیا تھا۔ اس نے اندازہ کرلیا تھا کہ اقبال اپنی منگیتر کا سچا عاشق ہے...... اور یہ "کمزوری" ان کے لئے بڑا انعام بن سکتی تھی۔

وہ ایک مرتبہ چکر دے کر اسے دلی بلا کر پھر اس کی منگیتر کو بطور "چارہ" استعمال کرسکتے تھے اور یہ "چارہ" ڈالنے کے لئے ان کے پاس انور جیسا بے غیرت اور نام نہاد

بھارتی مسلمان ایجنٹ موجود تھا۔

گھر آ کر جب انور نے بتایا کہ اس کی بات اقبال سے ہو گئی اور دفتر والے بھی چھٹی دینے پر رضامند ہو گئے ہیں تو گھر والوں کو حوصلہ ہوا۔

لیکن......

یہ جان کر سلمٰی کا دل بیٹھنے لگا کہ انور اکیلا جا رہا ہے۔

وہ جان چکی تھی کہ انور کو اقبال نے کیوں بلایا ہے اور اس کی گرفتاری کے بعد یہاں جو حشر ان کا بھارتی انٹیلی جنس والے کریں گے اس کا بھی اسے احساس تھا۔

اس کے دل میں انور کے لئے ہمدردی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو خود اپنے ہاتھوں سے اسے مار ڈالتی۔ انور کی شکل میں اب اسے ایسا بھیڑیا گھر میں چلتا پھرتا دکھائی دینے لگا تھا جو وقت آنے پر کسی کا بھی خون پی جائے۔

اسے صرف ایک خوف دامنگیر تھا کہ اگر انور پاکستان میں پکڑا گیا تو ان کے ساتھ بھارتی انٹیلی جنس کے لوگ کیا سلوک کریں گے۔

اس نے اگلے ہی روز اقبال کو فون کر کے اپنے خدشات سے آگاہ کرنے کا ارادہ کیا تھا اور وقت مقررہ پر ایک مرتبہ پھر اس سکھ کی دکان پر پہنچ گئی جس کے دل میں اس کے لئے پہلے ہی سے ہمدردی کے جذبات موجود تھے۔

اس نے اقبال کو اس نمبر پر ٹیلی فون کیا تھا جو اسے اقبال نے کچھ روز پہلے دیا تھا۔

فون کرنے پر دوسری طرف سے جس شخص نے فون اٹھایا اس نے اپنا نام عامر خان بتایا تھا۔

"میں دہلی سے بول رہی ہوں مجھے اقبال صاحب سے بات کرنی ہے۔"

اس نے کہا۔

"اوہ آپ سلمٰی بہن ہیں۔ فرمایئے میں سارا بندوبست کر رہا ہوں۔ اقبال بھائی بھی کسی کام سے گئے ہیں۔"

دوسری طرف سے بڑے احترام اور اپنائیت سے کہا گیا۔

"مجھے انہی سے بات کرنی ہے۔"

میجر خان جس نے فون ریسیو کیا تھا سمجھ گیا کہ وہ گھبراہٹ کا شکار ہے۔

"اچھا بہن جی آپ ٹھیک آدھ گھنٹہ بعد فون کریں میں انہیں یہیں لے آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا۔

وہ سلمٰی کی پریشانی کا اندازہ لگا سکتا تھا اور جانتا تھا کہ وہ سوائے اقبال کے اور کسی سے بات نہیں کرے گی۔

اگلے بیس منٹ میں اقبال اس فون کے سامنے بیٹھا تھا اور میجر خان اسے حوصلہ دے رہا تھا کہ وہ سلمٰی کا بال بھی بیکا نہیں ہونے دیں گے۔

اس نے سلمٰی کا عندیہ جان کر اقبال کو سمجھا دیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ ٹھیک آدھ گھنٹہ بعد سلمٰی کا فون آ گیا۔

اس نے وہی خوف ظاہر کیا تھا۔

"سلمٰی میری بات بہت دھیان سے سننا اور اس پر ایسے ہی عمل کرنا۔"

اس نے میجر خان کا بتایا ہوا سارا منصوبہ اسے سمجھا کر دہرانے کے لئے کہا اور سلمٰی نے اس پر حرف بحرف عمل کرنے کی ہامی بھر لی۔

اقبال سے فون پر بات کرنے کے بعد وہ بڑی مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔

ورما ملک نے نوٹوں کے دو بنڈل اس کے سامنے رکھے ہوئے تھے۔

"یہ تمہارا ایڈوانس انعام ہے...... اس مرتبہ کامیابی کی صورت میں تمہیں دو لاکھ روپے کیش باقی سب کچھ کے علاوہ ملیں گے۔"

اس نے اپنے سامنے بیٹھے انور سے کہا۔

"ملک صاحب آپ مال تیار رکھیں۔ ہمیں دولت کا کم اور دوسرا شوق زیادہ ہے۔"

اس نے وہسکی کا جام اپنے اور ورما ملک کے لئے تیار کرتے ہوئے بے حیائی کا مظاہرہ کیا۔

"ارے انور میاں جس مال پر ہاتھ رکھو تمہارے بستر پر پہنچ جائے گی...... تم کام کرتے رہو باقی مجھ پر چھوڑ دو...... رات والا مال کیسا رہا......"

اس نے قہقہہ لگایا۔

"ایک دم شاندار...... بس ایسی پٹاخہ لڑکیاں اپن کو بڑی پسند ہیں۔"

اس نے اپنی زبان ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے کہا۔

ورما ملک دل ہی دل میں پھولوں نہیں سما رہا تھا۔

اس نے انور کو مکمل بے غیرت بنالیا تھا۔

وہ صرف نام کا مسلمان رہ گیا تھا...... وہ بھی اپنے گھر کی حد تک!!

ان لوگوں کے ساتھ تو وہ کبھی کبھی مندر میں پوجا پر بھی جانے لگا تھا اور اکثر شراب کے نشے میں خصوصاً وہ ''را'' کی طرف سے سپلائی کی جانے والی لڑکیوں کے سامنے اپنا مسلمان نام ہونے پر شرمندگی کا اظہار کیا کرتا تھا۔

ورما ملک نے اس مرتبہ اسے پاکستان میں ایک اور ''سورس'' کا ایڈریس دے کر اس سے رابطہ کرنے اور ایئر پورٹ پر دھماکہ کرنے کے لئے کہا تھا۔

اس نے انور سے کہا تھا کہ وہ واپسی پر کسی بھی طرح اقبال کو ورغلا کر اپنے ساتھ ہی لیتا آئے۔ جیسے ہی اس کا سگنل ملے گا اقبال کے لئے بھارتی ہائی کمیشن میں ویزے کا بندوبست ہو جائے گا......!

اقبال نے ان سے حاصل کردہ رقم اپنے پرسنل اکاؤنٹ میں جمع کروا دی تھی جہاں پہلے ہی اس کی خاصی رقم جمع تھی اس نے زیادہ سے زیادہ پیسے جمع کر کے مستقبل قریب میں والدین کو چھٹی کروا کر کسی ہندو ناری سے بیاہ رچانے اور الگ زندگی گزارنے کا منصوبہ بنالیا تھا۔

اس کے نزدیک زندگی عیش و عیاشی سے گزارنا ہی سب سے بہترین مذہب تھا اور وہ اس مذہب کا پیروکار تھا۔

یوں بھی اقبال کو ''را'' کے پنجے میں پھانسنے کے بعد اس کا اپنا گھر والوں سے تعلق رکھنا ٹھیک نہیں تھا۔

اقبال نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا۔

تیسرے روز جب اس نے پاکستان ہائی کمیشن کے سامنے لگی طویل قطار میں سب سے آگے جگہ حاصل کی اور اپنا پاسپورٹ بمعہ ویزہ کی درخواست کے اندر دیا تو اسے دوپہر کے بعد ہی ویزہ مل گیا۔

ورما ملک نے اس کے سامان کی خصوصی پیکنگ کروا دی تھی اور بڑے سے اٹیچی کیس میں اس طرح متعلقہ سامان پیک کر دیا تھا کہ بادی النظر میں تلاشی ہونے پر بھی دکھائی نہ دے۔

یہ چھوٹے چھوٹے ریموٹ تھے جس سے انتہائی تباہ کن بم تیار کیا جاسکتا تھا۔

مقامی ''سورس'' کی شناخت اور ملنے کا پروگرام اسے دے دیا گیا تھا اور اگلے روز ہی جانے والی

ٹرین میں اس کی سیٹ بھی موجود تھی۔

اپنی دانست میں ورما ملک نے اسے مکمل تیاری کے ساتھ روانہ کر دیا تھا اور اب وہ لوگ آپس میں انور کی فتح کا جام تجویز کر رہے تھے۔

اس مرتبہ ورما ملک نے شکلا سے بطور خاص پارٹی لی تھی اور خود انہیں انور کی واپسی پر ''پارٹی'' دینے کا وعدہ کیا تھا۔

انور کو گھر سے روانگی پر اس کی ماں نے اپنی بہن اور بھانجے کے لئے جو سامان دیا تھا اس میں سے آدھے سے زیادہ اس نے راستے ہی میں پھینک دیا تھا۔

اس کی طرف سے جہنم میں جاتی جنت بی بی اور اقبال......

اسے چاروں طرف صرف ایک ہی شکل دکھائی دے رہی تھی۔

یہ تھی گائیتری...... ماڈل اور سٹار گائیتری...... جواب میں اس کے لئے ''را'' نے میدان میں اتاری تھی۔

چوہدری اختر کے بعد اب وہ انور کی داشتہ تھی......!! اس کے ساتھ چند گھنٹے گزارنے کے بعد ہی انور کو احساس ہونے لگا تھا کہ چوہدری اختر کی جگہ اگر کوئی پنڈت مولوی بھی ہوتا تو اس ناگن کے ڈنگ سے بچ نہیں سکتا تھا۔

فرار

ایک مرتبہ پھر انور سمجھوتہ ایکسپریس کے ذریعے پاکستانی سرحدوں کی طرف عازم سفر تھا۔ اسے تسلی تھی کہ پہلے کی طرح اس مرتبہ پھر ریلوے سٹیشن پر اقبال اس کے استقبال کے لئے موجود ہوگا۔ اس کا کزن تھا بڑا ہوشیار اور کام کا آدمی اس نے جس طرح انور کو ویزہ دلایا تھا اور پہلی مرتبہ جس طرح اس نے بغیر تلاشی کے انہیں کسٹم سے نکالا تھا وہ کوئی معمولی کام نہیں تھے۔

آج بھی اسے یہی امید تھی کہ کوئی اس کے سامان کو چھونے کی بھی زحمت نہیں کرے گا۔ اس کے باوجود اس نے سامان بڑے حساب سے چھپا کر رکھا تھا اور خاص تلاشی لینے پر یہ دکھائی دے سکتا تھا۔

خالہ جنت کی بیماری کا تو بہانہ تھا۔

وہ کب اس کی تیمارداری کے لئے آنے والا تھا۔

اس کی طرف سے وہ بڑھیا کل کے بجائے آج مر جاتی۔

وہ ان رشتوں سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

اس کے نزدیک صرف ایک ہی رشتہ باقی رہ گیا تھا۔ حرص و ہوس کا رشتہ جو ''را'' اور اس کے درمیان روز بروز مضبوط تر ہوتا جا رہا تھا کیونکہ فی الوقت ''را'' کو اس کی ضرورت تھی۔

اور......

اپنی ضرورت کی وہ ہر قیمت ادا کرنے کے لئے تیار تھے۔

اس نے ورما ملک کو اقبال کی صورت میں جو امید دلائی تھی اس کے بعد سے تو وہ ''را'' کا کچھ زیادہ ہی مقرب بن گیا تھا۔

اقبال کے گھر کی صورت میں اپنی ایک محفوظ ترین ''سیف ہاؤس'' میں آ گیا تھا۔

اس بے غیرت نے ان لوگوں سے کہا تھا کہ اس نے اپنی بہن کا رشتہ بھی اقبال سے اس لئے

منظور کیا تھا کہ اسے قابو کر کے اپنے مالکان کے سامنے پیش کر سکے۔

ٹرین پاکستانی سرحد میں داخل ہو چکی تھی اور انور کی آنکھوں کے سامنے ان نوٹوں کی گڈیاں لہرا رہی تھیں جو اسے انعام میں ملنے والے تھے۔

گائتری دکھائی دے رہی تھی جس کے جسم پر اسے مکمل تصرف حاصل تھا۔

اپنا سنہرا مستقبل دکھائی دے رہا تھا جو بھارتی بنکوں میں اس کے اکاؤنٹس کی صورت روز بروز محفوظ سے محفوظ تر ہوتا جا رہا تھا۔

گو کہ ورما ملک نے اسے کہا تھا کہ ایسے پانچ چھ کارناموں کے بعد اسے مستقل بھارت میں ڈیوٹی دے دی جائے گی۔

لیکن......

ورما ملک کی یہ بات اس کے دل کو نہیں لگی تھی۔

اس طرح ہر دوسرے تیسرے ماہ وہ لاکھوں روپے حاصل کرنے سے محروم ہو سکتا تھا۔ اسے خالی تنخواہ پر گزارہ منظور نہیں تھا۔

اگر یہی کچھ کرنا ہوتا تو وہ اپنے کسی محکمے ہی میں کلرکی وغیرہ کر سکتا تھا۔ خان صاحب نے اپنے دفتر میں خاصا اثر و رسوخ بنا رکھا تھا۔

گاڑی اب سٹیشن کی حدود میں داخل ہو رہی تھی۔

اور......

وہ آنے والی کامیابیوں کے نشے سے سرشار اپنی سیٹ سے ٹیک لگائے گائتری کے شباب اور شراب کی خماریوں میں گم تھا۔

پلیٹ فارم پر گاڑی رکی تو معمول کے مطابق اس کے ڈبے پر بھی قلیوں نے ہلہ بول دیا۔

''باؤ جی کوئی سامان وغیرہ ہے۔''

حسب روایت ایک بڑی بڑی مونچھوں والے قلی نے اس سے بھی کہا۔

''ارے نہیں میاں...... میں تو بیمار کی تیمارداری پر آیا ہوں۔ پھیرے باز نہیں ہوں۔ کیا سمجھے۔''

اس کے کہنے کا انداز ایسا جارحانہ اور طنزیہ تھا کہ قلی نے اپنا منہ ہی دوسری طرف پھیر لیا۔

ڈبے کے دروازے سے باہر نکل رہا تھا جب اس کی نظر اقبال پر پڑی جو اس کی طرف آرہا تھا۔ اقبال نے اس سے بادل نخواستہ ہی معانقہ کیا تھا۔ اس کا کارنامہ جاننے کے بعد تو اس کا یہی جی چاہتا تھا کہ اپنے ہاتھوں اس موذی کا گلا گھونٹ کر اپنے ارمان ٹھنڈے کرلے۔ انور کے دھماکے سے مرنے والے بیگناہ مریضوں کی لاشیں اور زخمیوں کی تصاویر ابھی تک اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھی۔

لیکن......

میجر خان نے اسے نارمل رہنے کے لیے کہا تھا۔

''اپنا پاسپورٹ دینا۔''

اس نے انور کے منافقانہ خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد کہا اور انور نے جو پہلے ہی سے تیار تھا اس کی طرف پاسپورٹ بڑھا دیا۔

''ابھی آتا ہوں۔ اس پر مہریں لگوالیں۔''

یہ کہہ کر وہ امیگریشن کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا جہاں انسپکٹر ملک اس کا منتظر تھا۔ اس نے پاسپورٹ ملک کی طرف بڑھا دیا جس نے پاسپورٹ پر سٹیمپ لگوا کر اسے تھماتے ہوئے نارمل رہنے کی تلقین کی تھی۔

اب وہ ملک کے ساتھ انور کی طرف آرہا تھا۔

''یہ میرے دوست کے بھائی ہیں۔ یہاں کے انچارج ہیں۔''

اس نے ملک کا تعارف انور سے کرایا۔

انور نے بڑی مکاری سے مسکراتے ہوئے اس سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا تھا۔

آیئے چلیں۔

ملک نے دونوں کو اشارہ کیا۔

اقبال نے اس کا اٹیچی کیس ہدایت کے مطابق خود قابو کرلیا تھا اور اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس درمیان اس نے خود پر جبر کرتے ہوئے اس سے باتیں بھی کی تھیں۔

انور کی توقعات کے مطابق کسی نے ان کو نہیں روکا کیونکہ اقبال کے دوست کا بھائی ان کے ساتھ آرہا تھا۔

اب وہ اسٹیشن سے باہر آگئے تھے۔

''آپ ان کے ساتھ گھر جایئے میں اماں کو خبر کرآؤں۔''

اس نے باہر کھڑی ایک ٹیوٹا جیپ کے نزدیک رک کر کہا۔

انور یہی چاہتا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ اگر ممکن ہو تو میں بھی ہسپتال ہی چلتا ہوں۔''

انور نے بڑی منافقت کا مظاہر کیا۔

''نہیں آپ تھکے ہوں گے آرام کیجئے۔ میں شام میں آکر آپ کو لے جاؤں گا۔ گھر پر ماموں جان آپ کے منتظر ہوں گے۔''

اقبال نے کہا۔

''ٹھیک ہے......''

انور نے رضامندی ظاہر کی۔

''آیئے جناب۔''

ملک نے جو اس اثنا میں اس کا سامان پچھلے حصے میں رکھ چکا تھا اس سے کہا۔

''چلیئے۔''

انور نے قدم دروازے کی طرف بڑھایا۔

اچانک ہی ایک طرف سے ملک جیسے قد کاٹھ والے دو جوان آگئے۔ سب لوگ آپس میں گرم جوشی سے مصافحہ کررہے تھے۔

''آپ برا نہ منائیں۔ انہیں ہم راستے سے اتارتے جائیں گے۔ اپنے لوگ ہیں۔''

ملک نے انور سے کہا۔

''ارے نہیں جناب اس میں برا منانے والی کیا بات ہے۔''

انور نے انکساری سے کہا۔

وہ سمجھ گیا کہ یہ لوگ چھٹی کرکے جارہے ہوں گے۔ وہ تو دل ہی دل میں اس بات پر پھولے نہیں سما رہا تھا کہ جس انٹیلی جنس نے اسے گرفتار کرنا تھا وہ اس کی محافظ بنی ہوئی تھی۔

''واپسی پر جب ورما ملک اور شکلا صاحب کو بتاؤں گا تو کتنے خوش ہوں گے۔''

اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

اقبال اس سے مصافحہ کرکے جا چکا تھا۔

انہوں نے بڑی عزت سے اسے آگے بٹھالیا۔

ملک نے ڈرائیور کی سیٹ سنبھال لی۔

دونوں جوان پیچھے بیٹھ گئے۔

اور...... جیپ چل دی۔

انور کو کیا علم تھا کہ وہ کس طرف جا رہے ہیں۔ پندرہ بیس منٹ کے سفر کے دوران وہ آپس میں معمول کی گفتگو کر کے خوش گپیاں کرتے رہے۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا...... نہ ہی کسی نے اسے اس گفتگو میں شامل کیا۔

گاڑی اب شہری علاقے سے مضافاتی علاقے کی طرف بڑھ رہی تھی پھر اچانک ہی انور کی چھٹی حس نے اسے چوکنا کر دیا۔

"ہم کدھر جا رہے ہیں۔"

اس نے ملک سے پوچھا۔

"انور صاحب برا نہ منانا ان کی حاضری تھی۔ بس دس منٹ بعد میں آپ کو گھر پہنچا دوں گا۔ ادھر سے ایک شارٹ کٹ شہر کو جاتا ہے۔"

ملک نے کہا۔

انور چپکا ہو رہا۔

ایک ماڈرن علاقے کی کوٹھی کے سامنے وہ رک گئے۔ گھنٹی بجانے پر دروازہ کھلا اور ملک گاڑی تیزی سے اندر لے گیا۔

"آجاؤ......"

ملک نے اترتے ہوئے انور سے کہا۔

"یہاں......"

انور نے حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا اور با دل نخواستہ نیچے اتر آیا۔ اس کے ساتھ آنے والے دونوں جوان اس طرح اس کی پشت پر کھڑے تھے کہ انور کو اس کی موجودگی کا احساس ہی نہیں ہو سکا۔

"ہاں...... تمہارے ایک دوست سے تمہیں ملاتے ہیں۔"

ملک نے زہر خندہ مسکراہٹ سے کہا۔

"میرا دوست...... کون؟"

خوف اور گھبراہٹ کے ملے جلے تاثرات سے انور نے پوچھا۔

"تمہارا دوست چوہدری اختر جسے تم چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔"

جیسے ہی ملک کے منہ سے نکلی بات مکمل ہوئی انور کو اپنے سر پر آسمان گھومتا اور زمین پیروں تلے سرکتی محسوس ہوئی۔

"مم میں......"

ابھی اس کی بات نامکمل ہی تھی جب اس کی پشت پر کھڑے ایک جوان نے اس کا کالر پکڑا اور اپنی طرف جھٹکا دے کر اس کے منہ پر ایسا زوردار تھپڑ رسید کیا کہ اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

اس کے ساتھ ہی دوسرے نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور وہ اسے بچوں کی طرح ہاتھوں پر اٹھا کر سامنے والے برآمدے سے اندر لے آئے۔

یہاں سے سیڑھیاں نیچے تہہ خانے میں جا رہی تھیں۔

انہوں نے انور کو سیڑھیوں سے کسی گیند کی طرح نیچے پھینکا اور وہ لڑھکتا ہوا نیچے فرش پر جا گرا۔ نیچے ایک کوریڈور کے دونوں اطراف کمرے بنے ہوئے تھے۔ خوف کے مارے انور کے منہ سے ڈھنگ سے چیخ بھی نہیں نکل رہی تھی۔

انہوں نے نیچے پہنچتے ہی اس کی دھنائی شروع کر دی۔

پانچ منٹ تک وہ انور کو یوں مارتے رہے جیسے وہ انسان کے بجائے کسی تھیلے پر مکہ بازی اور لاتیں مارنے کی پریکٹس کر رہے ہوں۔

❁......❁......❁

انور کو سمجھ تو آ گئی تھی کہ وہ "ٹریپ" میں پھنس گیا ہے۔

لیکن......

یہ سب ہوا کیسے؟

اور...... کیا اقبال نے اسے پھنسانے میں پاکستان انٹیلی جنس کی مدد کی ہے؟

اس سوال کا جواب اس کے لئے بڑا اذیت ناک تھا۔ اس نے کبھی ایسی صورتحال کا تصور بھی نہیں کیا تھا جس سے وہ دوچار ہو چکا تھا۔

ادھ موئے انور کو وہ گھسیٹتے ہوئے اب ایک اور کمرے کی طرف لے جا رہے تھے جہاں ایک کرسی پر چوہدری اختر بیٹھا تھا اور دوسری پر میجر خان......!!

"ویل کم مسٹر انور۔"

میجر خان نے اس کی طرف دیکھ کر زہر خندہ مسکراہٹ اچھالی۔

ابھی اس کے منہ سے بمشکل یہ الفاظ ہی نکلے تھے جب چوہدری اختر بجلی کی سی پھرتی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے انور کو مارنا شروع کر دیا۔ اگر اس کے ساتھ آنے والے اختر کو قابو نہ کرتے تو شاید وہ انور کا گلا گھونٹ کر اسے جان ہی سے مار ڈالتا۔

خان کے اشارے پر اختر کو وہ لوگ دوسرے کمرے میں لے گئے۔

"تمہارے مالک کیا سمجھتے ہیں وہ بہت چالاک ہیں...... اور تم بے غیرت انسان۔ ایک مسلمان کے گھر جنم لے کر تم نے اپنے مسلمان بھائیوں ہی کو تباہ کرنا چاہا۔ لعنت ہے تم پر۔"

میجر خان نے نفرت سے کہا۔

انور پر ان باتوں کا کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اگر اس میں غیرت ایمانی ہوتی تو یہ کام ہی کیوں کرتا۔ وہ تو اس چکر میں تھا کہ جیسے بھی ممکن ہو یہاں سے اپنی جان چھڑا لے۔

لیکن......

اب وہ بری طرح شکنجے میں پھنس چکا تھا۔

اپنی دانست میں اس نے بڑی چالاکی دکھائی تھی اور آئیں بائیں شائیں کر کے ادھر ادھر الجھانا چاہا تھا۔

لیکن......

اس کے لئے ایسا کرنا ممکن نہیں تھا کیونکہ اس کی تفتیش کرنے والے اس کے کارناموں سے خاصی آگاہی رکھتے تھے۔ اس کے سامان سے تباہ کن ڈیٹونیٹر اور آر ڈی ایکس مواد ملا تھا۔ صرف دو گھنٹے کی تفتیش کے بعد اس نے اول سے آخر تک طوطے کی طرح ساری کہانی سنا دی اور اس "سورس" سے متعلق بھی بتا دیا جس کے ساتھ مل کر اس نے اس مرتبہ دھماکہ کرنا تھا...... اگلے دو گھنٹے میں "را" کے اس ایجنٹ کے گرد پاکستان انٹیلی جنس کا گھیرا تنگ ہو چکا تھا۔ انہوں نے اس ایجنٹ کو فی الوقت گرفتار نہیں کیا تھا۔ انہیں ابھی اس کے ذریعے آگے اس گینگ تک پہنچنا تھا۔

میجر خان نے اس دوران اس بات کی مکمل تسلی کر لی تھی کہ انور کے اس گھناؤنے روپ سے اقبال بالکل بے خبر تھا۔ اس نے یہ پہلے ہی جان لیا تھا کہ اقبال کا سارا خاندان اسلامی ذہن رکھتا ہے جس کا سب سے بڑا ثبوت انور کی بہن سلمیٰ تھی جس نے اس کے سامنے فون پر اپنے بھائی کے کالے کرتوت سے اقبال کو آگاہ کیا تھا۔

اور......

انور کی اصلیت کا علم ہونے پر ان کے کہے بغیر اقبال نے اس کی گرفتاری کے لئے ہر ممکن تعاون کیا تھا۔ اس نے اپنے تمام جذبات ایک طرف رکھ کر اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ وہ سلمیٰ سے محروم بھی ہو سکتا تھا۔ اپنے ملک کے لئے سب کچھ کر دکھایا تھا۔

اور......

اب سب سے بڑھ کر سلمیٰ جس کے کردار نے میجر خان کو بہت متاثر کیا تھا۔

انور کی گرفتاری کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس نے اس مرتبہ جس ایجنٹ تک پاکستان انٹیلی جنس کو پہنچا دیا تھا وہ ایک سرکاری ملازم تھا جس پر نگاہ رکھ کر وہ لوگ اس سے بعد والے سارے سلسلے کو سمجھ اور پکڑ سکتے تھے۔

میجر خان نے اقبال کے لئے ایجنسی سے انعام کی سفارش کی تھی اور اب اعلیٰ سطح پر اس کی منگیتر کو دشمن کے جبڑوں سے بحفاظت نکال کر یہاں پہنچانے کا منصوبہ بن چکا تھا۔

انور کی روانگی کے اگلے ہی روز سلمیٰ کے لئے اس کے ہمسائے میں اس کی سہیلی کا فون آیا جس نے اپنا نام صائمہ بتایا تھا۔

سلمیٰ اس نام پر چونکی اور قریباً بھاگتی ہوئی فون سننے چلی گئی تھی۔ صائمہ نے اسے فوراً مقررہ کردہ جگہ" پر پہنچنے کے لئے کہا تھا۔

یہ سب کچھ اس پلان کا حصہ تھا جس سے متعلق فون پر اقبال نے اطلاع دی تھی۔

اب اسے بہت سوچ سمجھ کر اور محتاط رہ کر اگلا قدم اٹھانا تھا۔

اپنا پاسپورٹ اس نے بڑی راز داری سے اگلے ہی روز اپنے پاس سنبھال لیا تھا اور آج بالکل اس وقت گھر سے نکلی تھی جب اس کا کالج جانے کا وقت ہو رہا تھا۔ اس کی روانگی معمول کے مطابق تھی۔ سلمیٰ شاید پہلے اس پر غور نہ کرتی لیکن اب چونکہ اسے ہدایت مل چکی تھی اس نے بطور خاص اس درمیانی عمر کے آدمی کو نوٹ کیا تھا جو اس کے گھر سے کالج تک بس میں سوار ہو کر اسے چھوڑنے آیا تھا......!!

کالج کے دروازے سے وہ معمول کے مطابق اندر داخل ہو گئی اور اس کے تعاقب پر مامور انسپکٹر شندے مطمئن ہو کر اپنے کسی کام سے چلا گیا۔ اسے کل شام ہی سے سلمیٰ کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کی ڈیوٹی دی گئی تھی۔

اب اسے چھٹی ہونے پر اسے کالج سے گھر تک پہنچانا تھا۔ انسپکٹر شندے مطمئن تھا

یوں بھی اسے کوئی غیر معمولی ہدایات نہیں ملی تھی کہ وہ زیادہ تردد کرتا۔

لیکن......

اسے اس بات کا احساس نہ ہوسکا کہ کالج کے گیٹ پر لگے لڑکیوں کے جمگھٹے میں موجود سلمٰی نے اسے ایک لمحے کے لئے بھی اپنی نظروں کے حصار سے نہیں نکلنے دیا تھا اور آخری لمحات پر جب اس نے دیکھا کہ انسپکٹر شندے دوسری طرف جارہا ہے تو وہ چپ چاپ کالج کے گیٹ سے باہر آگئی جہاں لڑکیوں کو چھوڑنے والی خالی آٹو رکشاؤں میں سے ایک آٹو رکشہ میں وہ اس طرح گھبرا کر بیٹھی تھی جیسے کوئی چیز گھر بھول آئی ہو۔

رکشہ کو اس نے یہاں سے تین کلومیٹر دور ایک آبادی کا نام بتایا تھا جہاں پہنچ کر وہ رکشہ سے اتر گئی اور یہاں سے ایک بس کے ذریعے کناٹ پیلس کی طرف جارہی تھی۔

اس نے اپنے پاس موجود کالج فائل سے چھٹکارا حاصل کرلیا تھا اور اب اس کے پاس ایک بڑے پرس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ پہلے سے ملنے والی ہدایات کے مطابق اس نے ساڑھی پہن رکھی تھی اور ماتھے پر ہندو عورتوں کی طرح تلک لگانے کے بعد اب وہ ہندو لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔

کناٹ پیلس پہنچنے کے بعد اس نے ایک مخصوص مارکیٹ کا چکر لگایا ابھی زیادہ دکانیں نہیں کھلی تھیں لیکن گاہکوں کا رش دیوالی کی آمد کی وجہ سے شروع ہوگیا تھا......!

کناٹ پیلس میں جیولری کی ایک مخصوص دکان تک پہنچنے سے پہلے اس نے گھڑی کی سوئیوں کا جائزہ لے کر یہ اطمینان حاصل کرلیا تھا کہ وہ طے شدہ وقت کے دوران ہی یہاں پہنچی ہے۔ اسے دو گھنٹے کا وقت دیا گیا تھا جس کے درمیان اس نے یہاں پہنچنا تھا۔

جیولری کی دکان کے ایک کونے پر موجود چاٹ مصالحے کے سٹال کا اس نے ہدایت کے مطابق چکر لگایا اور عین اس جگہ جا کر کھڑی ہوگئی جہاں ایک لوہے کا سٹینڈ رکھا ہوا تھا۔

اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا اور وہ گھر سے نکلنے سے اب تک قرآنی آیات کا مسلسل دل میں ورد کرتی ہوئی یہاں تک آئی تھی۔

اس نے ایک نوجوان کو اپنی طرف آتے دیکھا جس نے جدید وضع قطع کے کپڑے پہن رکھے تھے اور کسی کھاتے پیتے گھرانے کا دکھائی پڑتا تھا۔

سلمٰی نے اس کی طرف کنکھیوں سے دیکھا تھا۔

کناٹ پیلس وہ زندگی میں پہلی مرتبہ اکیلی آئی تھی۔ اس سے پہلے وہ یہاں یوں تو

متعدد مرتبہ آچکی تھی۔

لیکن......اکیلی نہیں!

اکثر اپنی کسی سہیلی یا پھر والدہ کے ساتھ ہی اس کا آنا یہاں ہوتا تھا۔ اسے علم تھا کہ کسی نوجوان لڑکی کا اس طرح اکیلے یہاں گھومنے کا کیا مطلب لیا جائے گا اور کتنے لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں۔ نوجوان اس کے نزدیک آکر رک گیا۔

”بہن جی آپ کے پاس گھڑی ہوگی؟......

جیسے ہی اس کے منہ سے

یہ الفاظ نکلے سلمٰی نے دل ہی دل میں شکر الحمدللہ کہا اور اس کی طرف دیکھے بغیر کہہ دیا۔

”میرے پاس گھڑی نہیں ہے۔“

”آپ کو تو سبز رنگ کی ساڑھی پسند تھی ناں“

دوسرا کوڈ دہرایا گیا۔

”جی لیکن نیلے رنگ کی بھی پسند ہے۔“

اس نے جواب میں اگلا کوڈ دہرایا۔

اب ان کے تعارف کا مرحلہ طے ہو چکا تھا۔

”بہن جی میرے ساتھ آیئے۔“

نوجوان نے بڑے مؤدب لہجے میں کہا۔ نجانے کون سی غیر مرئی قوت تھی جس نے اس نوجوان کے وہاں آتے ہی سلمٰی کو محفوظ ہوجانے کی خوشخبری سنا دی تھی۔

اور......

اب اس کے دل کی دھڑکن نارمل ہو چکی تھی۔

وہ خود کو محفوظ سمجھ کر اس کے ساتھ بڑے اعتماد سے قدم اٹھاتی ہوئی چل رہی تھی۔

دونوں کناٹ پیلس کے ٹیکسی سٹینڈ تک آئے۔ نوجوان نے اس کے لیے دروازہ کھولا اور اسے پچھلی سیٹ پر بٹھا کر خود اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

دو ٹیکسیاں بدلنے کے بعد دونوں دہلی کے انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر موجود تھے......!!

نوجوان نے اسے اوما دیوی کا نام دے دیا تھا اور اپنا نام ارون کمار بتایا تھا۔ اس کے پاس ایئر انڈیا کی ڈومیسٹک فلائٹ کے دو ٹکٹ موجود تھے۔ ہوائی اڈے کے لاکرز میں سے اس نے پہلے سے وہاں موجود عورتوں کا ایک ”وینٹی باکس“ اور ایک سفری بیگ نکال لیا۔

بیگ اس نے خود پکڑ لیا اور ''وینٹی باکس'' اسے تھما دیا۔

''بہن جی برا مت مانئے۔ اس میں کچھ زیورات ہیں۔ آپ وہ پہن کر اور گلے میں ''منگل سوتر'' (شادی شدہ عورتوں کی نشانی) ڈال کر باہر آجائیے۔''

نوجوان نے پہلی مرتبہ اس سے بات کی تھی۔

سلمٰی نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور وینٹی باکس سنبھالتی خواتین کے باتھ روم میں چلی گئی اس کا ہینڈ بیگ نوجوان نے خود تھام لیا تھا۔

چند منٹ بعد جب وہ باہر آئی تو مکمل نو بیاہتا دلہن دکھائی دے رہی تھی۔

''شکریہ۔''

نوجوان نے اس کو بیگ تھماتے ہوئے کہا۔

اور......

دونوں لاؤنج کی طرف چل دیئے۔

''بہن جی برا مت مانئے گا۔ ہمیں یہاں سے لکھنو جانا ہے اور ہم میاں بیوی کی حیثیت سے سفر کر رہے ہیں...... آپ مسز ارون کمار ہیں اور میں ایک سرکاری آفیسر ہوں......''

نوجوان نے کہا۔

ایک پھیکی سی مسکراہٹ سلمٰی کے ہونٹوں پر بس گئی۔

''ویل ڈن...... آپ کو اس طرح نارمل رہنا ہے۔ کوشش کیجئے کہ آپ اس ماحول کا حصہ دکھائی دیں۔'' نوجوان نے اگلی بات کی۔

اور...... سلمٰی بے ساختہ ہنس دی۔

اس کا بات کرنے کا انداز ہی ایسا تھا۔

لکھنو ہوائی اڈے ہی کے ایک پی سی او سے اس نے سلمٰی کو فون پر اقبال کے ساتھ بات کروائی جس نے سلمٰی کو اس نوجوان پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کرنے اور اس کی ہر ہدایت پر عمل کرنے کے لئے کہا اس نے سلمٰی کو بتایا کہ اگلے دو دنوں میں وہ انشاء اللہ پاکستان پہنچ جائے گی......

''امید ہے اب آپ بالکل مطمئن ہو گئی ہوں گی۔''

نوجوان نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔

''شکریہ بھیا...... اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا اجر ضرور دیں گے۔''

اس کے دل سے دعا نکلی تھی۔

دونوں اب ایک ہوٹل کا رخ کر رہے تھے جہاں انہوں نے کھانا کھایا۔ سلمٰی کا دل تو ایک لقمہ لینے کو نہیں چاہتا تھا۔

لیکن......

نوجوان کے بضد ہونے پر اس نے کچھ کھانا زہر مار کیا اور دونوں باہر آگئے۔

''ہمیں مسلسل سفر کرنا ہے جس کے لئے توانائی بحال رکھنا ضروری ہے۔''

اس نے باہر آکر کہا۔

لکھنو سے نیپال کی سرحد تک کا سفر انہوں نے مسلسل کیا تھا۔ کہیں پرائیویٹ کار سے اور کہیں بس سے۔ سلمٰی اس دوران خود کو حوالہ تقدیر کئے خاموش بیٹھی باہر کے نظاروں میں کھوئی رہی۔ نوجوان نے باقی سارا سفر اس کے ساتھ بیٹھ کر کیا تھا لیکن کیا مجال جو ایک لمحے کے لئے بھی وہ اس کے جسم سے ٹکرایا ہو۔

سلمٰی نے ایسے نوجوان سے متعلق اپنے بزرگوں سے تو سنا تھا لیکن بھارتی معاشرے میں ان کی موجودگی کا کبھی تصور نہیں کیا تھا۔

نیپال کے اس سرحدی گاؤں میں جب دونوں پہنچے تو یہاں پہلے ہی سے ایک ڈھلتی عمر کا نیپالی گورکھا ان کا منتظر تھا۔ اس نے دونوں کو سرحد اس طرح عبور کروائی تھی جیسے وہ دہلی ہی میں کہیں گھوم پھر رہے ہوں۔

ایک مخصوص مقام پر پہنچنے کے بعد جہاں ایک پرائیویٹ کار ان کے لئے پہلے سے تیار کھڑی تھی سلمٰی نے دیکھا نوجوان نے اپنے بٹوے سے کچھ نوٹ نکال کر گورکھے کے ہاتھ پر رکھے جس نے اسے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر سلام کیا اور واپس چلا گیا۔

اس کار کے ذریعے وہ کھٹمنڈو تک پہنچے تھے...... جہاں ایک ہوٹل میں دونوں کے لئے کمرہ پہلے سے ریزرو تھا۔ کار والے نے انہیں یہاں اتار دیا اور وہ سلمٰی کا پاسپورٹ لے کر چلا گیا جبکہ وہ نوجوان اس کے ساتھ ہی ہوٹل کے کمرے تک آیا۔

''اگر آپ برا نہ مانیں تو کچھ دیر آرام کر لیا جائے۔''

نوجوان نے کہا۔

سلمٰی خاموش رہی۔

نوجوان نے اس خاموشی کو اس کی رضا مندی جان کر پلنگ پر رکھا ایک تکیہ اٹھایا اور کمرے کے کونے میں قالین پر پھینک کر لیٹ گیا۔

سلمٰی کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ گہری نیند سو گیا۔

سلمٰی بستر پر تو لیٹ گئی۔

لیکن......

کیا مجال جو ایک لمحے کے لئے بھی اس کی آنکھ لگی ہو۔ اسے رہ رہ کر اپنے والدین کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ بار بار اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔

وہ پیا ملن کو جا رہی تھی......لیکن، اس نے زندگی میں کبھی اپنے بابل کے گھر سے اس طرح کی رخصتی کا تصور نہیں کیا تھا۔

بہرحال اسے ایک اطمینان ضرور تھا کہ اس کی عزت محفوظ رہی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہی تھا کہ وہ بھارتی انٹیلی جنس والوں کو چکمہ دے کر یہاں تک پہنچ گئی تھی...... اس نے سب سے پہلے وضو کرنے کے بعد سجدہ شکر گزارا پھر نماز پڑھنے لگی۔

نماز سے فراغت پر اس نے دیکھا نوجوان اٹھ بیٹھا تھا اور اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جب وہ نماز پڑھ چکی تو نوجوان نے اپنے بیگ سے شلوار قمیص پر مشتمل دو سوٹ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیئے۔

"اب آپ سلمٰی ہیں اور اللہ کے فضل سے محفوظ ہاتھوں میں ہیں۔ ہم بھارت سے نکل آئے ہیں آپ آج رات کی فلائٹ سے پاکستان جا رہی ہیں۔"

یہ الفاظ کیا تھے......جیسے حیات نو کی نوید تھی۔

سلمٰی نے آنکھوں میں آنسو لئے اس کی طرف دیکھا اور کپڑے اٹھا کر پلنگ کر رکھ دیئے۔

"تم جو کوئی بھی ہو...... مجھے علم نہیں۔ لیکن میرا دل کہتا ہے کہ پاکستانی اور مسلمان ہو۔ کاش زندگی میں کبھی مجھے تمہاری اصلیت کا علم ہو پاتا۔ میں ایک کمزور اور بے بس لڑکی ضرور ہوں لیکن آج تک اللہ تعالیٰ نے میری کوئی دعا خالی واپس نہیں لوٹائی...... یقین رکھنا پیارے بھائی کہ میں مرتے دم تک تمہاری سلامتی کی دعائیں مانگا کروں گی۔ اگر زندگی میں کبھی اپنی اس بہن کی ضرورت محسوس ہو تو میرے پاس ضرور آنا......ضرور آنا......"

یہ کہہ کر وہ سسکیاں لینے لگی۔

نوجوان کے لئے اسے چپ کرانا مسئلہ بن رہا تھا۔ اس نے پہلی مرتبہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر سلمٰی کو تسلی دی اور اس کے نارمل ہونے پر اپنے بیگ سے چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

"آپ اپنے والدین کو جو بھی کہنا چاہیں۔ اس میں ریکارڈ کر دیجئے انشاء اللہ کل شام تک یہ پیغام ان تک پہنچ جائے گا۔ صرف ایک درخواست ہے کہ اس میں اپنے دہلی سے یہاں تک کے سفر کا تذکرہ نہ کیجئے انہیں بس کہئے کہ آپ پاکستان پہنچ گئی ہیں۔"

سلمٰی نے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اس کا شکریہ ادا کیا...... وہ بھی یہی چاہتی تھی کہ جلد از جلد اپنے والدین تک تمام حالات کی خبر پہنچا دے۔

"ہمارے پاس اب صرف ایک گھنٹہ ہے۔ آپ کے لئے میں نے کھانا اور چائے منگوائی ہے۔ اپنا پیغام مکمل کر لیجئے۔ میں پون گھنٹہ بعد انشاء اللہ یہاں موجود ہوں گا...... اچھا خدا حافظ۔"

یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

✿......✿......✿

آدھے گھنٹے میں وہ تمام کاموں سے فارغ ہو گئی تھی۔

اس نے آج پیٹ بھر کے کھانا کھایا تھا اور بڑے اطمینان سے ٹیپ کے ذریعے اپنے والدین کو شروع سے آخر تک کی ساری کہانی ریکارڈ کروا کر اسے سن کر تسلی کر لی تھی کہ واقعی ریکارڈنگ ہو گئی ہے۔ آخر میں اس نے اپنے والدین سے معافی مانگنے کے بعد کہا تھا کہ اس کے سوا اس کے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا اور یہ کہ اگر انہیں حالات کا علم ہو جاتا وہ بھی یہی کچھ کرتے لیکن شاید کر نہ پاتے۔

مقررہ وقت پر نوجوان وہاں پہنچ گیا تھا۔

اس کے ایک ہاتھ میں سلمٰی کا پاسپورٹ اور دوسرے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا۔ جو اس نے سلمٰی کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

"اپنے بھائی کی طرف سے یہ حقیر سا تحفہ قبول کر لینا۔ اگر کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دینا۔ زندگی نے وفا کی تو انشاء اللہ تمہیں نئی زندگی کی مبارکباد دینے کبھی نہ کبھی تمہارے گھر ضرور آؤں گا۔"

نوجوان نے بڑے سپاٹ لہجے میں کہا۔

لیکن......نجانے کیوں سلمٰی کا دل بھر آیا۔

وہ بے اختیار ''بھیا'' کہہ کر اس سے لپٹ گئی اور آنسو بہانے لگی۔

نوجوان شاید ذہنی طور پر اس صورتحال کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا۔ اس نے سلمٰی کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے آہستگی سے الگ کیا۔

''ارے اب کیا اپنے بھائی کو اداس کرو گی......بھئی مجھے ابھی واپس بھی جانا ہے۔ اچھا اب مسکرا کر مجھے رخصت کرنا اور میرے لئے دعا بھی کرنا...... میں یہاں سے الگ ہو جاؤں گا۔ اب تم ایئر پورٹ جا رہی ہو...... یہاں سے پاکستان تک کا سفر تمہیں اکیلے کرنا ہے لیکن اطمینان رکھنا ایک لمحے کے لئے بھی تم اکیلی نہیں ہوگی تم اپنے پاکستانی بھائیوں کی پناہ میں ہو اور وہ جانتے ہیں کہ اپنی بہن کی حفاظت کیسے کرنی ہے......چلو اب چلیں۔''

یہ کہہ کر اس نے سلمٰی والا بیگ اٹھا لیا۔ اس نے کپڑے وغیرہ اس میں رکھ لئے تھے۔ سلمٰی نے اس کی ہدایت پر وینٹی باکس اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

دونوں ہوٹل کے استقبالیہ تک آئے جہاں اس نوجوان نے شاید بل پہلے ہی سے ادا کر دیا تھا۔

ہوٹل کی پارکنگ ایریا میں وہی کار اور ڈرائیور موجود تھا۔

''عابد تمہیں لاؤنج تک چھوڑنے جائے گا......اچھا خدا حافظ۔''

نوجوان نے ڈرائیور کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''خدا حافظ میرے بھائی۔ اللہ تجھے ہر آفت اور بلا سے محفوظ رکھے۔''

اس نے بھیگی آنکھوں سے مسکراتے ہوئے نوجوان کی طرف دیکھا جو لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوٹل کی طرف واپس جا رہا تھا۔

ائیر پورٹ سے پاکستان میں جہاز لینڈ کرنے تک وہ ہر سانس کے ساتھ اس کے لئے دعائیں کرتی آئی تھی۔ رات ڈھل چکی تھی جب جہاز کے پہیوں نے رن وے کو چھوا۔

یہ اس کی زندگی کا دوسرا ہوائی سفر تھا۔ پہلا سفر اس نے اب سے ایک روز پہلے ایئر انڈیا کی ایک فلائٹ سے دہلی سے لکھنؤ تک کیا تھا اور دوسرا کھٹمنڈو سے یہاں تک......!

رن وے سے لاؤنج تک وہ ایک بس کے ذریعے پہنچی تھی۔ بس سے باہر نکلتے ہوئے اسے اپنی پشت سے آواز سنائی دی۔

''سلمٰی بہن۔''

اس نے مڑ کر دیکھا ایک مضبوط قد کاٹھ کا نوجوان اسے مخاطب کر رہا تھا۔

یہ میجر خان تھا......شاید اس نے سلمٰی کی تصویر کی مدد سے اس کی شناخت کی تھی۔

''جی......''

بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''ادھر آ جائیں میرے ساتھ۔''

اور...... وہ سلمٰی کو ساتھ لئے وی آئی پی لاؤنج میں آ گیا جہاں اقبال اور خالہ جنت اس کے منتظر تھے۔ سلمٰی بے اختیار خالہ جنت سے لپٹی اور رونے لگی۔

میجر خان اپنی گاڑی میں انہیں گھر تک چھوڑنے آیا تھا۔

شہادت

ورما ملک اور شکلا اکٹھے شراب نوشی کر رہے تھے۔ انہیں آج صبح ہی انور کی طرف سے ''مال'' بحفاظت پہنچنے کا فون موصول ہوا تھا اور اب اس نے دو روز بعد مقامی ایجنٹ سے رابطہ کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔

اس مرتبہ جو تباہ کن مواد اور متعلقہ سامان انہوں نے پاکستان پہنچایا تھا عام حالات میں شاید وہ لاکھوں روپے ضائع کرنے کے بعد بھی اسے سمگل کر کے نہ پہنچا سکتے...... دونوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ ہیڈ چیف نے اس اطلاع پر دونوں کو شاباش دی تھی اور فوری طور پر دونوں کو اگلے گریڈ میں پہنچنے کی سفارش کا وعدہ بھی ہوا تھا۔

دونوں ''را'' کے ایک سیف ہاؤس میں شراب نوشی کے بعد اب کھانے پر ٹوٹے ہوئے تھے جب انسپکٹر شندے کی طرف سے فون کی اطلاع ملی۔

''ارے یار دیکھ نہیں رہے کھانا کھا رہے ہیں۔ اسے کہو تھوڑی دیر بعد رنگ کرے۔''

شکلا نے پیغام لانے والے کو جھاڑ پلا دی۔

اور...... وہ بے چارہ الٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔

لیکن......

تھوڑی دیر بعد پھر وہ سر پر کھڑا تھا۔

''سر! کوئی ضروری میسج ہے۔ چھندے بات کرنے پر بضد ہے۔''

اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''چلو یار دیکھ لو۔''

ورما ملک نے شندے کو دل ہی دل میں موٹی سی گالی دے کر کہا۔

چھندے اپنے موبائل سے فون پر بات کر رہا تھا۔

''سر! لونڈیا غائب ہے۔''

اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

''تیرا دماغ تو ٹھیک ہے ناں...... سالے کہیں زیادہ تو نہیں چڑھا لی۔''

شراب کے نشے میں دھت ورما ملک نے کہا۔

''نو سر...... میں سیریس ہوں۔ صبح میں نے اسے کالج چھوڑا تھا۔ چھٹی کے بعد کالج خالی ہو چکا ہے لیکن وہ باہر نہیں نکلی۔ میں نے اس کے گھر میں چیک کر لیا ہے وہ گھر پر بھی نہیں ملی۔''

انسپکٹر چھندے نے بڑی گھبراہٹ سے کہا۔

''چھندے پاگل مت بنو...... وہ کہاں جائے گی اپنی کسی سہیلی کے ساتھ چلی گئی ہو گی۔ شام تک آ جائے گی ایسی بات ہوتی تو اس کے گھر والے پریشان ہوتے۔''

نجانے کیوں ورما ملک کا دل اس خبر پر یقین کرنے کو نہیں چاہتا تھا۔

''ٹھیک ہے سر! میں چیک کرتا ہوں۔''

انسپکٹر چھندے نے ہتھیار ڈال دیئے۔

اور......

ورما ملک نے فون رکھ دیا۔

اسے چھندے کی اس مداخلت پر بہت غصہ آیا تھا اور وہ اسے گالیاں بکتا ہی شکلا تک پہنچا تھا جو گائیتری سے معانقہ کر رہا تھا

گائتری ابھی یہاں پہنچی تھی۔

''خیریت''

اس نے گائتری سے لپٹے لپٹے ورما ملک کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''کچھ نہیں سالے کا دماغ خراب ہو گیا ہے سلمٰی کے غائب ہونے کی خبر دے رہا ہے۔''

جوں ہی یہ فقرہ اس کے منہ سے نکلا شکلا کو یوں لگا جیسے اچانک کسی نے برقی کوڑا اس کی کمر پر رسید کر دیا ہو۔

وہ جس طرح گائیتری کی شکل دیکھتے ہی اس سے بغل گیر ہونے کے لئے اس کی طرف لپکا تھا اس سے زیادہ تیزی اور جھٹکے سے اس سے الگ ہو گیا۔

تمہارے پاس اس کا نمبر تو ہے ناں......''

شکلا اب ورما ملک سے مخاطب تھا۔

"ہے جناب۔"

ورما ملک نے کہا۔

"ہوں ں ں......"

شکلا کچھ سوچنے لگا پھر اس نے ورما ملک سے وہ نمبر لے کر فون پر ملایا اور کچھ سمجھا کر گائیتری کو تھما دیا۔

تھوڑی دیر بعد خالہ ثریا لائن پر موجود تھی۔ اس نے خالہ ثریا سے اپنا تعارف سلمٰی کی ایک سہیلی نیلم کے نام کروایا اور اس سے ضروری بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

"لیکن وہ تو ابھی گھر ہی نہیں پہنچی ہم لوگ خود پریشان ہیں۔"

دوسری طرف سے خالہ ثریا نے کہا۔

"اوہو...... کسی رشتہ دار کی طرف نہ گئی ہو آنٹی آخر اس بے چاری نے کہاں جانا ہے۔"

اس نے خالہ ثریا کو مزید کریدا۔

"بیٹا ہمارے ایک دو عزیز ہی یہاں رہتے ہیں ان سے تو پوچھ چکے ہیں۔ اب تو شام ہونے کو آ رہی ہے اس کے ابا بہت پریشان ہیں اور انور ہے نہیں۔"

خالہ ثریا نے بھولپن سے کہا۔

"آپ بے فکر رہئے آنٹی...... میں دیکھتی ہوں پھر آپ کو بھی بتا دوں گی۔ کہاں جانا ہے اس نے۔"

گائیتری نے خالہ ثریا کو مطمئن کر کے فون بند کر دیا۔

"دال میں کچھ کالا ہے۔"

اس نے فون رکھتے ہوئے شکلا سے کہا۔

ورما ملک کو اپنا نشہ ہرن ہوتا دکھائی دیا۔

شکلا کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ اس اچانک آپڑنے والی بپتا نے اسے گڑبڑا کر رکھ دیا تھا۔

"جتنی جلدی ممکن ہو اس کے کالج سے چیک کرو وہ آج کالج آئی بھی تھی یا نہیں۔"

شکلا کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔

"لیکن کالج تو اسے چھندے نے خود چھوڑا ہے سر۔"

ورما ملک نے کہا۔

"ڈیم اٹ...... اور چھندے نے ہی اس کے غائب ہونے کی خبر دی ہے...... نان سنس۔"

شکلا کا پارہ اچانک چڑھ گیا تھا۔

ورما ملک بھی سہم گیا۔

"کم آن گائیتری۔"

اس نے گائیتری کو اشارہ کیا۔

اور......

دونوں باہر نکل آئے۔

۞......۞......۞

ورما ملک کی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے گائیتری نے تین چار گالیاں پہلے شکلا کو دیں جس کے بعد سلمٰی سے متعلق غلیظ زبان استعمال کی اور پھر سگریٹ سلگا کر نارمل ہونے کی کوشش کرنے لگی۔

"ڈونٹ بی سلی ڈارلنگ...... وہ بڈھا تو سالا سٹھیا گیا ہے۔ تمہیں کیا ہوا۔ دیکھتے ہیں کہاں جائے گی وہ۔"

گائیتری کا موڈ بری طرح آف تھا۔

وہ اپنی مرضی کی مالک تھی۔ "را" سے تعلق قائم کئے اسے تین سال ہونے کو آئے تھے اور ان تین سالوں میں اس نے بھارت کے پڑوسی ممالک کے درجنوں نوجوانوں کو بدکاری کی راہ پر لگا کر "را" کے لیے بطور چارہ پیش کیا تھا۔ وہ بڑے بڑے افسران کی داشتہ تھی۔

لیکن......

یہ شکلا کچھ زیادہ ہی منہ چڑھا لگتا تھا۔

اس کا رویہ دوسرے افسروں کے برعکس گائیتری سے اکثر حاکمانہ قسم کا ہوتا تھا جو گائتری کے لئے ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔

کالج پہنچنے تک اس نے گائتری کو نارمل کیا۔

کالج کا سارا اسٹاف گھر جا چکا تھا کیونکہ اب شام کے سائے لمبے ہونے لگے تھے اور کسی سٹاف ممبر کا دماغ تو خراب ہوا نہیں تھا کہ یہاں ان کے لئے موجود رہتا۔

کالج کا چوکیدار گورکھا تھا جسے کسی کالج ملازم کے گھر کا علم نہیں تھا اسے تو پرنسپل کے گھر کا بھی علم نہیں تھا۔

بڑی مشکل آن پڑی تھی۔

لیکن......

انہیں بہرحال کچھ نہ کچھ کر کے صورتحال شکلا پر واضح کرنا تھا۔

رات ایک پہر ڈھل چکی تھی جب وہ پرنسپل سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہو ہوئے کیونکہ پرنسپل بھی ایک شادی کی تقریب سے ابھی واپس لوٹی تھی جبکہ ورما ملک وہاں دو گھنٹے سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

گائیتری اپنے فلیٹ پر واپس جا چکی تھی یوں بھی کیونکہ اس کا تعلق شو بز سے تھا۔ اس لئے اسے ”را“ کے حوالے سے پبلک میں نہیں لایا جا سکتا تھا صرف خاص مقاصد کے لئے ہی استعمال کیا جاتا تھا۔

پرنسپل ضرورت سے زیادہ بد دماغ تھی۔ پہلے تو اسے اس پر ہی غصہ آ گیا کہ انٹیلی جنس کا آفیسر اتنی رات گئے اس سے ملنے کیوں آیا ہے اور اس نے بغیر وقت کے ملاقات کرنے سے انکار ہی کر دیا۔

بڑی مشکل سے اس کے سیکرٹری کو ڈرانے دھمکانے کے بعد ورما ملک نے ملنے پر راضی کیا اور بتایا کہ ایک انتہائی اہم معاملے کی وجہ سے انہیں اس وقت کالج کے حاضری رجسٹر چیک کرنے ہیں۔

”آپ کا دماغ ٹھیک ہے کیا۔“

ساؤتھ انڈیا کی ڈھلتی عمر کی پرنسپل نے غصہ سے پھنکارتے ہوئے اسے قریباً ڈانٹ پلا دی۔

وہ بھی محکمہ تعلیم کے گنے چنے افسروں میں شمار ہوتی تھی۔

”دیکھئے میڈیم For God Sake یہ نیشنل سکیورٹی کا معاملہ ہے۔“

ورما ملک منت سماجت پر اتر آیا تھا۔

”Look Mr. (دیکھو مسٹر) یہ کسی بھی سکیورٹی کا معاملہ ہو لیکن تمہیں اس بات کا علم ہونا چاہئے کہ میں حاضری رجسٹر رکھنے والی کلرک نہیں کالج پرنسپل ہوں اور کسی کلرک سے رابطہ کرنا اس وقت نہ میرا مسئلہ ہے نہ میرے لئے ممکن ہے۔ یہ میرے بیڈ روم میں جانے کا

ٹائم ہے۔ تمہیں جو بھی بات کرنی ہے صبح آفس میں کرنا "Now......you can go"

اس نے ورما ملک کو دھتکار دیا۔

ورما ملک کا خون کھول اٹھا۔

لیکن......

جسٹس چٹو پادھیائے کی بیوی پرنسپل نرملا چٹو پادھیائے کا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

وہ بے چارہ تو اسے دھمکی بھی نہیں دے سکتا تھا۔

اس درمیان موبائل پر اس کا رابطہ شکلا سے مسلسل رہا تھا اور جب شکلا کو یہ خبر ملی کہ پرنسپل نے صبح تک اس مسئلے پر کوئی بھی بات کرنے سے انکار کر دیا ہے تو اس پر جیسے گالیوں کا دورہ پڑ گیا۔

صبح کالج کھلنے تک کا وقت دونوں نے جاگ کر اور مسلسل شراب نوشی کر کے گزارا تھا۔ کالج کھلنے پر وہ لیڈی پولیس کی دو آفیسرز کے ساتھ کالج گئے تھے اور حاضری رجسٹر طلب کر کے ان کا معائنہ کر رہے تھے۔

ان کے لئے حیرت کی بات تھی کہ سلمیٰ کی کسی پیریڈ میں حاضری ہی نہیں لگی تھی......!!

”اوہ مائی گاڈ۔“

شکلا کے منہ سے نکلا۔

”تم تو کہتے ہو اسے خود یہاں پہنچا کر گئے تھے۔“

اس نے باہر نکلتے ہی انسپکٹر چھندے کو پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

”سر! دیوی ماں کی قسم میں سچ کہہ رہا ہوں۔“

انسپکٹر چھندے نے بے بسی سے کہا۔

جواب میں شکلا نے اسے اور اس کی دیوی ماں کو صلواتیں سنانا شروع کر دیں۔ اگلے پندرہ بیس منٹ میں انہوں نے سلمیٰ کی دہلی میں موجودگی کے لئے ہر ممکن ثبوت تلاش کرنا چاہا۔

لیکن......

وہ یہاں تھی ہی کب؟

جب تک وہ کسی نتیجے پر پہنچتے سلمیٰ محفوظ ہاتھوں تک پہنچ گئی تھی۔

تیسرے روز بعد از خرابی بسیار شکلا کو اپنے نیپال کے ایجنٹ کی طرف سے مقامی

ائیر لائن کے پسنجرز کی جولسٹ ملی ان میں گزشتہ رات کی فلائٹ میں جانے والی ایک مسافر کا نام سلمٰی خانم تھا جس نے بھارتی پاسپورٹ پر سفر کیا تھا اور اس کے پاسپورٹ کا نمبر وہی تھا جو سلمٰی کے پاسپورٹ کا تھا۔

”سمارٹ۔ ویری سمارٹ“

بے اختیار اپنے دشمنوں کے لئے شکلا کے منہ سے نکلا۔

ورما ملک کا منہ لٹک گیا تھا۔

اس کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی تھی۔

دونوں کو اچھی طرح سمجھ آ گئی کہ سارا چکر پاکستان انٹیلی جنس نے انور کو پھنسانے کے لئے چلایا گیا تھا اور اب وہ کمال ہوشیاری سے سلمٰی کو بھی نکال کر لے گئے تھے۔ جس سے ایک بات تو صاف ظاہر تھی کہ سلمٰی ان کے ساتھ شامل تھی۔

”اس کے باپ کو......“

ورما ملک نے کچھ کہنا چاہا۔

”تو......“

شکلا نے اسے قریباً ڈانٹتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

”پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ دونوں ابھی تک اس ساری گیم سے بے خبر ہیں۔ اگر وہ اس میں شامل ہوتے تو وہ بھی اس وقت وہیں ہوتے جہاں سلمٰی اور انور پہنچ چکے ہیں۔ ان پر نظر رکھو۔ خبردار اگر کسی نے ان سے براہ راست رابطہ کیا تو...... میں ایجنسی کو اور زیادہ رسوا نہیں کروانا چاہتا۔“

شکلا نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

ورما ملک جانتا تھا۔ یوں بھی اب انہیں ہمیشہ کے لئے اس فیملی سے کٹ جانا تھا کیونکہ کسی ایجنٹ کی گرفتاری کی صورت میں اس کے گھر والوں سے رابطہ کبھی ان کا اصول نہیں رہا تھا وہ اس بات کے قائل تھے ”جو پھنس گیا وہ مر گیا“ اور کسی مر جانے والے سے کیسا رشتہ؟

اس بات کا انہوں نے مکمل اہتمام رکھا تھا کہ انور کے والدین کو بھی اس کی اصلی نوکری کا علم نہ ہو پائے۔

اس میں بہر حال وہ کامیاب بھی تھے۔

”Leave It دفع کرواسے اور دوسرے لڑکے پر کام شروع کرو۔“

شکلا نے آخری حکم دیا۔

انور کی گرفتاری کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

وہ جانتے تھے کہ دوسری طرف موجود ان کے دوست اس سے دہلی کے ہر اس سیف ہاؤس کا پتہ لگا لیں گے جہاں وہ جاتا رہا ہے۔ اس لئے انہوں نے انور کو بھی دوسرے ایجنٹوں کی طرف سے ایک ہی سیف ہاؤس Safe House تک محدود رکھا تھا اور اب وہ اس سیف ہاؤس Safe House کو ختم کرنے جا رہے تھے۔

✿ ✿ ✿

جس روز چوہدری اختر کو میجر خان نے بتایا کہ ہائی کمان نے اس کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی درخواست قبول کر لی ہے وہ فوراً سجدہ شکر بجا لایا۔

زندگی میں شاید پہلی مرتبہ اس نے آنسو بہاتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ شکر گزارا تھا جس نے اسے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کا موقعہ فراہم کیا تھا۔

پندرہ روز تک وہ ایک پلاسٹک سرجن کے زیر نگرانی رہا۔ اس دوران بڑی باریک بینی سے متعلقہ لوگ اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتے رہے اور ان سب کی حتمی رائے یہی تھی کہ اس کا کایا پلٹ ہو چکی ہے۔

اپنی گرفتاری کے قریباً دو ماہ بعد ایک روز بالآخر وہ بھارت کی سرحد عبور کر رہا تھا۔

ایک مختلف نام کے ساتھ۔

ایک الگ شناخت کے ساتھ۔

ایک نئے عزم کے ساتھ۔

اور...... سب سے بڑھ کر یہ کہ قدرت کی طرف سے عطا کردہ اس سہولت سے فائدہ اٹھا کر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کا اپنے آپ سے وعدہ کرتے ہوئے۔

اس کے لئے یہ پہلا سفر نہیں تھا۔

یہ راستے اس کے لئے اجنبی نہیں تھے۔

درجنوں مرتبہ وہ یہاں سے گزرا تھا۔

لیکن......

تب اور اب میں فرق تھا۔

تب اس کی حیثیت ایک غدار وطن کی تھی اور آج وہ ایک فخر کے ساتھ اپنے مشن پر گامزن تھا۔

✿ ✿ ✿

اختر چوہدری کی روانگی کے بیس روز بعد ایک دن جب معمول کی ''ڈاک'' ہیڈ کوارٹر میں موصول ہوئی تو اس میں ایک فائل اختر سے متعلق بھی تھی۔ مقامی ایجنٹ نے رپورٹ دی تھی کہ اختر نے دہلی کے ایک فیشن ایبل علاقے میں گائیتری نام کی ٹی وی سٹار اور ماڈل کو قتل کر دیا اور موقعہ سے فرار ہو گیا۔ جس کے بعد اس نے شکار پور کے نزدیک تخریب کاری مرکز کے باہر اس راستے پر ڈائنا مائیٹ لگایا جہاں سے تربیت حاصل کر کے جانے والے غیر ملکی ایجنٹوں کی ایک گاڑی گزر رہی تھی اس کے بچھائے ڈائنا مائٹ کے پھٹنے سے گاڑی میں سوار تین پاکستانی اور ایک بنگلہ دیشی ایجنٹ اپنے انسٹریکٹر سمیت مارے گئے۔

لیکن......

دھماکے کے فوراً بعد اس علاقے میں پہلی فسٹ کمانڈو بٹالین کے جوانوں نے سارے علاقوں کو گھیرے میں لے لیا اور شکار پور سے قریباً دو کلو میٹر کے فاصلے پر گزرنے والی ریلوے لائن کے نزدیک اختر کو گھیرے میں لے کر ہینڈز اپ کا حکم دیا۔

اختر نے ان کا حکم نہیں مانا۔

وہ اپنے پاس موجود دو دستی بموں اور ایک ریوالور کے ساتھ ان کے مقابلے پر ڈٹ گیا۔

کمانڈوز کو شاید سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ اسے زندہ گرفتار کیا جائے۔

لیکن......

اختر دشمن کی اس چال کو سمجھ گیا۔

اس کا اسلحہ ختم ہونے پر جب کمانڈوز اس کے گرد گھیرا تنگ کر کے اختر تک پہنچے تو وہ مر چکا تھا۔

اختر چوہدری نے اپنے ریوالور میں موجود آخری گولی اپنی کنپٹی پر فائر کر لی تھی کیونکہ وہ دشمن کی چال کو سمجھ چکا تھا۔

اور......

شاید وہ اب زندہ گرفتاری نہیں دینا چاہتا تھا۔

''انا اللہ وانا الیہ راجعون۔''

رپورٹ کے خاتمے پر میجر خان نے کہا اور اس کے ہاتھ دعا کے لئے بلند ہو گئے۔

✡......✡......✡